"ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہ نامہ

سب رس

اقبال نمبر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

زیر ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

بہ اہتمام
خواجہ حمید الدین شاہد

مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

قیمت ۱۴/

تحفۂ لاجواب

یہہ تحفہ ہے لاجواب از بس لے لو
مرغوبِ دلِ ہر کس و ناکس لے لو
سب کا لینا تو امرِ ناممکن ہے
سب میں بہتر ہے یہ کہ "سب رس" لے لو

امجد

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "یہ ادارۂ ادبیات اُردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ ہے جس میں اردو زبان اور ادب کے شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابلِ اشاعت متصور نہیں ہوں گے۔

(۳) اُردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اُردو تصنیف و تالیف کا ذوقِ صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اُردو میں منتقل کر کے اُردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحات اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہئے

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ دو حریا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

	سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
حیدرآباد کے لئے۔	چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے
حیدرآباد سے باہر۔	چار روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

محرم نمبر ۱۲/ اقبال نمبر عہ/
(اخراجات ٹپہ ذمۂ خریدار)

نرخنامہ اجرت اشتہارات

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۵۰ روپے	۳۰ روپے	۱۵ روپے	۶ روپے
آدھا صفحہ	۳۰ ″	۱۵ ″	۱۰ ″	۴ ″
چوتھائی صفحہ	۱۵ ″	۱۰ ″	۴ ″	۲ ″

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY.
Acc. No.......
16498
LAHORE.

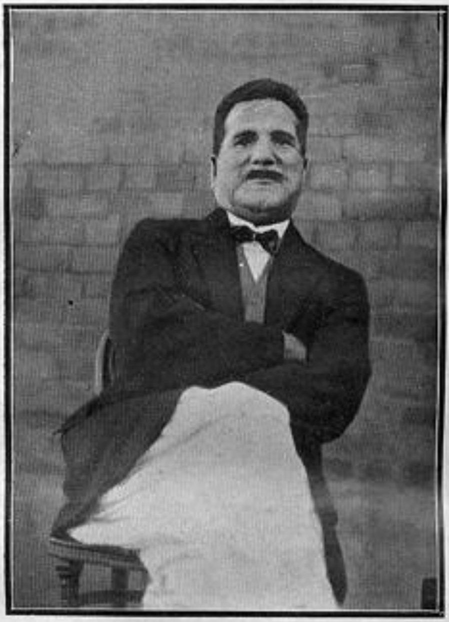

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

جن کی خدمات علمی و شعری کا اعتراف، ہندوستان کے مختلف مقامات میں عظیم الشان جلسوں کے ذریعہ کیا جارہا ہے اور جن کے متعلق آئندہ شمارہ میں ایک دلچسپ مضمون شایع ہوگا۔

جلد (۱) شمارہ (۶) | سب رس | جون سنہ ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

۱۔ اقبال ایک بابی۔ سہ رنگی تصویر از خان بہادر عبدالرحمٰن خان چغتائی مقابل صفحہ ۲
۲۔ پیام صبح (نظم اقبال)، تصویر از سید افضل حسین حسینی - - ۵۲
۳۔ علامہ اقبال کی دو نادر تصویریں مقابل صفحہ ۶۸
۴۔ ہندوستاں ہمارا تصویر از سید افضل حسین حسینی " " ۱۱۲
۵۔ گروپ تصاویر سر اقبال و سر راس مسعود وغیرہ مقابل صفحہ ۴۴

۱ اداریہ ۵
۲ اقبال اور حیدر آباد ۸
۳ پیامات — سر مہاراجہ بہادر، سر اکبر حیدری، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی عبدالحق صاحب، خان بہادر عبدالرحمٰن چغتائی، راجہ نرسنگ راج بہادر عالی ۹
۴ موت و زندگی ترجمان حقیقت علامہ اقبال ۱۳
۵ اقبال کا آخری کلام ۱۴
۶ وداع اقبال (نظم) علی اختر، اختر ۱۶
۷ حضرت اقبال (نظم) میر سکندر علی وجد بی اے، ایچ سی ایس ۱۷
۸ اقبال کا پیام حیات ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ایم اے (کیمبرج)، پی ایچ ڈی (لائپزگ)، پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ ۲۰
۹ اے کاش چراغ (نظم) مخدوم محی الدین ایم اے ۳۵
۱۰ اقبال (نظم) ماہر القادری ۳۶
۱۱ نذر اقبال جہاں بانو بیگم بی اے، لکچرار اردو کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ ۳۸
۱۲ اقبال سے (نظم) بشیر النساء بیگم بشیر ۴۰
۱۳ اقبال اور اس کی شاعری لطیف النساء بیگم بی اے ۴۱
۱۴ اقبال (نظم) شور عابدی (گلبرگہ) ۴۸

حیدر آباد میں یوم اقبال

۱۵ تمہید خواجہ حمید الدین شاہد ۴۹
۱۶ ارشاد صدارت ہز ہائنس والاشان شہزادہ برار ولی عہد بہادر ۵۰
۱۷ پیامات سر اکبر حیدری، سر آغا خاں، سر سکندر حیات خاں، جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، رابندر ناتھ ٹیگور، سر مرزا اسمٰعیل، نواب صاحب رام پور، نواب صاحب بھوپال اور دیگر حضرات ۵۱
۱۸ خطبہ صدارت سر یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر ۵۲
۱۹ عالمی ضبط و نظم کے متعلق اقبال کا تصور ڈاکٹر سید عبداللطیف پی ایچ ڈی سابق پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ ۵۴
۲۰ اقبال کی اردو شاعری پر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ ۵۵
۲۱ اقبال (نظم) تمکین ۵۷
۲۲ اقبال کی حسن کاری سید محمد اکبر وفاقانی بی اے، ال ال بی ۵۸
۲۳ اقبال (نظم) مخدوم محی الدین ایم اے ۵۹
۲۴ مجاہد اقبال مخدوم محی الدین ایم اے ۶۰
۲۵ اقبال (نظم) میر سکندر علی وجد بی اے، ایچ سی ایس ۶۱
۲۶ اشارات علی منظور منظور ۶۲
۲۷ اردو شاعری اور اقبال عباس جعفری ۶۳
۲۸ مشرق کے مایہ ناز شاعر کی زندگی پر ایک نظر حبیب اللہ اوج ۶۴

اقبال کی وفات کے بعد

۲۹ انتقال کی خبر اور تفصیلات ۶۵
۳۰ بیانات ٹیگور، جواہر لال نہرو، سوبھاش بوس، محمد علی جناح، سر تیج بہادر سپرو، بہادر یار جنگ، سر سلطان احمد وغیرہ ۶۶
۳۱ تعزیتی جلسے ۶۸
۳۲ حیدر آباد میں سب سے بڑا تعزیتی جلسہ
۳۳ پیامات ہز ہائنس ولی عہد بہادر شہزادہ برار، والاشان نواب معظم جاہ بہادر، سر اکبر حیدری، سر مرزا اسمٰعیل، سر سکندر حیات خاں، محمد علی جناح، سر امین جنگ بہادر ۶۹
۳۴ تقریریں (اقتباسات) نواب مہدی یار جنگ بہادر، نواب مقصود جنگ، راجہ پرتاب گیر جی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں وغیرہ ۷۱
۳۵ اقبال کی نسبت میرے ذاتی تاثرات محمد جلال الدین اشک بی اے، ال ال بی ۷۳
۳۶ مطرب آتش نفس (نظم) سید عبداللہ جعفری صفیر ۸۰

شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۳۷	اقبال تاریخ وطن کے آئینہ میں	محمود مجاہد	۸۱
۳۸	یاد اقبال (نظم)	شاہد صدیقی	۸۷
۳۹	اقبال کی شاعری کا آخری دور	پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ایل ایل بی جامعہ عثمانیہ	۸۸
۴۰	اقبال (نظم)	کاوش حیدرآبادی	۹۲
۴۱	اقبال کا شاعرانہ فلسفہ	ابوظفر عبدالواحد ایم اے لکچرار اسلامیہ کالج	۹۳
۴۲	آہ اقبال (نظم)	عبدالقیوم خاں باقی ایم اے ریسرچ اسکالر	۹۸
۴۳	اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر	لطیف النساء بیگم بی اے	۹۹
۴۴	اقبال کی نعتیہ شاعری	سید وحید اللہ وحید (علیگڑھ)	۱۰۵
۴۵	آہ اقبال (نظم)	علی احمد خلف نواب فصاحت جنگ جلیل	۱۰۹
۴۶	یاد اقبال	صغرا ہمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا	۱۱۰
۴۷	شاعر حکمت شناس	ہندراج سکسینہ ایم ایس سی لکچرار جامعہ عثمانیہ	۱۱۳
۴۸	اقبال (رموز اور شاعری)	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ	۱۱۹
۴۹	کلام اقبال کی بعض خصوصیتیں	خواجہ حمید الدین شاہد	۱۲۶ تا ۱۲۸
۵۰	علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال	محمد احمد سبزواری بی اے (از بھوپال)	۱۲۹
۵۱	اقبال کی وطن پرستی	گرو چرن داس سکسینہ	۱۳۵
۵۲	اشک خونیں (نظم)	نوشابہ خاتون بی اے	۱۳۷
۵۳	علامہ اقبال کے ساتھ چند لمحے	محمد الیاس بی اے (نظام کالج)	۱۳۸
۵۴	اقبال کا نوجوانوں کو پیغام	کلراج پرشاد	۱۴۰
۵۵	کاشف راز حقیقت (نظم)	محمد احمد اللہ خاں منصور (آصف آباد)	۱۴۱
۵۶	شعرا کا خراج تحسین (انتخابات)	محمود، برو، وزیر، محمد سکندر علی سکندر، بیر، کاظم علی ابرق، مولوی مرزا شاکر علی دانش، غوث محی الدین نوید (علیگڑھ)، ابوالعلی، محمد احمد اللہ احمد، غلام دستگیر خاں، تحسین، قاسم علی، حمود علوی، سید فخر الحسن لکچرار ٹرینگ کالج، مرزا نادر علی نادر، سید محمد حسین آزاد، میر حسن علی خاں تحسین، گویرن بی آزاد، محمد جمال، محمد اکرام الحق صدیقی عبرت، ابوالکلام محمد شیخ شاغل، عارف چھیتاپوری، محمد اسعد صدیقی، امجد، جمیل، شیخ حسین، ابوالمجاہد احمد اللہ احمد، بشیر النساء بیگم بشیر، معین الدین مجبر دکنی	۱۴۲ تا ۱۴۴

شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
۵۷	اقبال کا تخیل	سید محمد ایم اے لکچرار سٹی کالج	۱۴۵
۵۸	بچوں سے دو باتیں	مدیر	۱۴۶
۵۹	یاد اقبال	رشید قریشی	۱۴۷
۶۰	اقبال	محمد مسیح الدین خاں (بشیر آباد)	۱۴۸
۶۱	ناموراقبال	سعیدہ مظہر (کلیۃ البنات جامعہ عثمانیہ)	۱۴۹
۶۲	دوستوں کا مکالمہ	مرزا عثمان بیگ (سٹی کالج)	۱۵۰
۶۳	بچے کی دعا (نظم)	اقبال	۱۵۱
۶۴	محسن قوم اقبال (نظم)	لطیف النساء بیگم بی اے	۱۵۲
۶۵	اقبال نے بچوں کی کیا کیا خدمت کی	عبدالسلام ذکی بی اے بی ٹی	۱۵۳
۶۶	سر محمد اقبال	ابوالحسن	۱۵۵
۶۷	حیات اقبال	شیخ رحیم الدین (ظہیرآبادی)	۱۵۶
۶۸	اقبال زندہ ہے	محبوب الٰہی خاں تحرز بنگلوی	۱۵۷
۶۹	اقبال	معین الدین احمد انصاری	۱۵۸
۷۰	آہ سر اقبال	محمود علی	۱۵۹
۷۱	کھویا ہوا شاعر	محمد عمر علی فاضل	۱۶۰
۷۲	اقبال نے بچوں کے لئے کیا لکھا	ح۔ انصاری	۱۶۱
۷۳	زندۂ جاوید	مرزا معین بیگ	۱۶۲
۷۴	پرندے کی فریاد (نظم)	اقبال	۱۶۵
۷۵	اقبال کے چند منظوم مکالمے اور کہانیاں	محمد معین الدین	۱۶۶
۷۶	ماں کا خواب (نظم)	(اقبال)	۱۶۸
۷۷	معمۂ اقبال	معین الدین احمد انصاری	۱۶۹

اداریہ

دردیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبالؔ
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت
(گرامیؔ)

اہلِ ہند نے اقبالؔ کی زندگی کے آخری ایام میں ان کی قدر و منزلت کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان کی آنکھوں سے "آشنانا آشنائی" کے پردے اٹھتے جا رہے ہیں اور ان میں جوہر شناسی کے ساتھ ساتھ خود شناسی کا مادہ بھی پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ابتدا تھی ایک عظیم المرتبت شاعر کو خراجِ تحسین ادا کرنے کی اور ممکن ہے اگر وہ زندہ رہتا تو دیکھ لیتا کہ اس کے وطن والے اس کو کس طرح پہچان گئے ہیں ـــــ ایک طرف تو سارے ہندوستان میں "یومِ اقبال" منایا جا رہا تھا اور دوسری طرف اقبالؔ اپنی مادی زندگی کے آخری دن ختم کر رہے تھے۔ اس کے بعد پانچ مہینے بھی گزرنے نہیں پاتے کہ وہ مسکراتے ہوئے ایک مردِ مومن کی طرح اس مقامِ بلند پر پہنچ جاتے ہیں جہاں اُن کی "فریادوں" نے ہنگامہ مچا رکھا تھا۔

مسلسل ہنگامہ یا صرف موقتی جلسے؟

ان کی وفات کے بعد بھی سارے ہندوستان میں ان کے لئے خراجِ تحسین ادا کیا گیا یہ کوئی نئی بات نہیں مرنے کے بعد قدر و منزلت ہوا ہی کرتی ہے۔ لیکن بات جب ہے کہ اس نمائشی ماتم سے ہٹ کر جس کا ماحصل چند جلسے ہیں، جن کی رونق ایک ہنگامے کے بعد ختم ہو جاتی ہے، چند آنسو ہیں جو آنکھوں سے ڈھلک کر رائیگاں ہو جاتے ہیں، چند "تحریکات" ہیں جو زبان سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی ہیں، ہم اپنی زندگی میں وہ مسلسل ہنگامہ پیدا کریں جو "یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم" کا مظہر ہو۔ اپنے افسردہ اور بے رنگ چہروں پر زندگی کی وہ جھلک لہرائیں جو حیات آفریں تبسم کے سیلاب میں ہمارے گریۂ بے اثر کو غرق کر دے۔ اور خاموشی میں وہ "لذتِ فریاد" پیدا کریں جو زمین سے پرواز کر کے آسمانوں پر پہنچ جائے۔

اگر ہم نے اپنے آپ میں اقبالؔ کے پیام سے حیات آفرینی کی یہ قوت حاصل کر لی تو ہم اُن کی موت پر ظاہری ماتم میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اُن کے پیام پر عمل کر کے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اہلِ ہند نے اپنے شاعر کی کاوشِ پیہم اور سوز دروں کو رائیگاں نہیں کیا۔ اقبالؔ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ ان کا کلام ان کی موت کے بعد بھی "زندہ مردوں" کے لئے اسی طرح "پیامِ زندگی" دیتا رہے گا، ہندوستانِ جدید کے نوجوان جن کی ناؤ "مشرق و مغرب" کے سنگم پر "ساحلِ کشمکش" سے ٹکرا رہی ہے اگر اقبالؔ کے اضطراب آگیں پیام کو اپنے لئے خضرِ راہ بنا لیں تو ان کا ہر سانس بانگِ درا بن سکتا ہے۔

حیدرآباد اور اقبال

اقبالؔ کو حیدرآباد سے خاص محبت تھی، اس کا ثبوت ان خطوط سے ملتا ہے جو انھوں نے اپنے حیدرآبادی احباب کو لکھے تھے وہ چاہتے تھے کہ حیدرآباد میں "مستقل بود و باش" اختیار کریں۔ چنانچہ جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون کی پروفیسری اور اس کے بعد عدالت العالیہ کی رکنیت پر اقبالؔ کے تقرر کی خبریں یقین کی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ لیکن بعض اتفاقی حالات نے دونوں مرتبہ حیدرآباد کو ان کی خدمات سے محروم رکھا۔

۱۹۲۸ء میں اقبالؔ نے مدراس جاتے ہوئے حیدرآباد میں قیام کیا تھا اور ٹاؤن ہال میں دو معلومات آفریں تقریریں کی تھیں۔ اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی نے انہیں باریاب کیا تھا۔ مہاراجہ بہادر نے ان کے اعزاز میں ایک بزمِ سخن بھی منعقد کی تھی۔ بندگانِ عالی کی شان اور مہاراجہ بہادر کی مدح میں اُن کی نظمیں اس کا ثبوت ہیں کہ وہ ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست کے ہر دلعزیز بادشاہ اور وزیر کی کس قدر عزت کرتے تھے۔ "گورستانِ قطب شاہی" پر ان کی مشہور نظم اسی قیامِ حیدرآباد کا نتیجہ ہے۔

جنوری میں حیدرآباد نے "یومِ اقبال" منایا اور اس خصوصیت کے ساتھ منایا کہ اس کی صدارت ہز ہائنس شہزادۂ برار نے فرمائی اور

ان کی وفات کے بعد نہ صرف حیدرآباد میں ایک عظیم الشان ماتمی جلسہ کیا گیا بلکہ اضلاع اور تعلقوں کے باشندوں نے بھی سوگ منایا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حیدرآباد میں اقبال کی ذات کس قدر عزیز تھی اور ان کا کلام کس قدر مقبول تھا؟ —— اقبال سے یہ والہانہ عقیدت اہلِ حیدرآباد کے ان دلی جذبات کا نمایاں ثبوت ہے جن کو ہز ہائینس شہزادۂ برار نے اپنے ارشادِ صدارت میں یوں ظاہر فرمایا تھا۔

"اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے ذریعے تمام مشرق میں موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے۔ بجا طور پر وہ دنیا کا ایک بہت بڑا مفکر اور مصنف مانا جاتا ہے اور بہ حیثیت شاعر وہ بنی نوعِ انسان کے لئے ایک پیغام کا حامل ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے۔"

"سب رس" کا خراجِ عقیدت شاعرِ مشرق کی خدمت میں

"اقبال" کی وفات پر نا ممکن تھا کہ حیدرآباد کے مشہور "ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہنامہ "سب رس" اردو کے سب سے بڑے "شاعرِ حیات" کی خدمت میں اپنا خراجِ عقیدت ادا نہ کرتا۔ اس نے بھی کوشش کی ہے کہ اس خصوص میں بساط بھر حصہ لے۔ چنانچہ یہ شمارہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس موقع پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اس شمارہ کو نکالنے کا خیال اس وقت آیا جب کہ مئی کا "سب رس" تقسیم ہو چکا تھا اور "ادارۂ سب رس" جون نمبر کی تیاری میں مصروف تھا۔ پندرہ روز کے عرصے میں کارکنانِ سب رس نے جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ یہی نہیں ہے جو آپ پیشِ نظر شمارہ میں دیکھیں گے بلکہ عدمِ گنجائش کے باعث کئی مضامین اور نظمیں نہیں چھپ سکیں، جن کا ادارۂ سب رس کو افسوس ہے۔ اس کے علاوہ "سب رس" کے اکثر بیرونی معاونین کے مضامین بھی مہلت نہ ملنے کی وجہ سے وقت پر وصول نہ ہو سکے اور خود اہلِ ملک کے بعض مضامین بدیر وصول ہوئے جن کو ہم شریکِ رسالہ نہ کر سکے۔

حیدرآباد میں ادبی قابلیت کا قحط نہیں ہے۔

اس قدر کم مدت میں "اقبال نمبر" کی ترتیب اور اشاعت نے ہمارے اس خیال کو یقین سے بدل دیا ہے کہ حیدرآباد میں ادبی قابلیت کا قحط نہیں ہے۔ "اقبال نمبر" کی اشاعت کا اعلان ہی ہوا تھا کہ ملک کے انشاپردازوں نے ہماری قلمی اعانت کی طرف توجہ کی۔ اور چند ہی دنوں میں ہمیں اتنے مضامین وصول ہو گئے جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں خاموش خدمت گزارانِ اردو کی کمی نہیں ہے۔ کیا اچھا ہو کہ انفرادی مساعی کے علاوہ ہمارے ہاں منظم طریقے سے اجتماعی ادبی کوششیں شروع ہو جائیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ حیدرآباد کو اجتماعی کوششیں راس نہیں آتیں۔ لیکن یہ خیال خود وہی لوگ کرتے ہیں جنہوں نے کبھی اس قسم کی کوشش نہیں کی۔ "ادارۂ ادبیات اردو" کو اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے جو محترمی ڈاکٹر زور کی مخلصانہ کوششوں سے سب ملک کا واحد ادبی ادارہ بن گیا ہے جس نے بیسیوں انشاپردازوں کے مضامین اور کتابیں کامیاب طریقے سے شائع کی ہیں، اور جس کو اردو کے اکثر اہلِ ذوق اصحاب کا تعاون حاصل ہے۔

"اقبال نمبر" کے لئے مضامین اور نظمیں فراہم کرنے کے علاوہ کارکنانِ سب رس کے پیشِ نظر زیادہ دقت طلب کام اس کی طباعت و اشاعت کا تھا۔ اس دشوار گزار گھاٹی سے وہی لوگ واقف ہیں جنہوں نے اس میں قدم رکھا ہے اور حیدرآباد کی طباعتی دشواریوں سے واقف ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ منزل بھی صبر آزما ثابت نہیں ہوئی۔ اور وہ اس قابل ہو سکے کہ وقت پر یہ رسالہ شائع کر سکیں۔

سرورق، تصاویر اور مضامین

اس شمارہ کا سرورق مسٹر خلیل نے تیار کیا ہے جو "سب رس" کے اولین معاونوں میں سے ہیں۔ پہلے بھی ان کے سرورق "زینتِ "سب رس" بن چکے ہیں۔ مسٹر خلیل کو سرورق بنانے کا خاص سلیقہ ہے۔ وہ اپنے موقلم سے لکیروں میں وہ حسن کارانہ روح بھر دیتے ہیں جن میں "تخیل و صداقت" ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔

مسٹر افضل حسین آرٹسٹ نے "اقبال نمبر" کے لئے اقبال کی ایک نظم اور ایک شعر کو مصور کیا ہے ان کے "آرٹ" کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مختلف خیالات کو ایک جگہ دیدہ زیب انداز میں جمع کر دیتے ہیں۔ "پیام صبح" میں آپ وہ ساری باتیں دیکھیں گے جو ہر صبح ہوتی ہیں اور جن کو اقبال نے اپنے فلسفیانہ تخیل سے نظم کیا ہے۔ دوسری تصویر کی اہمیت موجودہ زمانے میں زیادہ بڑھ جاتی ہے اس لئے کہ موجودہ "فرقہ وارانہ فضا" کا یہ ایک لطیف حل ہے جو مصور کے قلم سے نکلا ہے۔ مسٹر افضل حسین نے بندگان عالی کے ایک مشہور شعر کو بھی مصور کیا ہے۔ سرکار فرماتے ہیں ؎

سلاطینِ سلف سب ہو گئے نذرِ اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشاں باقی

اس "علوئے تخیل" اور "حقیقتِ ثابتہ" کو تصویر کے پردے پر ظاہر کرنے کی عزت مسٹر افضل حسین کے حصے میں تھی۔ یہ تصویر "قصر فلک نما" میں حسب الحکم بندگان عالی رکھوائی گئی ہے۔

مشرق کے سب سے بڑے حسن کار خاں بہادر عبدالرحمان چغتائی نے بھی "سب رس" کو اپنا مرہونِ احسان کیا ہے۔ اور اقبال کی ایک رباعی کو اپنے مخصوص اندازِ حسن کاری میں مصور کر کے عنایت کیا ہے۔

محترمی ڈاکٹر زور کی مہربانیاں شامل حال نہ ہوتیں تو ہم کبھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں پاتے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف قدم قدم پر ہماری رہنمائی فرمائی بلکہ شروع سے آخر تک عملی حصہ لیا۔ آپ نے ہمیں اقبال کی ایک اور غیر مطبوعہ تصویر بھی عنایت فرمائی ہے۔

ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ یہ تصویر اپنی نوعیت کی ایک ہی تصویر ہے۔

"سب رس" کے "اقبال نمبر" کے لئے بعض مشاہیر نے خاص طور پر پیامات روانہ فرمائے ہیں۔ اس کے ذریعے سے نہ صرف اقبال کے متعلق ان کے تاثرات کا اظہار ہو سکے گا بلکہ یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ وہ "سب رس" کی مساعی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون جو اقبال کی حیات اور شاعری سے متعلق ہے دراصل ان کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے "انجمن ترقی طلبہ" کے زیر اہتمام کی تھی اس کو مسٹر خواجہ حمید الدین مہتمم سب رس اور مسٹر محمود علی نے لکھ لیا تھا۔ ادارہ ان دونوں حضرات کا شکر گزار ہے۔

حیدرآباد کے علم دوست حضرات نے اس نمبر کے مضامین اور نظموں پر انعامات دینے کے وعدے کئے ہیں جس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ ان مضامین کا اعلان آئندہ نمبر میں کیا جائے گا جو انعام کے مستحق ہیں۔ انعام عطا کرنے والوں میں نواب دلی داد خاں صاحب جمعدار مندوری، محترمہ بیگم صاحبزادہ میر جہاندار علی خاں صاحب، صاحبزادہ میر اشرف علی خاں صاحب بی۔ اے، سراج الدین احمد صاحب، معین الدین احمد صاحب انصاری اور خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کے نام قابل ذکر ہیں۔

کارکنانِ سب رس کی ان انتھک کوششوں کا ماحصل جو "اقبال نمبر" کی صورت میں ہے اس لئے نہیں ہے کہ اس کو دکھا کر ہم تعریفی جملے حاصل کر لیں بلکہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اقبال کے نام اور پیام کو ہر اردو داں تک پہنچا دیں۔

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی (اقبال)

اعتذار۔ سب رس کا اقبال نمبر بالکلیہ تیار ہو چکا تھا لیکن بعض تصاویر لاہور سے دیر میں وصول ہوئیں ان کے بغیر رسالہ کو شائع کر دینا ہم نے مناسب نہیں سمجھا اگرچہ اس سے "سب رس" کی اس روایت پر حرف آنے کا اندیشہ تھا جو "پابندیٔ وقت" کی خصوصیت بن کر اس سے وابستہ ہو گئی ہے۔ افسوس ہے کہ مسٹر خلیل کا بنایا ہوا سہ رنگی ٹائٹل بھی بر وقت چھپ نہ سکا۔

امید کہ "سب رس" کے قدرداں ہماری مجبوریوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہمیں معاف فرمائیں گے۔

میکش

اقبالؔ اور حیدرآباد

قلعہ گولکنڈہ

آہ جولانگاہِ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور، اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکانِ کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثالِ پاسباں استادہ ہے
گرچہ باغِ زندگی سے گل بداماں ہے زمیں
سیکڑوں خوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں

قطب شاہی مقبرے

خوابگہ شاہوں کی ہے یہ منزلِ حسرت فزا
دیدۂ عبرت! خراجِ اشکِ گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبشِ مژگاں سے ہے چشمِ تماشا کو حذر
کہہ رہی ہے کوئی ایامِ کہن کی داستاں
چاندنی گرتی ہے میناروں سے کیا گرہ کشاں
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

دکن

کیا کہوں اس بوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا ہے ہمنوا میرا گذر
جس کے ذرے مہرِ عالمتاب کو سامانِ نور
جس کی بلور افروزیوں پر دیدۂ موسیٰ نثار
جس کے بلبل عندلیبِ عقلِ کل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لئے رخسارِ حور آئینہ دار
خطۂ جنت فضا جس کی ہے دامنگیرِ دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسمِ اعظمِ محبوب کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار
نور کے ذروں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار

سر یمین السلطنۃ مہاراجہ بہادر

اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار
مسند آرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اس کی رائے روشن سے ہے نگاہِ روزگار
اس کی تقریروں سے ہے رنگیں گلستانِ شاعری
اس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار
ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقۂ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زرنگار
نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مرورِ روزگار
شکر یہ احساں کا اے اقبالؔ لازم ہے مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

قطب شاہی سلاطین

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک
کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال
مصر و بابل مٹ گئے باقی نشاں تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آدبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایام نے
دل ہمارے یادِ عہدِ رفتہ سے خالی نہیں
اپنے شاہوں کو یہ امت بھولنے والی نہیں

پیامات

ہز اکسلنسی راجۂ راجایان مہاراجہ

ڈاکٹر سر کشن پرشاد بہادر

یمین السلطنت جی سی آئی ای۔ ال ال ڈی
پیشکار و سابق صدر اعظم باب حکومت

ڈاکٹر سر اقبالؔ فقیر کے مخلص دوست تھے ان کی بے وقت مفارقت سے شعر و سخن کا ایک درخشاں ستارہ غروب ہو گیا۔ مرحوم نے فلسفہ کی گتھیوں کو نظم کے ذریعے آسان اور عام فہم بنا دیا ہے۔ دنیا کی فضائیں اُن کے منظوم نغموں سے گونجتی اور آنے والی نسلوں کے دلوں میں مرحوم کی یاد ہمیشہ تازہ کرتی رہیں گی

ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری

نواب حیدر نواز جنگ بہادر

پی سی۔ کے ٹی۔ ال ال ڈی۔ ڈی سی ال
صدر اعظم باب حکومت دولتِ آصفیہ

اقبالؔ جیسے فوق الانسان ہستیوں کو موت نیست و نابود نہیں کر سکتی اگرچہ کہ موجودہ پریشان زمانے میں اقبالؔ خود ہماری رہبری کے لئے موجود نہیں رہے ان کے کلام میں وہ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔ اور ہمیں اس سے سبق ملتا رہے گا وہ دن بھی ضرور آئے گا جب ہمارا ملک بلکہ ہماری دنیا اس شاعر کے بلند پایہ خیالات پر عمل پیرا ہوگی

خاص "سب رس" کے لئے

پنڈت جواہر لال نہرو

خاص "سب رس" کے لئے

ہم ایک سیاسی دور سے گذر رہے ہیں جس میں افراد کی عظمت اور اہمیت اُن کے اس حصہ سے جانچی جاتی ہے جو وہ سیاسی میدان میں لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ عظمت یا اہمیت کی کسوٹی نہیں ہے۔ قوم اپنے شاعروں اور فلسفیوں سے پہچانی جاتی ہے نہ کہ اربابِ سیاست سے اور اس طرح سر محمد اقبال کا درجہ بحیثیتِ شاعر و فلسفی دورِ حاضر کے موقتی اربابِ سیاست سے کہیں اعلیٰ ہے۔ یہ حق بجانب ہوگا اگر ہم اُن کی یاد میں ہدیۂ عقیدت پیش کریں اور ان کے کلام سے ہدایت حاصل کریں۔

Message

We are living in a political age and the greatness and importance of individuals are usually judged by the part they play in the political field, and yet this is no test of greatness or importance. A nation is ultimately known by its poets and philosophers not by its politicians and so Sir Mohammed Iqbal's position as a poet and a philosopher is far greater than that of the passing politicians of the day It is right that we should pay homage to his memory and seek inspiration from his writings.

مولانا عبدالماجد فلسفی دریابادی مدیر اخبار "صدق"

اقبالؔ کی ستائش میں زبان کھولنا، درپردہ اپنی مدح و ستائش کرنا، اور گویا اس کا اعلان کرنا ہے کہ ہم بھی صاحبِ بصیرت ہیں، اہلِ بینش ہیں، جوہر شناس ہیں!

مادحِ خورشید مداحِ خود ست ۔۔۔ کیں دو چشمم روشن و نامرمد ست

عرض کرنے کی کچھ گنجائش ہوتی، تو میں وہی کہتا، جو جامیؒ حضرت مولانا رومؒ سے متعلق کہہ گئے ہیں ؎

من چہ گویم وصفِ آں عالی جناب ۔۔۔ نیست پیغمبر و لے دارد کتاب

اب تو صرف اسی قدر عرض کرنا ہے کہ اقبالؒ پر اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں، کہ اُسے شاعر قرار دیا جائے ——— "شاعر" جس معنی میں ہمارے ہاں عام طور پر مستعمل ہے، یعنی نظم گو، یا قافیہ پیما، یا غزل سرا۔ لفظی یا تُفرکی صناعیوں سے اس حکیم دخت و نباضِ ملت کو واسطہ کیا تھا؟ وہ صحیح معنی میں پیغمبروں کا جانشین، ایک "پیغام" لے کر آیا تھا، اسے سنا کر اپنے اصلی عالم کو واپس چلا گیا، اور دنیا ورطۂ حیرت میں پڑی ہوئی یہ کہتی ہی رہ گئی ؎

کہ کشید دامنِ فطرت کہ بہ قیدِ ما و من آمدی
تو بہارِ عالمِ دیگری زکجا بہ ایں چمن آمدی

مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب

اے آر سی اس۔ بی اس سی۔ ایف ام یو۔ ایف او یو۔ فیلو رائل اسٹرانامکل سوسائٹی سابق صدر کلیہ جامعۂ عثمانیہ۔

سب رس کی یہ اشاعت اقبال مرحوم کے اعزاز میں شائع ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور اور اُن کے شرکا کار قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اس شہرۂ آفاق ہستی کی آخری خدمت اپنے ذمہ لی اور مرحوم کے عقیدتمندوں اور مرتبہ شناسوں کو اپنے دلی جذبات کے اظہار کا موقع دیا۔

میں نہ شاعر ہوں اور نہ فلسفی۔ لیکن اچھا کلام اور سچی بات ہر کسی کو بھاتے ہیں۔ مرحوم کے تصانیف کے مطالعہ کے بعد کون ایسا شخص ہوگا جو اقبال کے دل و دماغ کی داد نہ دے گا۔ شعرا میں عالم اور علما میں شاعر بڑے پایہ کے بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں خواہ بلادِ مشرق میں یا بلادِ مغرب میں لیکن عالم و شاعر کا اجتماع فطرت نے اقبال کی خمیر میں جلوہ گر کر کے بتایا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت اقبال اور اس کے تصانیف و حالاتِ زندگی پر تحقیق کرنے والوں کی ایک کثیر جماعت تیار ہوگئی ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اقبال کا سچا احترام اور اس کے ساتھ دلی محبت کا اظہار جس طرح نوجوانانِ حیدرآباد کیا ہے ہند کے کسی اور خطہ میں نہیں کیا گیا۔ اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ ملکِ دکن کو اپنی اس حق شناسی پر فخر ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر باشندے پر اقبال کی خدمت فرض ہے۔ جن لوگوں نے یہ خدمت انجام دی انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔

اقبال کی زندگی سے متعلق اگر کوئی بات مجھ کو ناقابل تلافی رنج دیتی ہے تو اہلِ ملک کی وہ سرد مہری ہے جو اقبال کے ساتھ برتی گئی۔ اردو دانوں اور ہندی نژاد علما نے جب اس کی خاطر خواہ قدر نہیں کی تو اغیار کی بے اعتنائی کا کیا گلہ۔ جاہلانہ تعصب بعض تنگ خیال اشخاص کو اقبال کی زبان آفرینی، بلند خیالی اور نزاکت طبع کی جیسی قدر کرنی چاہیئے تھی ویسی قدر کرنے سے پہلے روکا۔ اگر اردو داں حضرات اس فاحش غلطی کے مرتکب نہ ہوتے اور ملک اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ کی ہر وقت قدر کرتا تو اہلِ وطن اس سے بہت بیش بہا فائدہ اٹھاتے۔ خیر۔ اقبال کے کلام اور اس کے ہدایات سے ملک اب بھی مستفیض ہو سکتا ہے۔

اقبال کا شمار نہ صرف اسلام کے اکابر شعرا میں ہے بلکہ ہند کے سچے اور بے تعصب وطن پرستوں کے بڑے سے بڑے لیڈروں پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ صداقت اس کا نصب العین تھی اور جو کچھ اس کے قلم یا زبان سے نکلتا تھا اس کے دل سے نکلتا تھا۔ گویا قلب کا ایک ٹکڑا تھا جو کلام کی شکل میں رونما ہوتا تھا۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت دے۔ آمین۔

خان بہادر عبدالرحمان چغتائی (لاہور)

"سب رس" کے ساتھ ہر طرح کی ہمدردی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ خدا اس کی عمر دراز کرے اور بلند اقبال بھی۔ گرمیوں میں اکثر میں کام کرنے کے قابل نہیں رہتا، ورنہ ضرور "اقبال نمبر" کی خدمت کرتا۔ اقبال کے ساتھ میری آخری ملاقات تو ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے، جس کے متعلق میں کسی دوسرے موقع پر تحریر کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے لئے مسلمان قوم کو ایک نیا گھر، نیا ملک، نئی دنیا آباد کرنی چاہئے تھی مگر جس غریب قوم کا وہ شاعر اور پیغام بر تھا اس نے اس کو امید سے زیادہ اچھی جگہ دی۔ اس کی آرام گاہ شاہی مسجد کا دامن ہے جس کا بانی اورنگ زیب تھا، جہاں ہزاروں مسلمان روزانہ آتے جاتے رہتے ہیں شام کے وقت تو اتنا دردناک اور پُرسوز منظر رہتا ہے کہ سنگ دل سے سنگ دل انسان کی آنکھوں سے بھی بے ساختہ آنسو ٹپک پڑتے ہیں کوئی اقبال کے شعر پڑھتا ہے، کوئی اس کی روح کو درود کا تحفہ بھیجتا ہے اور کوئی کلام الٰہی کا ورد کرتا رہتا ہے —— اور وہ شاعرِ اعظم خاموشی سے، اس مجاہد اور غازی کے قدموں کی آہٹ پر کان لگائے ہے جس نے ہندوستان میں پہلی مرتبہ قوت کے ساتھ اسلام کا پیام دیا تھا۔

اقبال کے چلے جانے سے لاہور کی فضا سونی ہے اور دلوں پر ایک قسم کی مردنی چھائی رہتی ہے۔ خدا آپ کو "اقبال نمبر" کے شائع کرنے میں کامیابی دے۔ ہر طرح سے میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی

بے تابیٔ دل سے ہائے سوئیں کیونکر
غم اشکِ رواں سے اپنے دھوئیں کیونکر
عالی شعرا بہت ہیں، اچھے کم ہیں
اقبال کو ہم کھو کے نہ روئیں کیونکر

کیا موت نے ڈھونڈا ہے بہانہ اقبال
کیونکر تجھے بھولے گا زمانہ اقبال
عالی کو تو رہ رہ کے خیال آتا ہے
اب کون سنائے گا ترانہ اقبال

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں پیہم دواں ہردم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

موت

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے
اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس
مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے
فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبالؔ

اقبال کا سب سے آخری کلام

بہشتے بہرِ اربابِ ہمم ہست — بہشتے بہرِ پاکانِ حرم ہست
بگو با مسلمِ ہندی کہ خوش باش! — بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست

انتقال سے قبل شاعرِ مشرق نے یہ شعر پڑھا تھا۔

"نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یہ قطعہ آخری ایام میں ترجمانِ حقیقت کے وردِ زبان تھا

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبال

وداعِ اقبال

الوداع اے نُطق کی سحر آفرینی کے امام
الوداع اے محفلِ معنیٰ کے میرِ اہتمام
الوداع اے بزمِ مشرق کے خداوندِ سخن
الوداع اے نکتہ سنجِ نازشِ اربابِ فن
الوداع اے مطربِ پاکیزہ الحاں الوداع
الوداع اے سرخوشِ صہبائے عرفاں الوداع
الوداع اے خسروِ شیریں کلامی الوداع
الوداع اے حسنِ فطرت کے پیامی الوداع

جا! کہ تیری منتظر تھی دیر سے خلدِ بریں
اُٹھ! کہ یہ دنیا ابھی اسرار کی محرم نہیں

(۲)

اے کہ تیرے نور سے رخشاں ہوئی صبحِ وطن
تو نے کی ویرانۂ ہستی میں تعمیرِ چمن
سازِ مشرق میں سمو دی نغمۂ مغرب کی لے
تو نے یا بھر دی نئے پیالوں میں صہبائے کہن
ہستیٔ موہوم سے پھوٹا حقیقت کا جمال
پنکھڑی پر جیسے رقصاں صبح کی پہلی کرن
تو نے اُن پھولوں کو سینچا باغبانِ پختہ کار
انجم گردوں سے ٹکراتا ہے جن کا بانکپن
اب بجھا سکتی نہیں جس کو ہوائے روزگار
تو نے سینوں میں لگا دی زندگی کی وہ لگن
تو نے چھیڑا سازیوں اے مطربِ شیریں نوا
لے کے خود انگڑائیاں اٹھی عروسِ علم و فن
اللہ اللہ تیری فطرت کی جمال آرائیاں
خار و خس کو تو نے دی تقدیرِ وردو یاسمن

تیری تدبیروں کا منت کش ہے آئینِ بہار
بھول سکتا ہی نہیں تیرا یہ احساں روزگار

(۳)

شعرِ ہندی کہ تھا سرگشتۂ وہم و خیال
تو نے سمجھائے اسے فطرت کے اسرارِ جمال

"آرٹ" کی تعریف تھی یا گریۂ مرگ و مزار — شعر میں کہتے تھے یا افسانۂ ہجر و وصال
استعارے کی لطافت، خوبیاں تشبیہ کی — سطح بیں شاعر کی زد میں ہو رہی تھیں پامال
شعر نے تیرے سکھایا حسنِ انداز کلام — فکر نے تیری جلائی شمعِ آئینِ کمال
جوش ہے، میں ہوں بہت بیٹھے رہی اہلِ نگاہ — تھی مگر کچھ اور تیری جنبشِ موجِ خیال
شعر کا فطری سلیقہ، آگہی، فکرِ عمیق — سچ تو یہ ہے ایک بھی ہم میں نہیں تیری مثال
شاہدِ ہستی کو تو نے دیدیا حسنِ دوام — نطقِ انسانی کو تو نے کر دیا سحرِ حلال
تیری جو لکھٹ پر ادب سے جھکے رکھتے تھے جبیں — قیصر و کسریٰ کی عظمت، ہیرِ دانش کا جلال

مدتوں کرتی ہے گردش جستجو میں کائنات
تب کہیں ملتا ہے ایسا محرمِ رازِ حیات

(۴)

موت اور اقبال تو نے کیا کہا او سطح بیں! — موت اس کے گوشۂ داماں کو چھو سکتی نہیں
تو ابھی تک نارسی کی حد میں ہے گم کردہ راہ — ہستیٔ اقبال تھی سرنامۂ علم و یقیں
جس کی ہر موجِ نفس تھی نغمہ پردازِ حیات — شاہدِ مشرق کو جس نے کر دیا ناز آفریں
جاودانی حسن سے معمور تھا جس کا خیال — سرمدی انوار سے تابندہ تھی جس کی جبیں
جس نے مرجھائی ہوئی نبضوں میں دوڑا یا لہو — خاک کے ذروں کو جس نے کر دیا گردوں نشیں
خاک کو جس نے گلستاں کی لطافت بخش دی — جس نے گردوں سے بڑھا دی سرحدِ اہلِ زمیں
جس نے کھولے بے خبر دنیا پہ اسرارِ حیات — جس کی باتیں دل پذیر اور جس کے نغمے دل نشیں
ہستیٔ فانی کو جس نے جاودانی کر دیا — موت اس کو چھین لے ہم سے نہیں ہرگز نہیں

وہ بھی زندہ، اس کا پیغامِ عمل بھی زندہ ہے
زندگی کے نور سے اس کی جبیں تابندہ ہے

علی اختر

حضرتِ اقبال رحمتہ اللہ علیہ

ہر طرف سے آرہی ہے آہ وزاری کی صدا آسمانِ علم وفن پر غم کا بادل چھا گیا
چار سو اندھیر ہے مہرِ مبیں گہنا گیا ! غمگسارِ قوم کو خود قوم کا غم کھا گیا

آگئی فصلِ خزاں سارا چمن پامال ہے
سرزمینِ ہند بزمِ ماتمِ اقبال ہے

اے دیارِ علم وحکمت خطۂ ہندوستاں ! خاک سے اٹھے ہیں تیری کتنے ایسے نکتہ داں؟
بخش دی اقبال نے تجھ کو حیاتِ جاوداں جانتا ہے اس کی نسبت سے تجھے سارا جہاں

آج شمعِ بزم گو آسودہ زیرِ خاک ہے
اس کے اشکوں سے مگر خاکِ وطن نمناک ہے

قوم کو جس نے دیئے لبریز جامِ زندگی ہو گئے سیراب لاکھوں تشنہ کامِ زندگی
جوش نے جن کے بدل ڈالا نظامِ زندگی غرق کردی صبح کے جلووں میں شامِ زندگی

کشتیٔ دل کو سدا سیلاب پر کھیتا رہا
سست رفتاروں کو پیغامِ عمل دیتا رہا

قوم کی کایا پلٹ دی شعر کے اعجاز سے ہو گئے کمزور واقف لذتِ پرواز سے
صدق کے دریا بہا ڈالے جنوں کے ساز سے خرمنِ باطل جلایا شعلۂ آواز سے

داغِ محکومی کو آبِ اشک سے دھوتا رہا
ملک وملت کی تباہی پر سدا روتا رہا

بے سہارا ہو گئے ہیں آج دست و پائے قوم ہو گیا بے نور آخر دیدۂ بینائے قوم
بیوگی کا ہے مرقع چہرۂ زیبائے قوم پرتوِ امروز سے تاریک ہے فردائے قوم
شمع کے بجھتے ہی ساری رونقِ محفل گئی
حشر برپا ہے بنائے ملک و ملت ہل گئی

خوں بہا آنکھوں سے تو بھی آج اے اردو زباں اب حقیقت ہے ترے اقبال کی اک داستاں
موت کے قزاق نے لوٹی تری جنسِ گراں اور منزل سے ابھی ہے دور تیرا کارواں
تیرے جوہر دہر میں چمکانے والا مر گیا
حیف بد قسمت! ترا غم کھانے والا مر گیا

دور کی جس نے دلوں سے گردِ وہمِ کمتری رد کیا جس کی کرامت نے طلسمِ سامری
بے حقیقت ہو گئی الفاظ کی جادوگری بن گیا آئینۂ جذبات فنِ شاعری
موت کی وادی میں بادِ زندگی چلنے لگی
یاس کی محفل میں پھر شمعِ یقیں جلنے لگی

اب تری مظلوم حالت پر ترس کھائے گا کون؟ تیرے دامانِ تہی میں پھول برسائے گا کون؟
حسن کو تیرے اجاگر کر کے دکھلائے گا کون؟ برتری تیری زمانے بھر سے منوائے گا کون؟
کوچ دنیا سے ہوا اُس مردِ جوہر دار کا
جس نے بخشا تجھ کو دلکش بانکپن تلوار کا

ہمنشیں! قلبِ حزیں پر داغ کھاؤں کس لئے دید کی حسرت کا افسانہ سناؤں کس لئے
سامنے اغیار کے آنسو بہاؤں کس لئے کیا دھرا ہے اب وہاں لاہور جاؤں کس لئے
قافلہ ہے بھی تو کیا وہ زینتِ محمل نہیں
اب کسی کو دیکھنے کی آرزو دل میں نہیں

تونے اے اقبالؔ! پائی عاشقِ شیدا کی موت		جاں نثار و غمگسارِ ملتِ بیضا کی موت
موت ہے تیری زبان و قوم کے آقا کی موت		سوز و ساز و درد و داغ و عشقِ بے پروا کی موت

کون اب عقل و جنوں کی گتھیاں سلجھائے گا؟
کون سوزِ دل سے قلبِ روح کو گرمائے گا؟

فرقِ باطل کے لئے تو تیغِ بے زنہار تھا		مردِ کامل، صاحبِ دل واقفِ اسرار تھا
تادمِ آخر، توحید سے سرشار تھا		بہرِ حق سارے جہاں سے برسرِ پیکار تھا

تھے ترے سب کام مولیٰ کی رضا کے واسطے
دوستی اور دشمنی، دونوں خدا کے واسطے

تیری آنکھوں میں بسا تھا روئے احمدؐ کا جمال		ہیچ تھا تیری نظر میں بادشاہوں کا جلال
تیری شمشیرِ زباں تھی قاطعِ دستِ سوال		تیرا مسلک فقرِ حیدرؓ، عشقِ سلمانؓ و بلالؓ

شمعِ ایماں سے زمانے میں اُجالا کر دیا
عشق کا تونے جہاں میں بول بالا کر دیا

نعمتِ دیدار سے عاشق کا جی بھرتا نہیں		جان دینے میں وہ ہرگز پیش و پس کرتا نہیں
ڈرتے ہیں بے دین، مومن موت سے ڈرتا نہیں		زندۂ جاوید رہتا ہے، کبھی مرتا نہیں

مرتے مرتے فاش کر جاتا ہے رازِ زندگی
موت کے دامن پہ پڑھتا ہے نمازِ زندگی

"موسمِ گل تیری تربت پر گل افشانی کرے		روح پر تیری زمانہ فاتحہ خوانی کرے!
بارشِ الطاف کی خالق فراوانی کرے		قبر پہ تیری اُجالا شمعِ ایمانی کرے!

تاقیامت تجھ پہ ابرِ فصلِ گل روتا رہے!
تو یونہی آغوشِ رحمت میں سدا سوتا رہے!"

سکندر علی وجدؔ

اقبال کا پیامِ حیات

(ایک پُر مغز تقریر)

(رضی الدین صدیقی)

اقبال کی بے وقت موت ہمارے لئے وہ سانحۂ عظیم ہے جس کا احساس ہم کو روز بروز زیادہ ہوتا جائے گا۔ ابھی یہہ اچانک صدمہ اس قدر تازہ ہے کہ ہمارے اعضا شل اور دماغ معطل ہے۔

موت کا ڈر نہ خود اقبال کو تھا نہ نہیں ہوسکتا ہے اور یوں بھی انھوں نے کوئی ساٹھ برس اس چمن میں نے نوازی کی لیکن یہہ کوئی ایسی عمر نہیں جس کو اس زمانے میں طویل کہا جاسکے جب کہ اسّی اور نوّے برس تک جینا معمولی بات ہے پھر ہماری سب سے بڑی بد قسمتی یہہ ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی عدیم المثال قوت بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھی۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ وفات سے چند لمحہ قبل جب ان کو اپنے آخری وقت کا یقین ہوگیا تو انھوں نے برجستہ یہہ رباعی کہی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید

سر آمد روزگارِ این فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید

ہمیں کیسے یقین آئے کہ وہ دماغ جس نے ابھی ابھی یہہ اشعار کہے ہوں دوبارہ ہمیں کوئی لاہوتی پیغام نہیں سنائے گا ؟

ان کی خواہش تھی کہ زندگی کے آخری لمحے ملک حجاز میں بسر ہوں اور وہ درگاہِ نبوی کے زیرِ سایہ دفن کئے جائیں۔ زمانے نے ان کی یہہ آرزو بھی پوری نہ کی شاید حکمتِ الٰہی اسی میں ہے کہ ان کی ہڈیاں بھی زیرِ زمیں ہمیں پیغامِ بیداری دیتی رہیں۔

ہمارے سینے اس ناقابل تلافی نقصان کے احساس سے معمور ہیں لیکن ہمیں ایک "بیوہ کی طرح شور و شیون" نہیں کرنا چاہئے جس سے ان کی روح کو تکلیف ہو۔ یہہ تو ہم اپنے عزیز احباب کے لئے کیا کرتے ہیں کہ دو گھڑی رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں۔ ضرورت ہے کہ جس چراغ کو اقبال نے جلایا اور اپنی گرم نوائیوں سے روشن کیا وہ کبھی بجھنے نہ پائے۔ جس پودے کی انھوں نے اپنے آنسوؤں سے آبیاری کی اور اپنے خونِ جگر سے سینچا وہ کبھی سوکھنے نہ پائے اگر جیتے جی ہم نے ان کی کما حقہ قدر نہ کی تو اب ان کے انتقال کے بعد ہم متفقہ اور انفرادی طرزِ عمل سے ثابت کردیں کہ جس پیام کو انھوں نے ودیعت کیا تھا ہم اس کے ناقابل نہیں ہیں۔ ان کے کلام کی وسعت اس کی متقاضی ہے کہ محققین کی ایک جماعت اس کی تفسیر و اشاعت میں منہمک رہے پھر بھی یہہ کام ہماری زندگی میں ختم ہونے والا نہیں۔ اس کا بارِ گراں زیادہ تر آئندہ نسلوں پر پڑے گا۔

ضرورت ہے کہ ان کی یادگاریں قائم کی جائیں۔ جابجا ایسی مجلسیں اٹھ کھڑی ہوں جن کا مقصد ان کے سوانح حیات کو قلمبند کرنا ہو اور ان کے کلام کی ملک اور بیرون ملک میں اشاعت کرنا۔ یہہ چیزیں ہمارے لئے مشعلِ راہ کا کام دیں گی۔ اقبال کو اس کی ہرگز ضرورت نہیں کہ ہماری کمزور کوششیں ان کی بقا و دوام میں مدد کریں۔ انھوں نے اپنی ابدی زندگی کا سامان آپ ہی پیدا کر لیا ہے ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم ان کے بتلائے ہوے رستے پر چلیں اور یہہ رستہ کوئی نیا نہیں بلکہ وہی ہے جو ابتدا سے خدائے برتر اپنے بندوں کو بتاتا چلا آتا ہے۔ ان کے ہر مصرع اور شعر سے اس خدائی رستہ کا پتہ چلتا ہے سالہا سال تک ہمارا لائحۂ عمل یہی ہونا چاہئے کہ ان کے ارشادات کو پڑھیں سمجھیں سمجھائیں اور اپنی زندگی کا سامان مہیا کریں

اپنے آخری شعر میں تو اقبال نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ معلوم نہیں کوئی دوسرا حکیم دانا ان کی جگہ لے گا یا نہیں لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پھر ایسا انسان صدیوں تک نہیں پیدا ہو سکتا!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید برون

میں صرف اسی پر اکتفا کروں گا کہ ان کی زندگی کے چند رجحانات اور ان کے مقصدِ عظیم کو خود ان کے کلام کی روشنی میں واضح کروں۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی زندگی ہمارے لئے ایک مکمل خضرِ راہ ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کی ہر منزل اور اپنے دل و دماغ کے ہر تاثر کو اپنے اشعار میں بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:-

در غزل اقبال احوال خودی را باز گفت
زانکہ ایں نو کافر از آئین دیر آگاہ نیست

زندگی کا مقصد

کسی انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہم سوال اس کے مقصدِ حیات کے متعلق ہے۔ ابتدا ہی سے اقبال نے اپنی زندگی کا یہ مقصد قرار دے رکھا تھا کہ سوئے ہوؤں کو جگائیں بھولے بھٹکوں کو رستہ بتائیں اور بنی نوع انسان کو اس زمانے کی تباہی سے نجات دلائیں۔ وہ خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ اس کام کو انجام دے سکیں:-

تیرہ خاکم را سراپا نور کن
در تجلی ہائے خود مستور کن
تا بروز آرم شبِ افکارِ شرق
بر فروزم سینۂ احرارِ شرق

از نوائے پختہ سازم خام را
گردشِ دیگر دہم ایام را

اے کہ ز من فزودۂ گرمیِ آہ و نالہ را
زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را
عرب از سرشک خونم ہمہ لالہ زار بادا
عجم رمیدہ بو را نفسم بہار بادا

چو بجانِ من درآئی دگر آرزو نہ بینی
مگر ایں کہ شبنم تو یمِ بے کنار بادا
بضمیرم آں چناں کن کہ ز شعلۂ نوائے
دل خاکیاں فروزم دل نوریاں گدازم

ان کا واحد مقصد اور ان کی تنہا آرزو یہی ہے کہ گرے ہوؤں کو اٹھائیں اور کبوتروں کو شانِ عقابی سے مانوس کریں۔

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم
بجز ایں دعا کہ بخشی بہ کبوتراں عقابی

وہ چاہتے تھے کہ دامنِ ہستی سے پرانے داغ دھو ڈالیں اور اس خاک سے ایک نیا آسمان تعمیر کریں:-

شوید از دامانِ ہستی داغہائے کہنہ را
سخت کوشی ہائے ایں آلودہ دامانے نگر
خاکِ ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

مقصد کی تکمیل کا طریقہ

اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کر دیا اور اپنی ہر تقریر و تحریر میں اسی کا راگ الاپا۔ انھوں نے جو کچھ کہا اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہم ان سے پہلے کی حالت پر نظر کرتے ہیں۔ اس حالت کو وہ زبورِ عجم میں یوں بیان کرتے ہیں:-

ز جانِ خاور آں سوزِ کہن رفت
دمش وا ماند و جان از تن برون رفت
چو تصویرے کہ بے تارِ نفس زیست
نمی داند کہ ذوقِ زندگی چیست

دلش از مدعا بیگانہ گردید
نے او از نوا بیگانہ گردید
ز عہدِ شیخ تا ایں روزگارے
نزد مردے بجانِ ما شرارے

کفن در بر بخاکے آرمیدیم
ولے یک فتنۂ محشر ندیدیم

انھیں اس کا افسوس ہے کہ ہمارے دل میں نہ وہ پرانا اضطراب ہے نہ خلشِ آرزو۔ ہم نہ تو ذوقِ زندگی رکھتے ہیں نہ سینہ میں آواز پھر ان کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ کے بعد سے کسی بندۂ خدا نے ہمارے خس و خاشاک میں چنگاری نہیں لگائی۔ وہ ٹھان لیتے ہیں کہ صدیوں کی اس کمی کو پورا کریں۔ پھر ہم آپ اور ساری دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے ارادہ میں کہاں تک کامیاب ہوئے۔

عجمیت سے بے زاری اور شاعری کا نصب العین

اس بے پایاں جمود کو توڑنے کے لئے اقبالؔ نے اپنی شاعری کو آلۂ کار بنایا۔ اس سلسلہ میں ہم کو اقبال کے نظریۂ آرٹ پر بحث کرنی پڑتی ہے۔ شاعری ہو یا موسیقی، نقاشی ہو یا صورت گری ان سب فنونِ لطیفہ میں اقبالؔ اس نظریہ کے جو "فن برائے فن" "Art for Art's sake" کی تلقین کرتا ہے سخت مخالف تھے۔ اس تصور سے جس کو وہ عجمیت کہتے ہیں انھیں سخت بیزاری تھی قدم قدم پر وہ اس سے پرہیز کی تلقین کرتے ہیں۔ شاعری کو وہ جزوِ پیغمبری سمجھتے ہیں جس سے مردہ قوموں میں جان ڈالنے کا کام لیا جاتا ہے اس ضمن میں مختلف مقامات سے ہم ان کے اشعار نقل کرتے ہیں جس سے ان کا تصور بخوبی واضح ہو جائے گا:-

میں شعر کے اسرار سے محرم نہیں لیکن　　یہ نکتہ ہے تاریخِ امم جس کی ہے تفصیل　　وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے　　یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلاویز　　اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز　　افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں　　بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

وہ ضرب اگر کوہ شکن بھی ہو تو کیا ہے　　جس سے متزلزل نہ ہوئی دولتِ پرویز

ان کے نزدیک وہ شاعری جس میں کوئی پیغام نہ ہو ایک درخت ہے جو پھل اور پتوں سے محروم ہے:-

شنیدہ ام سخن شاعر و فقیر و حکیم　　اگرچہ نخلِ بلند است برگ و بر ندہد　　تجلّئے کہ برو پیرِ دیر می نازد　　ہزار شب دہد و تاب یک سحر ندہد

وہ ایسی غزل چاہتے ہیں جو فطرت کو بدل ڈالے نہ کہ اس کی ہم آہنگی کرے:-

غزل آں گو کہ فطرت ساز خود را پردہ گرداند　　چہ آید زاں غزل خوانے کہ با فطرت ہم آہنگ است

ان عجمی شاعروں سے جو ایک مصنوعی معشوق کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں وہ اپنا فرق یوں بیان کرتے ہیں:-

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم　　مثالِ شاعراں افسانہ بستم　　نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست　　کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

بکوئے دلبراں کارے نہ دارم　　دلِ زارے غمِ یارے نہ دارم　　بجبریلِ امیں ہم داستانم　　رقیب و قاصد و درباں ندانم

دمے در خویشتن خلوت گزیدم　　جہانے لازوالے آفریدم　　مرا زیں شاعری خود عار ناید　　کہ در صد قرن یک عطار ناید

ان کی ہر آواز ایک نفسِ آتشیں ہے جو ان کے سینے سے نکلتی ہے:-

تا مرا رمزِ حیات آموختند　　آتشے در پیکرم افروختند　　یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام　　عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

حق رموزِ ملک و دیں برمن کشود　　نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود　　برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است　　مصرعِ من قطرۂ خونِ من است

تا نہ پنداری سخن دیوانگی ست　　در کمالِ ایں جنوں فرزانگی ست

وہ صرف ایک طلسم رنگ و بو پیدا نہیں کرتے بلکہ رگِ گل کی حقیقت سے مطلع کرنا چاہتے ہیں:-

بیانِ معنی ز سیرِ بوستانم اگر جانت شہیدِ جستجو نیست نیابم آنچہ ہست اندر رگِ گل بہارِ من طلسمِ رنگ و بو نیست

ان رنگین بیان فن کار شاعروں سے وہ یوں مخاطب ہوتے ہیں :-

زمن با شاعرِ رنگیں بیاں گوئے چہ سود از سوز اگر چوں لالہ سوزی نہ خود را می گدازی ز آتشِ خویش نہ شامِ دردمندے بر فروزی

وہ تال اور سُر نہیں جانتے لیکن زندگی کی آواز پہچانتے ہیں :-

مرا از پردۂ ساز آگہی نیست ولے دانم نوائے زندگی چیست سرودم آنچناں در شاخساراں گل از مرغِ چمن پرسد کہ ایں کیست؟

انھیں یقین ہے کہ عجمی شاعری و فن کاری موت سکھاتی ہے اس سے جہاں تک ہو سکے گریز کرنا چاہئے خصوصاً اس زمانے میں جب کہ ہم میں پہلے ہی مردنی چھائی ہوئی ہے :-

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے یہہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

غلاموں اور آزاد مردوں کے فنونِ لطیفہ کا فرق بھی سن لیجئے :-

مرگ ہا اندر فنونِ بندگی من چہ گویم از فنونِ بندگی نغمۂ او خالی از نارِ حیات ہمچو سیل افتد بدیوارِ حیات

از نئے او آشکارا رازِ او مرگِ یک شہر است اندر سازِ او ناتوان و زار می سازد ترا از جہاں بیزار می سازد ترا

نغمہ باید تند رو مانندِ سیل تا برد از دل غماں را خیل خیل نغمہ می باید جنوں پروردۂ آتشے در خونِ دل حل کردۂ

آج کل کی مصوری کو دیکھتے ہیں جس میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہ :-

راہبے در حلقۂ دامِ ہوس دلبرے با طائرے اندر قفس مطربے از نغمۂ بیگانہ مست بلبلے نالیدہ و تارِ او گسست

نوجوانے از نگاہے خوردہ تیر کودکے بر گردنِ بابائے پیر

تو بے زار ہو کر وہ کہہ اٹھتے ہیں :-

می چکد از خامہ ہا مضمونِ موت ہر کجا افسانۂ و افسونِ موت بے نفس را لذتِ تحقیق نیست بے نفس را قوتِ تخلیق نیست

شیخِ ما از برہمن کافر تر است زانکہ او را سومنات اندر سر است رختِ ہستی از عرب برچیدۂ در خمستانِ عجم خوابیدۂ

شل ز برفابِ عجم اعضائے او سرد تر از اشکِ او صہبائے او

شاعر کی حقیقت ان کے نزدیک یہہ ہے :-

سینۂ شاعر تجلی زارِ حسن خیزد از سینائے او انوارِ حسن از نگاہش خوب گردد خوب تر فطرت از افسونِ او محبوب تر

از دمش بلبل نوا آموختست غازہ اش رخسارِ گل افروختست سوزِ او اندر دلِ پروانہ ہا عشق را رنگیں ازو افسانہ ہا

بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش　　صد جہانِ تازہ مضمر در دلش
اہلِ عالم را صلا بر خواں کند　　آتشِ خود را چو باد ارزاں کند

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی شاعری بحیثیت فن مکمل نہیں ہے، ان کو وہ یہہ جواب دیتے ہیں:۔

نغمہ ام از زخمہ بے پروا ستم　　من نوائے شاعرِ فرداستم
عصرِ من دانندۂ اسرار نیست　　یوسفِ من بہرِ ایں بازار نیست
نغمۂ من از جہانِ دیگر است　　ایں جرس را کاروانِ دیگر است
اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد　　چشمِ خود بر بست و چشمِ ما کشاد
رفت باز از نیستی بیروں کشید　　چوں گل از خاکِ مزارِ خود دمید

جب ہندوستان کے تنگ حلقہ سے نکل کر دنیائے مشرق کو وہ اپنا پیام پہنچانا چاہتے ہیں تو اُردو کی بجائے فارسی کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بناتے ہیں:۔

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　بت پرستی بت گری مقصود نیست
حسنِ اندازِ بیاں از من مجو　　خوانسار و اصفہاں از من مجو
گرچہ ہندی در عذوبت شکر است　　طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت　　خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام　　در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

ان کا یہہ پیغامِ عمل و بیداری کیا ہے؟

اٹھ کہ پیدا ہوئی ظلمت افقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
پھونک ڈالا تھا کبھی خرمنِ باطل جس نے　　حدتِ دم سے اسی شعلہ کو پیدا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں
اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر　　قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
شکلِ بو قید ہے غنچے میں پریشاں ہو جا　　رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
شوقِ وسعت ہے تو ذرے سے بیاباں ہو جا　　قلزمِ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

اسی پیغام کو انھوں نے اپنی اس مشہور نظم میں دہرایا ہے جو اب مقبولِ عام ہو چکی ہے:۔

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز　　کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن از بانگِ اذاں خیز　　از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں خوابِ گراں خیز　　از خوابِ گراں خیز

ان کے نزدیک ہستی اور عمل دونوں ایک ہی چیز کے نام ہیں چنانچہ جرمن شاعر Henrich Heine کے سوال کا جواب وہ یوں دیتے ہیں:۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم　　ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت　　ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

جہانِ عمل کی تصویر وہ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا　　قسمتِ بادہ باندازۂ جام است ایں جا
نشہ از حال بگیرند و گزشتند ز قال　　نکتۂ فلسفہ دُردِ تہِ جام است ایں جا
ما دریں رہ نفس و مہر برانداختہ ایم　　آفتابِ سحرِ او لبِ بام است ایں جا
اے کہ تو پاسِ غلط کردۂ خود می داری　　آنچہ پیشِ تو سکون است خرام است ایں جا
ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم　　علم را جاں بدمیدیم و عمل ساختہ ایم

پھر کہتے ہیں:۔

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات　　لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو　　شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو

وحدتِ کامل اس پیغام کے ساتھ اقبال نے جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ ایک مکمل وحدت ہے جس کو وہ اپنی خالص حالت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس وحدت کا رنگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے:۔

شوق مری لے میں ہے شوق مری نے میں ہے نغمۂ "اللہ ہو" میرے رگ و پے میں ہے

جب تک مسلم قوم اس نعرۂ توحید کو بلند کرتی ہے وہ کبھی دنیا سے نہیں مٹ سکتی:۔

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل
مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ

توحید کے اس سبق کو تازہ کر کے وہ ہمارے دل و دماغ کے بت خانوں کو توڑنا چاہتے ہیں:۔

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے
تا نہ رمزِ لا الٰہ آید بدست بندِ غیر اللہ را نتواں شکست

ان لوگوں کو جو موجودہ زمانے کی دہریت میں پھنس گئے ہوں وہ یہ پیغام دیتے ہیں:۔

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا ساز و برگِ امتاں نفیِ بے اثبات مرگِ امتاں
در محبت پختہ کے گردد خلیل تا نگردد لا سوئے الا دلیل

ہمارے ان موروثی مرشدوں کو جو اپنے خوش اعتقاد مریدوں کے حلقہ میں بیٹھے ہوئے اپنے آباد اجداد کی کرامات سنایا کرتے ہیں اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے:۔

اے کہ اندر حجرہ ہا سازی سخن نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن

وحدتِ الٰہی کے ساتھ وہ وحدتِ ملت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں:۔

ملتِ بیضا تن و جاں لا الٰہ سازِ ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما
ملت از یک رنگیٔ دلہاستے روشن از یک جلوہ ایں سیناستے
قوم را اندیشہ ہا باید یکے در ضمیرش مدعا باید یکے

نسلِ انسانی کو وہ اسی ایک اصول کے تحت ملا جلا دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ وطن یا رنگ اور نسل پر قومیت کی بنیاد کبھی پائدار نہیں ہو سکتی

با وطن وابستہ تقدیرِ امم بر نسب بنیادِ تعمیرِ امم
اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ
بر نسب نازاں شدن نادانی است حکمِ او اندر تن و تن فانی است
ملتِ ما را اساسِ دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما یک نما یک بین یک اندیشیم ما
مدعائے ما مآلِ ما یکیست طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

تعلیمِ خودی دوسری چیز جس پر اقبال نے اپنی تعلیم میں متواتر زور دیا ہے وہ خودی ہے اس کا سبق خود انھوں نے حدیث شریف "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" سے لیا۔

غلامِ ہمتِ آں خود پرستم کہ با نورِ خودی بیند خدا را

ان کے پاس ہماری پستی اور ذلت کا بڑا سبب یہی ہے کہ ہم اپنے آپ کو بھول بیٹھے ہیں اور اپنی پوشیدہ قوتوں سے ناواقف ہیں اس پر وہ اس شد و مد کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کہ منکرِ خودی کو وہ منکرِ خدا سے بڑھ کر کافر سمجھتے ہیں:۔

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

اس احساس خودی کو وہ اس قدر اہم سمجھتے ہیں کہ اپنے کلام میں اس کو متعدد مرتبہ نظم کرنے کے علاوہ انھوں نے ایک پوری مثنوی اسرارِ خودی کی بنیاد ہی اس پر رکھی اور بتلایا کہ نظامِ عالم کی بنیاد ہی خودی پر ہے اور تسلسلِ حیات اسی پر منحصر ہے :-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
چوں حیاتِ عالم از زورِ خودی است ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست می کشاید قلزمے از جوئے زیست

ان کے نزدیک دنیا کی ساری مصیبتیں خودی کی موت کے باعث ہیں :-

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام

ان مایوس بندوں کو جو اپنی اندرونی طاقت کو کھو کر مستقبل سے مایوس ہو چکے ہیں اس سے بہتر کیا سبق سکھلایا جا سکتا ہے۔ ذیل کی نظم کا ہر لفظ لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔ اس کا پیغام دنیا کے سارے انسانوں کے لئے ہے۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

عشق و عقل اقبال کا ایمانِ کامل ہے کہ انسان کی دو حیثیتیں ہیں جن کو وہ عشق اور عقل سے تعبیر کرتے ہیں لیکن جن کو ہم دل اور دماغ کے افعال سے واضح کر سکتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی مساوی اہمیت نہیں عشق کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ عقل دل کے تابع رہ کر اپنا فعل انجام دے۔ ان کے نزدیک انسانوں کی اور خصوصاً اہلِ مغرب کی سب سے زیادہ گمراہی یہی ہے کہ وہ دل کو بالکل بھول بیٹھے ہیں اور صرف عقل و خرد میں ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ "پیامِ مشرق" کا مرکزی موضوع یہی ہے :-

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
دانشِ رندانہ دل بکف انداختۂ آہ ازاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختۂ
حکمت و فلسفہ کارے است کہ پایانش نیست سیلیِ عشق و محبت بدبستانش نیست
دشت و کہسار نوردید و غزالے نگرفت طوفِ گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست

ہماری بیماریوں کا علاج اسی میں ہے کہ عقل کی اس فسوں گری سے واقف ہوں اور اس کو عشق کا پرستار بنا دیں :-

چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم
اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

مقصد سفر ہے نہ کہ منزل اقبال کا سفر منت کش منزل نہیں ہے وہ صرف اس لئے اڑنا چاہتے ہیں کہ لذتِ پرواز حاصل کریں :-

لذتِ سیر است مقصودِ سفر گر نگہ بر آشیاں داری مپر
زندگی جز لذتِ پرواز نیست آشیاں با فطرتِ او ساز نیست

وہ بحرِ بے پایاں میں تیرتے ہیں تو موتی کی خواہش ہے نہ کنارے پر پہنچنے کی :-

من اے دریائے بے پایاں بموجِ تو در افتادم نہ گوہر آرزو دارم نہ می جویم کرانے را

منزل ان کے پاس صرف یک سنگِ راہ ہے :-

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

راستہ جس قدر زیادہ کٹھن ہو اسی قدر ان کو مرغوب ہے :-

مرا صاحبدلے ایں نکتہ آموخت ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

وہ کھوئی ہوئی منزل کا دکھڑا نہیں روتے بلکہ اپنی زندگی اسی میں سمجھتے ہیں کہ چلتے رہیں

چو موجِ سازِ وجودم ز سیل بے پرواست گماں مبر کہ دریں بحر ساحلے جویم

بہتر سے بہتر کی تلاش اس دنیا میں وہ کسی مقصود کو حاصل کرکے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ بہتر سے بہتر کی تلاش انھیں سرگرداں لئے پھرتی ہے :-

تپش است زندگانی تپش است جاودانی ہمہ ذرہ ہائے عالم دلِ بے قرار بادا
نہ بجادۂ قرارش نہ بمنزلے مقامش دلِ من مسافرِ من کہ خداش یار بادا

بہشت میں ایک حور جب ان سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور آشنائی کے طریقوں سے ناواقف ہیں۔ ان کی ہر سانس ایک سازِ جستجو ہے اور ہر غزل ایک سوزِ آرزو تو وہ کیا جواب دیتے ہیں ؟

چہ کنم کہ فطرتِ من بمقام در نسازد دلِ ناصبور دارم چو صبا بلالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوب روئے تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایتِ آں کہ نہایتے ندارد بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ امیدوارے
دلِ عاشقاں بمیرد بہ بہشتِ جاودانے نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

وہ زندگی جس میں کشمکش نہ ہو بے لطف ہے اس زندگی کو جس میں کشمکش نہ ہو وہ بے لطف سمجھتے ہیں اور خود اپنی زندگی میں اس کا ثبوت دیتے ہیں ان کی شخصیت کا اعتبار کرتے اور جو شہرت انھوں نے حاصل کی تھی اس کے زیرِ اثر ان کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ عیش و آرام کی زندگی بسر کریں۔ وہ چاہتے تو قلمدانِ وزارت اور اس کے علاوہ سب کچھ ان کے قدموں پر ہوتا لیکن ان کے لئے ساحل پر سے تماشا دیکھنے میں کوئی لذت نہیں تھی وہ تو سمندر کی موجوں سے لڑنا چاہتے تھے :-

میاسا بزم بر ساحل کہ آنجا نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

بے درد زندگی کو وہ موت سمجھتے ہیں :-

کسے کو دردِ پنہانے ندارد تنے دارد و لیکن جانے ندارد
اگر جانے ہوس داری طلب کن تب و تابے کہ پایانے ندارد

دوامِ ما ز سوزِ ناتمام است چو ماہی جز تپش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل تپیدیک دم و مرگِ دوام است

ان کا قول ہے کہ اگر حیات چاہتے ہو تو خطرہ میں جیو۔ یہ شراب جس قدر زیادہ کڑوی ہے اتنی ہی اچھی ہوتی ہے :-

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست گفتا مئے کہ تلخ تر او نکوتر است
گفتم کہ شوق سیر نہ گردد بمنزلے گفتا کہ منزلش بہمیں ذوق مضمر است

وہ تیر و سناں اور خنجر و شمشیر کا مقابلہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں :-

تیر و سناں و خنجر و شمشیرم آرزوست با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزوست

یہاں تک کہ اگر کعبہ کا راستہ بے خطر ہو تو وہ کعبہ کا سفر بھی نہیں کرنا چاہتے۔

به کیشِ زنده دلاں زندگی جفا طلبی است
سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است

آزادی، غلامی اور سرمایہ داری سے جنگ۔ سوشیلزم

غلامی کو چاہے وہ کسی شکل میں ہو نوعِ انسان کے لئے سب سے بڑی لعنت سمجھتے ہیں اور ہر انسان کو آزاد دیکھنے کے متمنی ہیں

نوعِ انساں کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے یہ
شاہ راہِ فطرت مقصد میں ہی غارت گری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

آزاد اور محکوم کی حالتوں کا فرق ضربِ کلیم میں وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:-

اقبال یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات
آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

غلام انسانوں کو وہ کتوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں:-

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

جب وہ دیکھتے ہیں کہ:-

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

تو ان حاکموں کو وہ تنبیہ کرتے ہیں کہ:-

تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

سرمایہ داری کے خلاف بھی انھوں نے مسلسل جنگ کی ہے اور مزدوروں کو ان کے حقوق سے خبردار کیا ہے:-

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے
ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

لینن Lenin کی زبان سے وہ حضورِ باری میں کہتے ہیں کہ:-

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

آرزوئے انقلاب اسی لئے انقلاب کی آرزو ہمیشہ ان کے سینے میں موجزن ہے، وہ اس دنیا کو بدل دینا چاہتے ہیں تاکہ اس خاکستر سے ایک نیا آدم پیدا کر سکیں:-

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

وہ دنیا کی حالت دیکھتے ہیں اور انقلاب انقلاب پکار اٹھتے ہیں :—

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اے مسلماں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

وہ اپنی آواز کو خدا تک پہنچاتے ہیں کہ اس نے یہہ کیا "حیرت خانہ امروز و فردا" بنا رکھا ہے جس میں وہی "لعبت خاک" ہے جس کو بے عمل ڈالنا ہی تقدیر ہے

یا مسلماں را مدہ فرماں کہ جاں برکف بنہ
یا دریں فرسودہ پیکر تازہ جانے آفریں
یا چناں کن یا چنیں

یا دگر آدم کہ از ابلیس باشد کمترک
یا دگر ابلیس بہرِ امتحانِ عقل و دیں
یا چناں کن یا چنیں

یا جہانے تازۂ یا امتحانے تازۂ
می کنی تا چند با ما آنچہ کردی پیش ازیں
یا چناں کن یا چنیں

یا مکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب
یا دگرگوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں
یا چناں کن یا چنیں

فرنگی تمدن و تصورِ حیات کے خلاف جہاد ایک تہائی صدی سے وہ فرنگی مادیت اور میکانی تصورِ حیات کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ بار بار وہ اس موضوع پر لوٹ آتے ہیں اور مختلف پہلوؤں سے اس کی برائیوں کو واضح کرتے ہیں :—

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہہ ظلمات
یہہ علم یہہ حکمت یہہ تدبر یہہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیمِ مساوات
بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

عصرِ حاضر کی حالت دیکھ کر حکیم یورپ سے وہ یہہ پوچھتے ہیں :—

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار و زن تہی آغوش ؟

کبھی وہ ہم کو آگاہ کرتے ہیں کہ :—

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لئے اس کا ثمر موت

کبھی فرنگیت کے خلاف فریاد کر اٹھتے ہیں :-

فریاد ز افرنگ و دلاویزی افرنگ فریاد ز شیرینی و پرویزی افرنگ عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

کبھی ہم سے کہتے ہیں کہ :-

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

تو کبھی خود اہل یورپ کو ہوشیار کرتے ہیں کہ :-

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

میخانۂ فرنگ کی حالت وہ اپنے مشاہدات کی بنا پر یوں بیان کرتے ہیں :-

یاد ایامے کہ بودم در خمستان فرنگ جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل عقل ناپروا متاع عشق را غارتگر است

در ہوایش گرمی یک آہ بے تابانہ نیست رند ایں مے خانہ را یک لغزش مستانہ نیست

اپنی آخری مثنوی اقوام شرق میں وہ اس حقیقت کو اور زیادہ واضح کرتے ہیں :-

پس چہ باید کرد اے اقوام شرق باز روشن می شود ایام شرق یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد زیر گردوں رسم لادینی نہاد

مشکلات حضرت انساں از وست آدمیت را غم پنہاں از وست در نگاہش آدمی آب و گل است کاروان زندگی بے منزل است

مشرق میں سب کچھ ہے مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں

ان کے خیال میں ہمارے پاس شرق میں سب کچھ ہے ، ہم کو مغرب کی تقلید کی ضرورت نہیں ۔ وہ ہم کو ہماری حقیقت سے آشنا اس طرح کراتے ہیں :-

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

وائے نادانی کہ تو محتاج ساقی ہو گیا مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

ترکوں کو جب یورپ کی تقلید میں منہمک دیکھتے ہیں تو ان کو یاد دلاتے ہیں :-

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

ہمارے مقلد یورپ صورت گروں سے وہ اس طرح مخاطب ہوتے ہیں :-

کس درجہ یہاں عام ہوئی مرگ تخیل ہندی بھی فرنگی کا مقلد عجمی بھی مجھ کو تو یہی غم ہے کہ اس دور کے بہزاد کھو بیٹھے ہیں مشرق کا سرور ازلی بھی

معلوم ہیں اے مرد ہنر تیرے کمالات صنعت تجھے آتی ہے پرانی بھی نئی بھی فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

جب ہم کو مغرب کے پیچھے آنکھ بند کر کے جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو پوچھتے ہیں

اے ترا حق خاتم اقوام کرد بر تو ہر آغاز را انجام کرد اے نظر بر حسن ترسا زادۂ اے ز راہ کعبہ دور افتادۂ

اے فلک مشت غبار کوئے تو اے تماشا گاہ عالم روئے تو ہمچو موج آتش تہ پا می روی تو کجا بہر تماشا می روی ؟

ان کا پیغام مغرب کا رہینِ منت نہیں ہے

اگرچہ انھوں نے مغرب اور اس کے فلسفہ اور معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا لیکن نہ تو اپنی طرزِ زندگی میں اور نہ اپنے پیغام میں وہ مغرب کے رہینِ منت ہیں۔ ان کا تخیل ٹھیٹ مشرقی بلکہ اسلامی ہے ان کی طبعِ بلند فطرت اور شاعری اپنی آپ نظیر ہے:—

کرم تیرا کہ بے جوہر نہیں میں　　غلامِ طغرل و سنجر نہیں میں
جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن　　کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

میانِ آب و گل خلوت گزیدم　　ز افلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم　　جہاں را جز بچشمِ خود ندیدم

تواں بے منتِ بیگانگاں سوخت　　نہ پنداری کہ من پروانہ کیشم
خود افروزم چراغِ راہِ خویشم

ان کا نغمہ ان ہی کے آب و گل کا سرمایہ ہے:—

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گل تست　　اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

انھیں معلوم تھا کہ یورپ کی حکمت اس راہِ عشق میں جس پر وہ گامزن تھے ان کی رہنما نہیں ہو سکتی اور چراغ کی مدد سے آفتاب کو نہیں ڈھونڈا جا سکتا۔ اس لئے وہ نورِ نظر حاصل کرنے کے لئے یورپ کی بجائے اہلِ دل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ ان پر مولانائے روم کا رنگ سب سے زیادہ غالب ہے:—

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن　　اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

پیغام قبول کرنے کی التجا

اپنا پیغام جب انھوں نے ہمارے سامنے پیش کر دیا تو وہ ہم سے التجا کرتے ہیں کہ اِس کو قبول کریں:—

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم　　فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

خدا سے دعا کرتے ہیں:—

جوانوں کو مری آہِ سحر دے　　پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

جوانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:—

تو جوانِ خام سوزے سخنم تمام سوزے　　غزلے کہ می سرایم بتو سازگار بادا

جہاں ہا دیدہ از مشتِ گلِ من　　بیا سرمایہ گیر از حاصلِ من
غلط کردی رہِ سر منزلِ دوست　　دمے گم شو بصحرائے دلِ من

بشوخی ہائے جوانانِ ماہ سیما چیست　　درآ بحلقۂ پیرے کہ دلبری داند
بیا بمجلسِ اقبال و یک دو ساغر کش　　اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

چو ما چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما　　اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام　　تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت　　ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما
می رسد مردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند　　دیدہ ام از روزنِ دیوارِ زندانِ شما

اُن کی راہ نُمائی ہماری کوششوں کو مرکز پر لانے کے لئے انھوں نے ہماری پوری رہنمائی کی ہے۔ صرف ضرورت ہے کہ ہم ان کے پیام کو سمجھیں:-

دو عالم را تواں دیدن بمینائے کہ من دارم　　کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکیِ شبہا کہ می آید　　کہ چوں انجم درخشاں داغِ سیمائے کہ من دارم

اگر ز میکدۂ من پیالۂ گیری　　ز مشتِ خاک جہانے بپا توانی کرد
چناں بسینہ چراغے فروختی اقبال　　بخویش آنچہ توانی بسا توانی کرد

مقصد کی تکمیل
مشرق کی بیداری

شکر کا مقام ہے کہ اقبال نے اپنی زندگی ہی میں مشرق کو بیدار ہوتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے مقصد کی تکمیل کو زیادہ قریب محسوس کرنے لگے:-

ترا گناہ ہے اقبال مجلس آرائی　　اگرچہ تو ہے مثالِ زمانہ کم پیوند
جو کوکنار کے خوگر تھے ان غریبوں کو　　تری نوا نے دیا ذوقِ جذبہ ہائے بلند
تڑپ رہے ہیں فضا ہائے نیلگوں کے لئے　　وہ پرشکستہ کہ صحنِ سرا میں تھے خورسند

ان کی آوازِ جرس نے ہم کو راستہ بتلا دیا جس پر چل کر ہم منزلِ مقصود کے قریب ہو رہے ہیں:-

عجم از نغمہ ام آتش بجاں است　　صدائے من درائے کارواں است
گل او شعلہ زار از نالۂ من　　چو برق اندر نہادِ او فتادم

آئندہ کی امید

اس سے ان کو مستقبل درخشاں نظر آتا ہے اور وہ ہم کو مژدہ سناتے ہیں:-

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار　　نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک　　بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز　　اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں　　محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

وہ نظر کھول کر دیکھتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ زندگی ایک نئی دنیا کی تعمیر کر رہی ہے:-

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم　　چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز　　شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم
انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک　　بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم
خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند　　جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند
زندگی جوئے رواں است و رواں خواہد بود　　ایں مئے کہنہ جواں است و جواں خواہد بود
آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت　　آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود
آں زبینے کہ بر وگریۂ خونیں زدہ ام　　اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود
مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند　　شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ان کو احساس تھا کہ ابھی اُن کا کام ختم نہیں ہوا بہت کچھ کرنا باقی ہے:-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں　　ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں　　یہاں سیکڑوں کارواں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر　　چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا　　ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا　　کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

عجم کو انھوں نے پیام پہنچا دیا تھا لیکن اس کی حسرت تھی کہ عرب کو بھی پہنچا سکیں:-

نوائے من بہ عجم آتشِ کہن افروخت　　عرب ز نغمۂ شوقم ہنوز بے خبر است

16498

ان کا پیغام ساری دنیا کے لئے ہے

بعض لوگوں کو یہہ شکایت ہے کہ اقبال نے اپنا پیغام مسلمانوں تک محدود رکھا اور وہ مسلمانوں کو فرقہ بندی کی تعلیم دیتے تھے۔ یہہ غلطی صرف ان کو ہو سکتی ہے جنھوں نے سطحی نظر سے اقبال کے کلام کو دیکھا ہے۔ خود اقبال نے اس کا جواب پروفیسر نکلسن کے نام مکتوبہ خط میں دیا ہے جس کو پروفیسر موصوف نے اپنے ترجمۂ اسرارِ خودی کے ساتھ طبع کیا ہے۔ اس کی حقیقت ان بے شمار بیانوں سے واضح ہو سکتی ہے جو اقبال کی زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو، سر تیج بہادر سپرو وغیرہ نے دئے ہیں۔ لیکن ہم کو ان خارجی شہادتوں کی ضرورت نہیں۔ ہم خود ان کے کلام سے اس کا ثبوت دے سکتے ہیں:۔

سر سید کی لوحِ تربت سے ان کو آواز آتی ہے:۔

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں　　چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے سامان پیدا ہوں تری تقریر سے　　دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تحریر سے
دیکھ اپنوں میں کہیں پیدا نہ ہو بیگانگی　　چل نہ جائے تیرے گلشن میں ہوا بیکار کی

فرقہ واری خیالات پیدا کرنے والوں کے خلاف وہ بارگاہِ رسالت میں نالاں ہوتے ہیں:۔

لاکھ اقوام کو دنیا میں اجاڑا اس نے　　یہہ تعصب کو گھر گھر کا دیا کہتے ہیں
خانہ جنگی کو سمجھتے ہیں بنائے ایماں　　مرض الموت ہے جو اس کو دوا کہتے ہیں
بغض للّٰہ کے پردے میں عداوت ذاتی　　دین کی آڑ میں کیا کرتے ہیں کیا کہتے ہیں

وہ اسلام کی حقیقت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا میں بھائی چارہ ہو جائے

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی　　اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وہ کسی خاص حصۂ زمین سے تعلق نہیں رکھنا چاہتے:۔

درویشِ خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق　　نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے فرزند جاوید کو وہ نصیحت کرتے ہیں کہ:۔

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست　　کافر و مومن ہمہ خلقِ خداست
آدمیت احترامِ آدمی　　با خبر شو از مقامِ آدمی
آدمی از ربط و ضبطِ تن بہ تن　　بر طریقِ دوستی گامے بزن
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق　　می شود بر کافر و مومن شفیق
گرچہ دل زندانیِ آب و گِل است　　ایں ہمہ آفاق آفاقِ دل است

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

ان کو گھر اور منزل کی ضرورت نہیں تھی ہر ملک کو وہ اپنا ملک سمجھتے ہیں کیونکہ وہ خدا کا ملک ہے:۔

ہوائے خانہ و منزل نہ دارم　　سرِ راہم غریبِ ہر دیارم

دنیا کا ہر واقعہ ان کے دل پر اثر کرتا ہے۔ حکیم آئن سٹائن نظریہ اضافیت کا انکشاف کرتا ہے تو وہ اس کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں۔ بلشویکِ روس کے انقلاب کرنے والوں کو وہ نصیحت کرتے ہیں کہ لا مذہب کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکی۔ اٹلی جب ابی سینیا پر زبردستی قبضہ کر لیتا ہے تو پیرِ کلیسا کو اس دل خراش حقیقت کی خبر دیتے ہیں جمعیتِ اقوام جب کفن چوروں کی ایک انجمن بن کر رہ جاتی ہے

تو وہ ایک نئی جمعیت آدم کی بنیاد ڈالنا چاہتے ہیں:۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام　پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم
تفریق ملل حکمت افرنگ کا مقصود　اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　جمعیت اقوام کہ جمعیت آدم؟

ہندوستان کی آزادی اور اتحاد۔ ہندوستان کی آزادی کی اس جدوجہد میں ان کی ابتدائی نظمیں ہمالہ، ہندوستان ہمارا، نیا شوالہ، ہمارا دلیس، میرا وطن اور صدائے درد کا جو حصہ ہے وہ سب جانتے ہیں لیکن کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اپنی آخری مثنوی اقوام شرق میں بھی وہ ہمارے باہمی اختلاف پر آنسو بہاتے ہیں اور غلامی کی لعنت کو آزادی سے بدلنے کی تلقین کرتے ہیں:۔

اے ہمالہ اے　اے رود گنگ　زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب　نوجواناں از محبت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیر غیر　خشت ما سرمایۂ تعمیر غیر
زندگانی بر مراد دیگراں　جاوداں مرگ است نے خواب گراں
ہندیاں با یک دگر آویختند　فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند
تا فرنگی قومے از مغرب زمیں　ثالث آمد در نزاع کفر و دیں
کس نداند جلوۂ آب از سراب　انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

یہ کام انھوں نے نام و نمود کے لئے نہیں کیا۔ بے نیازی اور استغنا اس کام سے ان کا مقصد نہ کسب زر تھا نہ نام و نمود انھیں نہ تو لیڈری کی خواہش تھی نہ بلند مراتب کی آرزو۔ ان کا سر کسی آستان شاہی پر کبھی خم نہیں ہوا ان کو مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن خوشامد کی بجائے انھوں نے ان حاکموں کو یہی نصیحت کی کہ:۔

سروری در دین ما خدمت گری است　عدل فاروقی و فقر حیدری است

ان کی بے نیازی اور استغنا کا یہ حال تھا کہ انھیں ٹوٹ جانا پسند تھا لیکن کسی سے مومیائی نہیں مانگ سکتے تھے۔ ان کی خودداری وہ تھی کہ ہمیں دریا میں وہ پیمانہ الٹ دیتے ہیں۔ اس طویل بیماری میں بھی نہ تو افراد سے اور نہ انجمنوں سے روپے پیسے کا کوئی تحفہ قبول کیا۔ گذشتہ یوم اقبال کے سلسلے میں جب ان کو ایک چک بھیجا گیا تو انھوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ شاید آپ لوگوں نے مجھے نہیں سمجھا۔

عالی ہمتی اسی کے ساتھ ان کی بلند ہمتی یہ تھی کہ وہ زمین سے نہیں آسمان سے اپنی خوراک تلاش کرنا چاہتے ہیں:۔

قبائے زندگانی چاک تا کے　چو موراں آشیاں در خاک تا کے
بہ پرواز آ و شاہینی بیاموز　تلاش دانہ در خاشاک تا کے

وہ ان لوگوں کی ہمت کے غلام ہیں جو ستاروں کو اپنی گرہ میں باندھتے ہیں وہ جبریل کا نہیں یزداں کا شکار کرنا چاہتے ہیں:۔

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے　یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ان کے سینے میں اس قدر طاقت ہے کہ وہ خدا کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر خدائی کی محنت سے تھک گیا ہے تو ان کے سینے میں آرام لے:۔

در سینۂ من دمے بیاسائے　از محنت و کلفت خدائی

تن من دھن جان و مال سے محبت رکھنے والوں کو تن من دھن کی حقیقت اس سے بہتر کون سمجھا سکتا ہے وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ اقبال صرف مشکل گو تھے اس کو غور سے سنیں۔ یہہ ان کے آخری وقت کا کلام ہے :۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی　　تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن　　من کی دنیا من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق　　تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں　　تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن　　من کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج　　من کی دنیا میں نہ دیکھے میں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہہ بات　　تو جھکا جب غیر کے آگے تو من تیرا نہ تن

دعائے مغفرت ہم نے اقبال کے کلام پر ایک سرسری نظر ڈال کر دیکھا ہے کہ وہ کس شخصیت کے حامل تھے اور ان کا پیام کس فرشتہ کی صدا ہے جوں جوں دن گذرتے جائیں گے ہمیں معلوم ہوتا جائے گا کہ انھوں نے اس دنیا میں کیا انقلاب کیا۔

پس از من شعرِ من خوانند و دریابند و می گویند　　جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ حق آگاہے

فی الحال ہمارے لئے یہی فرض رہ جاتا ہے کہ خود ان کی زبان سے ان کے لئے دعا کریں :۔

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر　　خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر　　مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا　　نور سے معمور یہہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے　　سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

رضی الدین صدیقی

امت کا شب چراغ

جس رہ نوردِ شوق کو منزل سے عار تھا
جس موجِ بے قرار کو ساحل سے عار تھا

کس کی نظر نے اس کو نظر بند کر دیا
اس برقِ جاں نواز کو پابند کر دیا

شعلہ زمیں کا عرش کی گودی میں سو گیا
امت کا شب چراغ اُجالے میں کھو گیا

مخدوم محی الدین

اقبالؒ

دلوں کی وادیوں میں پھول برساتا ہوا آیا
حجازی "لے" میں نغمہ ہند کا گاتا ہوا آیا

کہا لبیک اس کے شعر پر کلیوں نے ہنس ہنس کے
نسیمِ صبح کی مانند اٹھلاتا ہوا آیا

بہارِ لالہ و گل اس کی فطرت کا تھا آئینہ
وہ بوئے گل سے ہر وادی کو مہکاتا ہوا آیا

وہ شاعر جس کے نطقِ شعر کا احساں ہے اُردو پر
ادب کی زلفِ ژولیدہ کو سلجھاتا ہوا آیا

جو باتیں رہ گئی تھیں فکرِ عطاؔ روشناسائی سے
اُن ہی باتوں کی وہ تکمیل فرماتا ہوا آیا

شرابِ ساقیٔ رومیؔ سے بدستِ خودی ہو کر
فضائے ہند پر اک کیف برساتا ہوا آیا

نظر آزاد، دل بے باک، فکر و ذہن بے پایاں
خودی کا پرچم رنگین لہراتا ہوا آیا

ہوا نازل زمینِ ہند پر "بانگِ درا" بن کر
وہ آیا اور ہر سوتے کو چونکاتا ہوا آیا

قلندر کی زباں میں اس نے دی تعلیم آزادی
مجاہد کی طرح تلوار چمکاتا ہوا آیا

کہا اس نے کہ ہے عجزِ غلامی موت انساں کی
وہ سینوں میں خودی کی آگ بھڑکاتا ہوا آیا

کہا اس نے امیری بے فقیری ہو نہیں سکتی
وہ جبر و ظلم کی طاقت کو ٹھکراتا ہوا آیا

کلیمی ضرب کی تاثیر تھی اس کے تکلم میں
وہ ہر فرعون کی قوت سے ٹکراتا ہوا آیا

کہا اس نے مسلماں موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
فسانہ حضرتِ ٹیپوؒ کا دہراتا ہوا آیا

"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"
وہ ان اسرار کو شعروں میں سمجھاتا ہوا آیا

وہ شاعر، مردِ خود آگاہ، تہذیبِ فرنگی کو
حجازی تیغ کا آئینہ دکھلاتا ہوا آیا

وہ دل جو برف کے ٹکڑوں سے بھی بڑھ کر فسردہ تھے
وہ ان کو بادۂ الفت سے گرماتا ہوا آیا

جبیں میں اس کی رخشاں تھا جلالِ شانِ فاروقیؓ
غلامی کی فضا میں گرچہ شرماتا ہوا آیا

دیا پیغام اسلامی اخوت کا زمانے میں
جہاں میں زندگی کی روح دوڑاتا ہوا آیا

وہ آتش جس کے سینے میں ہے گرمی سوزِ طارق کی
اسی سے دل کے خاکستر کو گرماتا ہوا آیا

دیا تھا جو پیامِ زندگی نطقِ محمدؐ نے
اسی پیغام کو اقبالؔ دہراتا ہوا آیا

ماہر القادری

نذر اقبال

(جہاں بانو نسیم)

کچھ نذر کو لائے ہیں مرے دیدۂ تر بھی

قابل انشا پردازوں نے اقبال کی بے وقت موت پر اخباری دنیا کے لئے کافی مسالہ فراہم کر دیا ہے۔ کالم کے کالم اس کے ماتم میں سیاہ ہو چکے ہیں۔ آج گھر گھر اس کا تذکرہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس سانحہ کے افسوس کا اظہار۔ کتنے دل ایسے ہیں جن میں اس کا دکھ پنہاں ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جس کے اتنے رونے والے ہیں۔ یہ غریبوں کا مجازی بھگوان کس قدر جلد اپنے خدائے حقیقی سے جا ملا۔

۲۱ اپریل تاریخ عالم کا وہ حسرتناک دن ہے جس نے مشرق کے ادبی افق سے رنگینی چھین لی۔ فضائے شاعری سے کشش مفقود ہو گئی جس نے ان گنت اور بے حساب دلوں کو اپنا بنا لیا تھا۔ تسخیر قلوب جس کی شاعری کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کی موت نے سب کی آنکھیں کھول دیں۔ خبر مرگ نے ایک بیکس کی آہ کی طرح جگر کو چھلنی کر دیا۔ شاعری کی دیوی اندھی ہو گئی۔ حقیقت افسانہ بن گئی۔ واقعی اس مقولہ میں کتنی قوت ہے، کتنا جادو ہے:—

"ایک ہونہار ادیب یا شاعر کی موت دنیائے ادب کی موت ہے!!"

وہ شوریدہ سری، وہ طوفان و ہیجان، وہ تلاطم خیزیاں، وہ جوش و خروش جو اقبال کے قلم اور دماغ کا نتیجہ تھیں— قائم تو رہیں گی —— جب تک دنیا قائم ہے۔ لیکن ان کا تسلسل ختم ہو گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم۔ عرفان و فلسفہ پر اداسی چھا گئی۔ اب مردہ قوموں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا شاید کوئی نہیں رہا۔ اقبال کی شاعری قومی شاعری تھی۔ اس کا دائرہ عمل اپنے ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے لئے زندہ تھا شاید یہ ٹھیک ہی ہے ؎

جیتا ہے وہ جو مر چکا انسان کے لئے
مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے

اقبال کی موت ایک فلسفہ ہے جس کو سوچنے اور اس پر سر دھننے سے دماغ گم ہو جاتا ہے۔ اقبال کو موت سے وابستہ کرنے میں دل پس و پیش کرتا ہے۔ یقین کی حس ساکت و صامت ہو جاتی ہے۔ شاید زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ انسان آئے اور چلے جائے۔ ابدی زندگی کس کام کی —— سوا سو برس جینے کی لوگ دعا دیتے ہیں —— اُف کتنی بد دعا دیتے ہیں —— خیال کرنے سے دہشت ہوتی ہے اور فوراً زبان سے "خدا نہ کرے" نکل جاتا ہے۔ ۶۰ - ۷۰ برس ہی کتنے بہت ہیں۔ خضرؑ کیا کر رہے ہیں نہیں معلوم زندہ رہ کر اتنے زمانے سے —— "ابدی زندگی" انھیں نصیب ہے!!

تخیل —— زندگی کے متعلق ایک خیالی دنیا —— جس میں علو ہمتی ہو اولوالعزمی ہو، ہمت و حوصلہ، وجدان و کیف ہو۔ اسی کا نام شاید تخیل ہے۔ اور اقبال ان محسوسات شاعری کا ناخدا تھا۔ بجھی ہوئی خاموش طبیعت کو اکسانے والی قوتیں اس کے قلم میں چھپی ہوئی تھیں جس کو ایسے ایسے جادو جگانے یاد تھے کہ بس دنیا جانتی ہے۔

اس کا "شکوہ" ایک بچے کا اظہار ہے —— وہ زبان جو شکوہ پر تلی تو اللہ کو بھی اس نے نہ چھوڑا اور پھر خدا کی شان اللہ ہی کی

زبان لے لی۔ اور اسی شکوہ کا وہ دنداں شکن جواب دیا کہ جیسے خدا خود بول رہا ہے۔ شکوہ میں اس نے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔ خوب ہی جی بھر کر اللہ کو بیناہ بخدا "ہرجائی" ٹھہرایا —— اس پردۂ ناز کو بھی ناز ہو گیا۔ اس کے نالۂ بیباک نے آسمانوں کو چیر دیا افلاک کے جگر چاک ہو گئے

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی　بولے سیارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی　چاند کہتا تھا نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی　کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی

کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا　مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

اللہ کی زبان میں کتنی مٹھاس بھر دی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو　بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

"جوابِ شکوہ" میں انسانی زندگی کے لئے عمل کا سبق ملتا ہے۔ وہ جو کہہ دیا ہے نا کسی نے "کوشش کرنے سے خدا ملتا ہے" اقبال اس مقولے [کی] رگ رگ پر حاوی ہے۔ وہ قوتوں کو حرکت میں لانے کے لئے بے چین ہے۔ اور نیند میں رکھنے والوں کو بے چین و مضطرب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس [کو] جمود و سکوت ناپسند ہیں۔ اس کے الفاظ میں بجلیاں بھری ہوتی ہیں۔ اس کے اشعار کے بے پایاں دریا سے ان موتیوں کا اقتباس ستاروں [کے] گننے کے مشغلے سے کم نہیں۔

اقبال کی شاعری نے ایک عالم گیر ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔ بلاشبہ اقبال پر بعض اوقات غالب کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ اس نوع سے زندہ غالب تھے۔ آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ صرف اقبال ہی نہیں بلکہ غالب بھی دنیا سے چل بسے۔

اقبال کی شاعری جھوٹے ڈھکوسلوں اور نفسانی ناچاریوں سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اقبال میر کی طرح سرہانے آہستہ بولنے کی استدعا نہیں کرتا۔ روتے روتے ابھی آنکھ لگنے کا اس کو گلہ نہیں بلکہ اس کے یہاں کی دھوم دھام یوں ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

فرانس کا سب سے بڑا مفکر و ادیب روسو کہتا ہے :۔

"ہر ادبی کارنامہ انسان کا ذہنی شاہکار ہے"!

خیال تو کیجئے اقبال نے ایسے کتنے شہ کار چھوڑے ہیں جن کا ٹھکانا نہیں —— جو بجائے خود ایک گلدستۂ ادب ہے۔ "بانگ درا" میں اقبال ایک ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہے۔ اور "بال جبریل" میں ایک پانے والے کی طرح مطمئن۔ "بانگ درا" زیادہ تر رنگ ہے اور "بال جبریل" تمام [تر] یہ وہ الفاظ ہیں جو وجد نے اقبال کے لئے لکھے ہیں۔ اور شاید اس سے بہتر تشریح نہیں ہو سکتی —— احساس خودی اور سخت کوشی یہ اقبال [کے] پیام کے دو اہم اجزا ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کر رہا تھا —— کہ زندگی ختم ہو گئی فلسفہ منہ ہی تکتا رہ گیا۔ اقبال ایک سچے آدمی کی طرح اپنے طرز کلام میں صاف اور بے باک ہے۔ جوش و خروش ہی تو اس کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں۔ اور انھیں کا یہاں پلہ بھاری [ہے]۔ اقبال کا نظریہ تھا کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت ؎

ناصبوری ہے زندگی دل کی　آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کسی کا خیال ہے کہ زندگی ایک معمہ ہے "سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" لیکن جن کے بازوؤں میں قوت ہے اور جوش ہمت ان کے نزدیک ایک معمولی کھیل۔

اقبال عشق کو دنیا کی سب سے بڑی قوت اور حیاتِ انسانی کی سب سے اہم ضرورت خیال کرتا ہے ؎

جہانِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر   نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

اسی کی بدولت منصور "انا الحق" کے نعرے لگاتا ہوا اللہ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ اسی کے طفیل موسیٰ کلیم اللہ بن جاتے ہیں۔ پریم کا رس ہر بول میں مٹھاس پیدا کرتا ہے ؎

تھا ارنی گو کلیم میں ارنی گو نہیں   اس کو تقاضا روا مجھ پہ تقاضا حرام

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے   بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے   جہاں بینی مری فطرت ہے لیکن   کسی جمشید کا ساغر نہیں میں

رونے دھونے بسورنے گڑگڑانے کی جگہ اقبال کے یہاں ہمت افزا خیالات ہیں، حوصلہ افزا تخیلات ہیں۔ ایک نیا شعور ایک نئی ذہنیت سے اس کی شاعری معمور ہے۔ سچی کاوش اور تلاش جمالیات کا مذاقِ سلیم اس کے قلم کی روح رواں ہے۔ اقبال کی غزلیں اردو شاعری میں انقلاب کا اثر رکھتی ہیں۔ اس کے یہاں وہی حسن و عشق، ساقی و صہبا، رونے دھونے ہوئے خیالات مہمل الفاظ کا گورکھ دھندا مفقود ہے۔ اس کا ذہن ہمیشہ مستقبل کو سمجھنے کی کوشش میں محو رہتا تھا۔ بالِ جبریل ایک کہن سال بزرگ کی فریاد ہے اس میں شاعری کا زورِ بیان ہے۔ خیالات کے دھندلے نقوش شوخ ہو گئے ہیں۔ پہلے جو باتیں رمز و کنایہ میں کہی تھیں وہ اس میں صاف صاف اور برملا بے دھڑک کہہ دی ہیں۔ بانگِ درا میں مناظرِ قدرت کا ڈھیر ہے۔ [illegible] "ماہِ نو" پر قیامت کے الفاظ ہیں :-

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل   ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل

طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب   نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب   چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی   نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی

یہ تشبیہ و استعارے کی سرگرمیاں ہیں۔ "تصویرِ درد" کے لفظ لفظ سے درد و الم ٹپکتا ہے یہ خود ایک درد و غم کی تصویر ہے۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں   کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل   چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھلا نبھے گی تری ہم سے کیونکر اے واعظ   کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں   میں ان کی محفلِ عشرت سے کانپ جاتا ہوں   جو گھر کو پھونک کے دنیا میں نام کرتے ہیں

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے   لے کے اب تو وعدۂ دیدار عام آیا تو کیا   آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ   صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

کچھ بالِ جبریل سے تغزل کی تمثیلیں :-

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں   اگر کھو گیا اک نشیمن تو غم کیا   مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق   شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

یہ اشعار حقائق پر کس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ دماغ کو سوچنے اور غور کرنے کا ایک پرکیف مشغلہ مل جاتا ہے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی   تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق   تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں   تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

غرض بعض کوتاہ بینوں کا یہ نظریہ ہے کہ اقبال کے یہاں تغزل نہیں۔ ایسی ذہنیتیں شاید موسیقی کے فن اور سُر سے ناواقف ہیں ـــ بہرکیف ؎

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا

جہاں بانو بیگم

اقبال سے

مدت سے تمنا تھی کہ لاہور کو جاؤں
رُو رُو کے کروں عرض کہ اے رہبرِ ملت!
تعلیم تری اور ہے، یاں رنگِ جہاں اور
یہہ جراتِ دل جرم نہیں تھا ور مشرق'!
زنجیرِ توہم میں مقید ہے تمدن
فطرت کے خزانوں سے عطا کی گئی مجھ کو
رونے کا یہاں نام ہے کمزوریٔ فطرت
سب کہتے ہیں اندازِ جنوں ہیں یہہ نرالے
یاں سجدۂ بیتاب سے ہوتا ہے گماں اور
تڑپاتے ہیں کہسار و بیاباں کے نظارے
بن دیکھے کسی چیز کا قائل نہیں کوئی
فریاد ہے اے داغِ جگر پالنے والے
یہہ آب و ہوا وجہہ پریشانیٔ دل ہے
میں منتظرِ ساعتِ اظہارِ تمنا
آئی یہ خبر! اٹھ گیا مسلم کا سہارا
اک برقِ اجل سوز گری خرمنِ دل پر
تاریکیٔ شب چھا گئی رخصت ہوا خورشید
یہہ درد نہ ہوگا کبھی منت کشِ درماں
فطرت یہہ سدا جس کی پرستار رہی ہے
جذباتِ تجسس رہے ناکام سراسر
اُس تک نہ گئی جب یہہ صدائے دلِ محزوں

(ایسے سوالات جو منت کشِ جواب نہ ہوے)
قدموں پہ سرِ اقبال کے میں سر کو جھکاؤں
کہنے کی اجازت ہو تو کچھ اپنی سناؤں
فطرت کو ہلاکت سے میں کس طرح بچاؤں
ذرہ کو بھی حسرت ہے کہ خورشید کو پاؤں
اور روح کی خواہش ہے کہ شورش سی مچاؤں
یہہ قوتِ پرواز کے اڑنے بھی نہ پاؤں
فرما کہ تڑپ دل کی میں کس طرح چھپاؤں
تو کہہ کہ کھلیں پھول میں آنسو نہ بہاؤں
کیا حسنِ شفق دیکھ کے میں سر نہ جھکاؤں
ساکت ہو قمر ادھر میں دریا پہ نہ جاؤں
دودِ تپشِ داغِ جگر کس کو دکھاؤں
کیونکر غمِ ہستی سے میں ہستی کو بچاؤں
فرما کہ تباہی سے یہہ دل کیسے بچاؤں
اور پیرِ فلک تاک میں یہہ راز نہ پاؤں
اور امتِ مرحوم کا اقبال سہارا
اے کوہِ الم ٹوٹ کہ رونے بھی نہ پاؤں
سایہ بھی گیا قوم کے سر سے گئی چھاؤں
وہ دولتِ نایاب کہاں ڈھونڈنے جاؤں
قسمت میں یہہ تھا شرفِ تکلم بھی نہ پاؤں
قدرت کا یہہ مقصد تھا کہ تسکین نہ پاؤں
اللہ نہ کرے میں کبھی لاہور کو جاؤں

بشیر النساء بیگم بشیر

اقبال اور اس کی شاعری

بزم اہلا سعید جوہری گلی

دنیائے ادب میں اقبال کی شخصیت ممتاز ہی نہیں عدیم النظیر بھی ہے اور اس کی شاعری بہ لحاظ ادبیت وخیالات اردو وفارسی کا وہ نایاب خزانہ ہے جس پر مشرق صدیوں تک ناز کرتا رہے گا۔

اقبال نے غالب کو جائز طور پر یوں سراہا ہے۔ ؎

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر　　محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر　　خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں　　ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں　　آہ اے نظارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اور غالباً غالب کے بعد ہی اقبال کو گیسوئے اردو کو سنوارنے کا خیال خاص طور پر پیدا ہوا۔ اور اس نے اپنے خیال کو اس کمال سے عمل کا جامہ پہنایا کہ نقل کو اصل سے بھی بڑھا دیا۔ خدا جانے ہندوستانیوں کی کونسی نیکی خدا کو بھائی اور اس طرح آڑے وقتوں میں کام آئی کہ جب غالب نے بزمِ شاعری کو الوداع کہا اور دنیائے ادب اس مہرِ درخشاں کی ضوفشانیوں سے محروم ہو کر شبِ تار بن گئی تو عین اس وقت افقِ شاعری پر ایک اور درخشاں ستارہ نمودار ہوا جس نے بڑھتے بڑھتے ماہتاب اور پھر آفتابِ عالم تاب کی صورت اختیار کی اور اپنی ضیاباریوں سے دوبارہ دنیائے شاعری کے ذرے ذرے کو جگمگا دیا۔

سر عبدالقادر اقبال کے متعلق لکھتے ہیں:-

" غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عالم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسدِ خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے۔ اور اس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

روحِ غالب نے جسدِ اقبال میں جنم لیا ہو یا نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب و اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ غالب اور اقبال دونوں نے اپنی شاعری کی ابتداء غزل سے کی۔ غالب نے اپنی غزلیات کا بہت سا حصہ حذف کر دیا اور ظنِ غالب ہے کہ اقبال کی غزلوں کی بھی ایک معتدبہ تعداد منظرِ عام پر نہ آسکی۔ شکوہِ الفاظ، فارسی بندشیں، دلکش ترکیبیں، عمقِ خیال اور پروازِ تخیل ان دونوں کا سرمایۂ امتیاز ہیں۔ اقبال کے کلام میں بھی اس جستجو کی ایک جھلک موجود ہے جس کی تپش سے کلامِ غالب سراپا سوز ہے اور جس کی توضیح اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے ؎

"دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے"

پہلے پہل اقبال کی شاعری کی ابتدا غزلوں سے ہوئی جس میں کیفِ عشق بھی تھا اور تمنائے حسن بھی۔ جن میں اول اول داغ کا رنگ نمایاں تھا جیسے۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں
جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا
جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی
نشیمن سینکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

امیدِ حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو
یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

لیکن یہ رنگ داغ کی استادی کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور اب اقبال کے کلام پر غالب کا رنگ غالب تھا جیسے (انظر سہل الممتنع)

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدۂ بے حجابی
کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

ذرا سا تو دل ہوں مگر شوخ اتنا
وہی لن ترانی سنا چاہتا ہوں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل
چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

بھری بزم میں راز کی بات کہہ دی
بڑا بے ادب ہوں سزا چاہتا ہوں

(یا)

کہوں کیا آرزوئے بے دلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے

وہ میکش ہوں فروغِ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراقِ ساقیِ نامہرباں تک ہے

چمن افروز ہے صیاد میری خوشنوائی تک
رہی بجلی کی بے تابی سو میرے آشیاں تک ہے

جرس ہوں نالہ خوابیدہ ہے میرے ہر رگِ پے میں
یہ خاموشی مری وقتِ رحیلِ کارواں تک ہے

سکونِ دل سے سامانِ کشودِ کار پیدا کر
کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

چمن زارِ محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیِ رسمِ فغاں تک ہے

اقبال کی اس تقلیدی شاعری میں بھی ان کا کمالِ فن نظر آتا ہے۔ طرزِ نگارش اور اسلوبِ بیان سے قطع نظر اقبال کی شاعری نئے خیالات اور رجحانات کے لحاظ سے بھی کئی پلٹے کھائے ہیں۔ دنیائے رنگ و بو اور عالمِ حسن و عشق سے باہر بھی کچھ ایسے اسبابِ دلکشی موجود تھے جنھوں نے بہت جلد نوجوان شاعر کے فلک پیما تخیل کو مسخر کر لیا اور اب اقبال نے اخلاقی اور اصلاحی نظمیں لکھنی شروع کیں جن میں کبھی حالی کا رنگ جھلکتا ہے تو کبھی اکبر الہ آبادی کا۔

حالی کا رنگ

زہد و رندی

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی
تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی
منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے
تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا
اقبال کہ ہے قمریِ شمشادِ معانی
پابندیِ احکامِ شریعت میں ہے کیسا
گو شعر میں ہے رشکِ کلیمِ ہمدانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثرِ فلسفہ دانی
ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا
تفضیلِ علی ہم نے سنی اس کی زبانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
اک دن جو سرِ راہ ملے حضرتِ زاہد
پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے
یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قربِ مکانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
(یا) کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اکبر کا رنگ

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

اس قبیل کی اصلاحی نظموں کے علاوہ اقبال کی شاعری کے اس دور میں فطری اور وطنی نظمیں بھی بکثرت ہیں جن میں ہمالہ۔ گلِ رنگیں۔ جگنو۔ کنارِ راوی۔ صبح کا ستارہ۔ چاند۔ ابرِ کہسار۔ پرندہ اور جگنو۔ بچہ اور شمع۔ نیا شوالہ۔ آفتابِ صبح خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک حصہ موضوعی نظموں کا بھی ہے جو مغربی شعرا سے ماخوذ ہیں۔ لیکن یہ ترجمہ بھی اتنا مکمل اور

پاکیزہ ہے اور مغربی خیالات مشرقی انداز میں اس حسن سے سموئے گئے ہیں کہ درحقیقت آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان نظموں میں بھی اکثر نظمیں جیسے ایک پہاڑ اور گلہری۔ ہمدردی۔ بچے کی دعا۔ پرندے کی فریاد وغیرہ صرف مشہور ہی نہیں بلکہ زبان زد خاص و عام ہو چکی ہیں۔

اقبال کی شاعری قصیدہ، اور ہجو دونوں سے پاک ہے۔ اقبال نے کبھی صاحبانِ زر و اربابِ اثر کی مدح سرائی نہیں کی نہ کبھی ہجوگوئی کر اپنے کلکِ اعجاز رقم کے وقار کو گھٹایا۔ ہاں اس کی شاعری کا پہلا دور بارگاہ خداوندی کی ایک برگزیدہ ہستی حضرت نظام الدینؒ کی عقیدت مندانہ منقبت پر ختم ہوتا ہے جو نہ صرف جذباتِ عقیدت اور تاثراتِ مودت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس میں اقبال کا کردار ان اشعار میں بے نقاب ہوتا ہے ؎

نظر ہے ابرِ کرم پر درختِ صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاجِ باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفتِ مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزلِ مقصود کارواں مجھ کو

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیرِ آسماں مجھ کو

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور پیامِ محبت سناتا ہے۔ قیامِ یورپ میں اقبال نے فارسی پر بہت توجہ صرف کی تھی اور شاعری کے لئے فارسی کے میدان کو بہ نسبت اردو کے کہیں زیادہ وسیع پایا۔ اس کے علاوہ ہزارہا اپنی بنائی دلکش ترکیبیں اور صدہا خوبصورت جملے ایسے ملے جو اردو میں عنقا تھے۔ اور چونکہ اسے اپنی قوتِ فارسی گوئی کے امتحان کا موقع بھی نہیں ملا تھا وہ اب ہمہ تن فارسی گوئی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں علمی سند کے حصول کے لئے اس نے فلسفۂ ایران کا گہرا مطالعہ کیا اور یقیناً اسی ضمن میں وہ فلسفۂ تصوف سے بھی روشناس ہو چکا تھا یہی سبب ہے کہ اس دور کے کلام میں تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور شاعر متصوفین کی طرح ذرہ ذرہ میں حسنِ حقیقی کا جلوہ ڈھونڈتا نظر آتا ہے اور دنیا کو رازِ محبت اور حقیقتِ جستجو سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔ ؎

(۱)

انسان کو راز جو بنایا
راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے
آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

(۲)

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بیتاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ! موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتمِ دہر میں یارب وہ نگیں ہے کہ نہیں

کبھی شاعر جستجوئے حقیقت میں مطمئن بھی نظر آتا ہے ؎

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے

تارے ہیں وہ، قمر ہیں وہ، جلوہ گہِ سحر ہیں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

فلسفۂ مغرب و علومِ جدیدہ میں متلاشیٔ حقیقت شاعر کو تسکینِ قلب حاصل نہیں ہوتی اور وہ اپنی بے اعتقادی کو اسی دور سے ظاہر کرنا شروع کرتا ہے جو آج تک اس کے کلام میں جاری و ساری ہے۔ ؎

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم کہن بدل گئی
اب نہ خدا کے واسطے ان کو مئے مجاز دے

مارچ ۱۹۰۷ء کی اس غزل میں اقبال کے خیالات قابل غور ہیں۔ یہ چند اشعار اس کے مطمح نظر کے انقلاب کو ظاہر کرتے ہیں۔ ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

(۳) اقبال کی قومی شاعری کا آغاز اسی دور سے ہوتا ہے۔ چنانچہ قومی نظموں میں اقبال کی اکثر نظمیں بلحاظ سوز و گداز، درد و اثر اور جذبۂ قومی اتنی بلند و بالا اور عظیم المرتبت ہیں کہ الہامی معلوم ہوتی ہیں۔ شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ، طلوع اسلام، اقبال کی معرکۃ الآرا نظمیں ہیں جو درحقیقت اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ ان کے علاوہ مسلم، وطنیت، ترانۂ ملی وغیرہ بھی ایسی نظمیں ہیں جو بجا طور پر اقبال کے قلم کا اعجاز ہیں۔ اقبال کی ہر قومی نظم جذبۂ قومی میں ڈوبی ہوئی اور اثرات قلبی سے مملو نظر آتی ہے۔

(۴) اسی دور شاعری یا قیام مغرب کے زمانے میں اقبال نے یورپ کے اکثر علما، حکما، اور شعرا کے خیال، پیام، اور فلسفہ کا بغور مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ کے بعد اس کی طبیعت پر بہت اچھے اثرات مترتب ہوئے اور خود اس کی شاعری میں ایک خاص پیام اور فلسفہ نظر آنے لگا۔

اقبال کی شاعری اب ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے جو تقریباً سنہ ۱۹۰۷ء سے لے کر آج تک کم و بیش اس کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ اقبال کا یہ جدید رنگ اس کو ایک خاص امتیاز بخشتا ہے جس کے بغیر اس کے حقیقی جوہر نہ کھل سکتے اور اس کے شدید جذبات کی حقیقی نمایندگی اور اس کے تاثرات کی سچی ترجمانی نہ ہو سکتی تھی۔ قومی شاعری میں وہ سب سے پہلے اس تڑپ کو ظاہر کرتا ہے جو ملت بیضا کے لیے اس کے دل میں ہے۔ اور اس کا مقصد ملت کے مضمحل قویٰ اور نیم مردہ عروق میں ایک تازہ زندگی کی رو اور قومی اخلاق اور ادبیات میں نشاۃ جدید کا پیدا کرنا ہے۔ مگر وہ اس حیات جدید کو مغربی رنگ کی کورانہ تقلید سے بھی بچانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشاہیر اسلام و اسلاف کا بار بار ذکر کرتا ہے اور ان کے محاسن و کردار کی مثالیں دے دے کر مسلمانوں کی سوئی ہوئی طاقتوں کو جگاتا ہے۔ اقبال کی اس دور کی شاعری کا ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس کا شاعرانہ وجدان حسن و عشق کے آئین مضمون آفرینی اور اظہار بیان کے رسمی قیود سے آزاد ہے۔ لہٰذا شاعر کے وہ دلدادگان خال و خط کے اس زمرہ میں محدود نہیں ہے جو سویدا میں سیر عدم دیکھتے ہیں۔ وہ ایک فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت سے عالم و ما فی العالم کو ایک خاص زاویۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کا شاعرانہ وجدان اور طرز بیان اسی لئے ایک خاص ندرت رکھتا ہے۔

اقبال کے شاعرانہ وجدان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی پرجوش اور طوفان خیز موجوں میں تبلیغ خیال اور پیام اور جس کی گہرائیوں میں زندگی کے ارتقا اور تعلیم روحانی کے بیش بہا گوہر ہیں۔ اس کا حساس دل زمانے کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس جمود و سکون کا متحمل نہیں ہوتا جو اس کے قریبی ماحول اور اس کے ملک و قوم میں موجود ہے اس لئے وہ اس کو دور کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے۔ کبھی تو وہ اسلاف کے کارنامے یاد دلاتا ہے جس کے بارے میں خود کہتا ہے۔ ؎

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

اور کبھی طرح طرح سے غیرت دلا کر حمیت قومی کو اکسا کر ان کی قوت جد و جہد کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا ہے ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی　　لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل　　نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کی گنبد پر　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

فطرت کو خرد کے روبرو کر　　تسخیر مقام رنگ و بو کر　　تو اپنی خودی کو کھو چکا ہے　　کھوئی ہوئی شے کی جستجو کر
تاروں کی فضا ہے بیکرانہ　　تو بھی یہ مقام آرزو کر　　بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت　　جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

غرض اس جمود قومی کو مٹانے اور اس سکون کے خلاف رد عمل کرنے کے لئے اس کے جذبات کا دریا امنڈ آتا ہے باوجود قوم کی بے حسی کے اقبال کو ان کے مستقبل سے یاس نہیں نہ وہ ہمت پست کرنے والی قنوطیت ہے جو اکبر الہ آبادی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں ؎ خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ　　مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس

برخلاف اس کے اقبال کا انداز تخاطب امید افزا اور ہمت آفریں ہے ؎

تو اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں　　وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں　　غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے　　قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

کتنا بلند پیام ہے اور کیسا دلکش اور جوشیلا انداز بیان۔ کیا سوتوں کو جگانے کا اس سے بڑھ کر کوئی اور دلنشیں پیرایہ بھی ہو سکتا ہے؟ اقبال کے جذبات مثل ایک ابلتے ہوئے چشمے کے ہیں جس کے سوتے خاک دان حیات سے ابلا چاہتے ہیں ؎

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

ہمت کی یہی بلند حوصلگی اور طبیعت کا یہی غیر معمولی جوش ہے جو اقبال کے طرز بیان میں ایک ایسا انوکھا پن اور کلام میں وہ جذبات کی فراوانی اور زور اور آمد کا ایسا سیلاب موجزن کر دیتا ہے جو اردو اور فارسی کے کسی اور شاعر میں نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے انوکھے رنگ کا آپ مالک ہے اور اپنی نرالی شان کا آپ خالق۔ یہ حسن بیان یہ پیام جد و جہد یہ جوش عمل اور یہ فلسفۂ زندگی، یہ زور کلام، یہ گرجتی للکار اور یہ شکوۂ زبان اعجاز یا الہام نہیں تو کیا ہے؟

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی　　کھلتے ہیں غلاموں پر اسرار شہنشاہی
آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی　　اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی
دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ　　ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللہی

اقبال نے اپنی قومی شاعری سے زبان و ادب کی بھی قابل قدر خدمت کی ہے۔ بعض سخن داں اس کی زبان کی بعض معمولی لغزشوں پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے وہ اپنے جذبات کے تلاطم اور اپنے تاثرات کے طوفان میں کچھ اس طرح کھو جاتا ہے کہ کبھی کبھی ان سطحی جکڑبندیوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ابتدائی رنگ میں جب استادان فن کے آگے زانوئے ادب طے کیا تھا اس کے کلام میں وہ پختگی، روانی اور فصاحت نہ ہو جو ان باکمالوں کا حصہ تھا مثلاً اقبال کے ایسے اشعار ؎

تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی

مگر دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنی نرالی اور جدت آفریں طرز، دلکش تشبیہوں اور دل پذیر ترکیبوں اور دیگر جیتی زبان سے جو خدمت اردو زبان کی کی ہے وہ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ اس نے گیسوئے اردو کے سنوارنے میں درحقیقت ایک خاص حصہ لیا ہے اس کی پرواز خیال کی طرح اس کی خصوصیات زبان بھی قابل تعریف ہیں۔

مشتی از خرواری

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام
لئے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے یہ سورج کے پھول ہیں گویا (کنار راوی)

نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی
ہے غبار دیدۂ بینا حجاب آگہی
محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایان حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفان حسن
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ
شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
ظلمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں
طفلک نا آشنا کی کوشش گفتار میں (شمع و پروانہ)

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقاب روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھری ہوئی گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفل قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لب گفتار پر
ساحر شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
منظر حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشین خفتگان کنج تنہائی ہوں میں (خفتگان خاک سے استفسار)

مجھ کو قدرت نے سکھایا ہے دُر افشاں ہونا
ناقۂ شاہد رحمت کا حدی خواں ہونا
غم زدائے دل افسردۂ دہقاں ہونا
رونق بزم جوانان گلستاں ہونا
بن کے گیسو رخ ہستی پہ بکھر جاتا ہوں
شانۂ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہوں (ابر کہسار)

ہو رہی ہے زیر دامان افق سے آشکار
صبح یعنی دختر دوشیزۂ لیل و نہار
پا چکا فرصت درود فصل انجم سے سپہر
کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
مطلع خورشید میں مضمر ہے یوں مضمون صبح
جیسے خلوت گاہ مینا میں شراب خوشگوار
ہے تہ دامان باد اختلاط انگیز صبح
شورش ناقوس آواز اذاں سے ہم کنار (نمود صبح)

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی (ماہ نو)

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں
بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
کیا ذرہ کو جگنو دے کے تاب مستعار اس نے
کوئی دیکھے تو شوخی آفتاب جلوہ فرما کی

تغیر آگیا ایسا تدبر میں، تخیل میں
ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوسناکی

فروغِ شمعِ نو سے بزمِ مسلم جگمگا اٹھی
مگر کہتی ہے پروانوں سے میری کہنہ ادراکی

تو اے پروانہ! ایں گرمی ز شمعِ محفلی داری
چو من در آتشِ خود سوز اگر سوزِ دلی داری

(تہذیبِ حاضر)

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ تجھ میں خلیل کا
میں ہلاکِ جادوئے سامری، تو قتیلِ شیوۂ آزری!

میں نوائے سوختہ در گلو، تو پریدہ رنگ، رمیدہ بو
میں حکایتِ غمِ آرزو، تو حدیثِ ماتمِ دلبری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

کوئی ایسی طرزِ طواف تو مجھے اے چراغِ حرم بتا
کہ ترے پتنگ کو پھر عطا ہو وہی سرشتِ سمندری

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسد اللہی، وہی مرحبی، وہی عنتری

(میں اور تو)

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

حسنِ بیان اور زورِ کلام کے ایسے ایسے ہزارہا نمونے اقبال کے کلام میں پائے جاتے ہیں، جن کے مختصر انتخاب سے بھی ایک ضخیم جلد تیار ہو سکتی ہے۔ جب ہم ہندوستان کے اس سب سے بڑے موجودہ شاعر کی شخصیت پر غور کرتے ہیں تو علاوہ ایک مایۂ ناز ماہرِ فن اور ایک استادِ سخن ہونے کے اس کی شخصیت کے دو اور نمایاں پہلو نظر آتے ہیں۔ (۱) پیامِ عمل (۲) فلسفۂ حیات۔ اس لیے اقبال نہ صرف دورِ حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہی ہے بلکہ ایک پیامبر اور مفکر فلسفی بھی ہے۔ ہم اقبال کی شاعری کے متذکرہ بالا پہلوؤں پر آئندہ روشنی ڈالیں گے۔

لطیف النساء بیگم بی اے

ملک و ملت کی جان تھا اقبال
فخرِ ہندوستان تھا اقبال

قوم کا ترجمان تھا اقبال
درد کی داستان تھا اقبال

روشنیِ زمینِ شعر و سخن!
نیرِ آسمان تھا اقبال

دوست دشمن کو کر لیا مسحور
ایک جادو بیان تھا اقبال

موت نے ہم سے اس کو چھین لیا
جانِ ہندوستان تھا اقبال

دے رہا تھا وہ ہم کو درسِ بقا
حریت کا نشان تھا اقبال

بلبلیں نوحہ کر رہی ہیں شور
رونقِ گلستان تھا اقبال

شور عابدی (بلگرامی)

حیدرآباد میں یوم اقبال

مسلم کلچر سوسائٹی کی جانب سے ۹ رجنوری ۱۹۳۸ء کو شاؤن ال حیدرآباد میں نہایت تزک و احتشام سے یوم اقبال منایا گیا۔ صبح کے اجلاس کی صدارت ہزہائی نس والاشان اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار نے فرمائی۔ حیدرآباد کے اکثر علم دوست اصحاب، معززین اور طلبہ سے پورا ہال بھر گیا تھا۔ نواب فخر یار جنگ بہادر (سوسائٹی کے صدر نے) تحریک صدارت کی اور شہزادۂ برار نے کرسی صدارت قبول فرما کر اقبال کی نسبت جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ دوسرے صفحہ پر درج ہیں۔ اس کے بعد رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نے امیر جامعۂ عثمانیہ کی حیثیت سے ایک پیام سنایا دیگر اصحاب کے پیامات بھی پڑھے گئے۔ اس اجلاس میں وجد، سکش مخدوم نے اپنی نظمیں پڑھیں ڈاکٹر زور، ڈاکٹر لطیف مولوی سید ہاشمی اور مولوی سید محمد اکبر وفاقانی نے اپنے مقالے پڑھ کر سنائے۔

دوپہر کے اجلاس کی صدارت کے لئے نواب بہادر یار جنگ بہادر نے ہز اکسلنسی مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت بہادر سے استدعا کی مہاراجہ کا خطبۂ صدارت بھی آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب اور مولوی مخدوم محی الدین صاحب نے مقالے پڑھے۔ نواب بہادر یار جنگ نے "اقبال کے تصورِ مومن" پر تقریر کی۔

یوم اقبال کے سلسلے میں "بزم تمثیل حیدرآباد دکن" کی جانب سے اقبال کے کلام کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔ یہ ڈرامہ مولوی محمد اکبر وفاقانی کے حسن انتظام سے بہت ہی کامیاب رہا خصوصاً جبریل اور ابلیس کا مکالمہ اس بہتر انداز میں اسٹیج کیا گیا کہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ واقعی آسمان پر جبریل اور ابلیس ایک دوسرے سے بحث کر رہے ہیں۔

یوم اقبال، یوم دلی کے بعد حیدرآباد کا ایک نہایت ہی شاندار و کامیاب علمی و ادبی اجتماع تھا اس میں جو پیامات نظمیں اور مقالے پڑھے گئے وہ کئی روز تک مقامی جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ ماہنامہ خلیق نے بھی ان میں سے بعض کو ایک جگہ کر کے اپنا "اقبال نمبر" شائع کیا۔ سب رس کے اس "اقبال نمبر" کے آئندہ صفحات میں حیدرآباد کے اس یوم اقبال کی مستقل یادقائم رکھنے کے لئے پیامات نظموں اور مقالوں کے اقتباسات شائع کئے جا رہے ہیں۔

اس یوم اقبال کے بعد نظام کالج کی بزم ادب کی طرف سے بھی مولوی عبدالحق کی صدارت میں ایک جلسہ یوم اقبال منایا گیا اس کی تقریروں کے اقتباسات بھی اسی سلسلے میں شریک کر دئے گئے ہیں۔

خواجہ حمید الدین

ارشادِ صدارت

ہز ہائینس پرنس آف برار والاشان حضرت اعظم جاہ ولیعہد بہادر دولت آصفیہ (اقبال)

"یہ امر میری انتہائی مسرت کا باعث ہے کہ آج میں ایک تقریب میں بذات خود شریک ہوں جو آپ مشرق کے مایۂ ناز شاعر سر محمد اقبال کی ادبی اور فلسفیانہ خدمات پر حیدرآباد کی طرف سے اظہار استحسان کے لیے منعقد کر رہے ہیں۔

اقبال نے اپنے فارسی اور اردو کلام کے ذریعہ مشرق میں موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا ہے کہ بجا طور پر وہ دنیا کا ایک بہت بڑا مفکر اور مصنف مانا جاتا ہے اور بہ حیثیت مفکر وہ بنی نوع انسان کے لئے ایک پیغام کا حامل ہے یہی وہ خصوصیات ہیں جن کا حیدرآباد اعتراف کر رہا ہے۔

خواتین و حضرات! میں اس تقریب کی کامیابی کامل سے متمنی ہوں"۔

پیامات:

ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل نواب سر اکبر حیدری نواز جنگ بہادر صدر اعظم دولت آصفیہ و امیر جامعہ عثمانیہ

مجھ سے منتظمین جلسہ نے خواہش کی ہے کہ میں بحیثیت امیر جامعہ ایک پیام آج کی تقریب کے لئے دوں۔ آج ہم اس لئے جمع ہوئے ہیں کہ ایک ایسی شخصیت کے جشن دن کی یاد منائیں جو مسلمہ طور پر خالص ہندوستانی شاعر اور حقیقی ہندو مسلم تہذیب کا شعر گو ہے اس کی شاعری تصوف فلسفہ اور قومیت کا عجیب مجموعہ ہے اور ایسے شاعر کے لیے سوائے حیدرآباد کے ہندوستان میں کوئی اور مقام جشن دن منانے کا موزوں نہیں ہو سکتا، جہاں اردو اور فارسی بڑے طبقات کی بولی سمجھی جاتی ہے اور جہاں پر ایک ایسا تاجدار شاعر موجود ہے جس کے تخیل اور اندرونی جذبات کو ہم ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے رہنے والے اپنے لیے آئینۂ ہدایت سمجھتے ہیں اور آج کے جلسہ کی زینت صدارت کے لئے ہز ہائنس پرنس سے بڑھ کر کون موزوں ہو سکتا ہے جو خاندان آصفی کے تاجدار شاعر کا نور عین ہے۔

ہز ہائی نس سر آغا خاں:

اقبال جو اردو اور فارسی زبانوں کا مایۂ ناز شاعر اعظم ہے اس کا یوم منا کر آپ نے اسلامی تہذیب کو درخشاں کر دیا۔ اقبال کی شاعری میں ہندوستانی قومیت کی تحریک کے راز پوشیدہ ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس شاعر اعظم کے نغموں کی وجہ سے موجودہ نسل زبردست متاثر ہوئی۔ اقبال کی خداداد قابلیت کا ہر شخص معترف ہے۔ "یوم اقبال" کی کامیابی کی توقع پر مسرت کا اظہار کرتا ہوں۔

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو:

میں اپنے بہترین دوست اقبال کو ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کا عظیم ترین شاعر سمجھتی ہوں۔ اس شاعر کے اردو اور فارسی شعری کارنامے ہندوستانی قوم کے زبردست رہبر و رہنما ثابت ہوں گے۔

ہز اکسلنسی سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب:

میں انتہائی مسرت محسوس کر رہا ہوں کہ مشرق کے شاعر اعظم کا یوم "ہز ہائنس پرنس آف برار" کی صدارت میں شاندار طریقہ سے منایا جا رہا ہے۔ اس فلسفی شاعر کے پرستاروں کی بہترین توقعات مسلم کلچر سوسائٹی سے وابستہ ہیں۔

ہز ہائی نس عالیجناب نواب صاحب رامپور:۔

"اقبال ڈے" کے شاندار موقع پر مجھے مبارکباد کہنے کی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ اس شاعر اعظم نے اردو فارسی شاعری کے علاوہ فلسفہ کی جتنی خدمت انجام دی ہے اس کا اعتراف ہر شخص کو ہے۔

ہز ہائنس عالیجناب نواب صاحب بھوپال:۔

مجھے مسرت ہوئی کہ "یوم اقبال" ہز ہائی نس پرنس آف برار ولیعہد خانوادۂ آصفی کی صدارت میں منایا جارہا ہے۔ اقبال کے نغموں میں ہندوستانی قوم کی ترقیوں کے راز مضمر ہیں۔ اس فلسفی شاعر نے اہل ہند کو خواب غفلت سے چونکا کر ان میں احساس بیداری پیدا کر دیا۔

آنریبل سر غلام حسین:۔

"یوم اقبال" کے سلسلے میں میں اپنی بہترین توقعات اور مسرتوں کا اظہار کرتا ہوں۔

آنریبل مسٹر یعقوب حسن:۔

میں بھی مسلم کلچر سوسائٹی کے ساتھ یوم اقبال کی مسرت حاصل کر رہا ہوں۔

مسٹر عبداللہ بریلوی:۔

اقبال دنیا کے چند غیر فانی شعرا میں سے ہے مجھے توقع ہے کہ اہل حیدرآباد اقبال کی لافانی شاعری کو انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے بیتی دنیا تک اس کا پیام پہنچا کر زندۂ جاوید کارنامہ پیش کریں گے۔

جسٹس منوہر لال:۔

اقبال موجودہ نسل کا سب سے زبردست مجاہد شاعر ہے۔ اس لافانی شاعر کو ابھی کئی "بانگ درا" پیش کرنی ہیں۔

شعبۂ اسلامیات جامعۂ پیرس:۔

نے اپنے مستقل نمایندۂ ہندوستان کو اس بات کا مجاز کیا ہے کہ "یوم اقبال" سے جو ہز ہائنس شہزادہ برار کی معزز صدارت میں منعقد ہو رہا ہے اپنے آپ کو وابستہ کرے اور کامیابی کی بہترین تمنائیں پہنچاوے۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور:۔

ہندوستان کے شاعر اعظم کا "یوم" منانے میں میری مسرتیں بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ مجھے عمر بھر اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں اقبال جیسے شاعر اعظم کا کلام اردو فارسی زبانوں سے ناواقفیت کی وجہ سے اصلی علمی و ادبی حسن کارانہ روپ میں نہ دیکھ سکا۔ خدا اقبال کو قوم اور ملک کی خدمت کے لئے زندہ و سلامت رکھے۔

ہز اکسلنسی سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور۔

ہز ہائنس پرنس آف برار کی صدارت میں مسلم کلچر سوسائٹی نے "یوم اقبال" منا کر فی الحقیقت ادبی و شعری مسرتوں میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اس شاعر اعظم کی اردو اور فارسی شاعری تعریف سے بالاتر ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ اقبال زندہ رہیں تاکہ ملک و قوم کی خدمت کر سکیں۔

―――(۰)―――

فردوس میں رومی سے یہ کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ، وہی آش!
حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش!
(اقبال)

خطبۂ صدارت

ہز اکسلنسی یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد بہادر شادؔ

اردو شاعری کے اس جشن جمہوم میں آج کا دن حقیقت میں ایک یادگار دن ہے کیونکہ آج ہم سر اقبال جیسے مشہور اور مقبول شاعر کی خصوصیات کی داد و تحسین کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

مجھے اس کی مسرت ہے کہ آپ نے اس جلسہ کے دوسرے اجلاس کی صدارت کا اعزاز مجھے عطا کیا۔ میرے سر اقبال سے ذاتی تعلقات بھی ہیں۔ یہی تعلقات مجھے اپنی کم نظری کے باوجود اس کا مستحق ٹھیراتے ہیں۔

حضرات! دنیا کا رخ بدل چکا ہے، جو طرز شعر اب سے چند سال قبل مطبوع و مقبول تھا۔ اب اس کی مانگ بہت کم ہوتی جارہی ہے، اب شعر مجلس کی گرمی اور دلوں کی آسودگی کے لئے نہیں کہے جاتے۔ بلکہ قومی مذہبی اور ملکی تعمیر کا بارگراں بھی ان کے دوش پر رکھدیا گیا ہے۔ اسے اقبال ہی کی زبان سے سنئے :۔

محفل را آتش گری بر ہم زدم
زخمہ بر تار رگ عالم زدم
بسکہ عود فطرتم نادر نوا است
ہم نشیں از نغمہ ام ناآشنا است

باوجود اس کے ہندوستان کی فضا میں ابھی ایسے شعرا موجود ہیں جو اپنے قدیم اساس شعر کو ترک کرنا مشرب سخن سنجی کا گناہ عظیم سمجھتے ہیں مگر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

ہندوستان کی جدید نسلیں، مختلف اقوام و ملل کے زاویۂ نگاہ سے باخبر ہو چکی ہیں اور ایک تیز رو دھارے کی طرح حقیقت عام ہوتی جارہی ہے کہ ہماری عہد گذشتہ کی شاعری آرٹ کی حیثیت میں خواہ کتنی ہی کامیاب سہی لیکن اس نے ہماری ہیئت اجتماعی پر کچھ اچھا اثر نہیں کیا۔ غرض زمانہ ہر پرانی چیز کو ترک کرنے اور نئی کو سراہنے کی سنت ادا کر رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس نقطۂ نظر کے متعلق آئندہ نسلیں کیا رائے قائم کریں گی۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ فن شعر کی اس کایا پلٹ نے ہندی شاعر کے سینے میں بھی تحقیق و تلاش کی رَو دوڑا دی اور اب "قدیم" چابکدست "معماروں" کے بنائے ہوئے ایجرکے اپنے کلام کو درست کرنے کی بجائے اس نے خود اپنی ایک عمارت تعمیر کرنے پر توجہ کی۔ اس سے ایک طرف جدید نسلوں کی توجہ تحصیل علم کی جانب بڑھنے لگی اور دوسری طرف ان کے افکار شعری "صرف" جمالیاتی اور حزنی "کیفیات" تک محدود نہیں رہیں بلکہ ان میں بصیرت و بصارت کے اسرار جھلکنے لگے۔ ہندوستان میں اردو اور فارسی میں اس طرز شعر کا علمبردار یقیناً اقبال ہے جس نے مشرقی انداز بیان کو قائم رکھکر شاعری ہی میں حکمت و بیداری کے دریا بہادئے اور جدید نسلوں کو اپنے بلند آہنگ نغموں کے ذریعے جینے اور اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کا راز سمجھایا۔

"خودی" اقبال کے کلام کا سرنامۂ امتیاز ہے اور یہی ایک لفظ اس تمام دعوتِ سعی و عمل کا آئینہ دار ہے۔ خودی احساس نفس بلکہ عظمتِ نفس کا ایک راز ہے جسے اقبال کی باریک بیں نظروں نے پہچانا اور مشرق کی موجودہ پستی نے اس کے حساس دل کو سمجھایا کہ جب تک اس کو نصب العین نہ بنایا جائے گا۔ یہ حضیض تنزل میں آئی ہوئی اقوام مشرق کا نا

ہیں اپنی بقائے حیات کے لئے جگہ نہ حاصل کر سکیں گی۔

حقیقت میں اقبال جس بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے وہ اس کا جائز حق ہے اور اس کا پیام فرزندانِ مشرق کبھی فراموش نہ کر سکیں گے آئندہ نسلیں اس کا فیصلہ کریں گی ہندوستان کی اپنی ناہمواری کی اصلاح اور قومی ترقی میں اس قدر جاوید شاعر کا کس قدر حصہ تھا اعلیٰ تخیلات کسی شاعر کی نسبت جیسے اقبال ہیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی مذہب اور ذات کے قیود کا وہ تابع ہو سکتا ہے اقبال کی ذات بحیثیت شاعر لطیفیات عالم کے ہر حسن پر حاوی ہے۔ اقبال بحیثیت فرزند ہند اپنی وطنیت پر نازاں ہیں اقبال کو مسلم ہونے پر بجا فخر ہے تو ان کے ہندوستان سے وابستہ جذبات وطنی اور قومی بھی ایسے ہی اعلیٰ تخیلات سے مملو ہیں جو اقبال جیسے بلند پایہ شاعر کے شایانِ شان ہیں کوئی اقبال کا مسلم ترانہ دیکھ کر ان کو مسلمانوں کا شاعر خیال کرے تو اس سے شعر کہنا وہ نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے مسلمانوں کی خوبیوں کو کما حقہ واضح کر دکھایا کہ مسلمانوں کو بیدار کیا جائے۔ ہندو اہل کی حقیقتوں کو موثر پیرایہ میں پیش کیا کہ ہندو حقیقت آگاہ ہو جائیں جہاں اقبال نے اس ملک کو بیدار کرنے میں اس طرح بلند حصہ لیا ہے، ہندو مسلمانوں میں اتحاد قومی کی روح بھی پھونکی ہے۔ جس کی ترجمانی اقبال کی بے شمار نظمیں کرتی ہیں۔ جن کا یہاں حوالہ خالی از طوالت نہیں۔

ظلم ہوگا اگر مشرق ایسے باکمال شاعر کو اس کی زندگی میں کم سے کم خراج تحسین بھی ادا نہ کرتا اور مجھ کو دلی مسرت ہے کہ ہمارے اہل ملک دوسرے اقطاع ہندوستان سے پیچھے نہیں رہے اور کیوں کر پیچھے رہتے جب کہ اہل علم و فن کی قدر افزائی ان کا روایتی شیوہ رہا ہے اور انھوں نے اقبال کا وہ "قرض" جو علمی اور ادبی حیثیت میں ان پر تھا کسی حد تک ادا کر دیا۔ میری دعا ہے کہ خدا اقبال کو بہت دن تک زندہ رکھے تاکہ ہندوستان ان کے نغمۂ بیداری سے زندگی اور کامیابی کا درس حاصل کرتا رہے۔

میں اب ان سطور کو ختم کرتا ہوا آپ حضرات کا مشکور گذار ہوں اور مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کی وجہ سے اقبال کے کلام کا کچھ انتخاب نہ پیش کر سکا لیکن مجھے یقین ہے کہ اس جلسہ میں اس فرض کو دوسرے اصحاب ادا کر [illegible] کے لئے اقبال کے اسرار خودی و بیخودی کی لذتوں سے آشنا کر رہیں گے آخر میں اعلیٰحضرت آقائے ولی نعمت سلطان العلوم کی عمر و اقبال کی دعا کرتا ہوں جن کی علمی و فنی سرپرستی اظہر من الشمس ہے اور جن کی فارسی و اردو شاعری کا وہ مرتبہ ہے جس کا اعتراف حافظ و سعدی اور میر و امیر کی روحیں کرتی ہیں اور جن کا واحد ذوق فارسی زبان کی نشاۃ ثانی کا ضامن ہے اور یہ اسی توارث ذوق علمی کا اثر تھا کہ حضرت والا شان ہز ہائنس پرنس آف برار نے اس خالص علمی جلسہ کے اجلاس اول کی صدارت سے ہم سب کو سرفراز فرمایا اور نہ صرف ہمیں بلکہ خود اقبال کو بھی اپنی رونق افروزی سے مفتخر و معزز فرمایا۔ خداوند حقیقی ان سب کی عمر و اقبال میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

اقبال نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا — یہ شعرِ نشاط آور و پرسوز و طربناک

میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج — کرتا ہے مرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

عالمی نظم وضبط کے متعلق اقبال کا تصور

(اقتباس)

آج ہم اس شخص کی ذہنی عظمت وبلندی کی تحسین و ستائش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں جس نے اپنی ساری زندگی مشرقی تہذیب کے بعض ان روایتی خصوصیات سے اپنی شاعری کو آراستہ کرنے کے لئے وقف کردی ہے، جن کی وجہ سے مشرقی تہذیب ممتاز ہے۔ یہ مشرقی تہذیب ہر روحانی تہذیب کا گہوارہ رہی ہے۔ اس نے ہر دور میں انسانی زندگی کو عزت و توقیر بخشنے کا فرض ادا کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ آج ہم شاعر اقبال کی عزت کیا کر رہے گویا اپنی نظروں میں آپ وقیع وممتاز ہو رہے ہیں۔

اقبال بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کی کون سی حیثیت پر زیادہ زور دے سکتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اقبال کی شاعری کی عظمت عالی کو سمجھنے اُن کے جذبات واحساسات کی گہرائیوں اور ان کے تصور کی بلند پروازی تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی شاعری اولین دور میں تھی زمانہ گذرتا گیا اور اس دلچسپی کو جو زندگی کے شاعرانہ اعتبار سے متعلق ہے صرف حسن ورعنائی کے اطمینان بخش انداز بیان سے کچھ اور زیادہ طلب کرنے کی ضرورت ہوئی۔ بعض اوقات میں نے ان کے فلسفہ کے نہائے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس دنیا پر اس کی تاریخ پر اس کے مسائل پر اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے مستقبل قریب پر ایک وجدانی تصور کے ذریعہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ تصور اقبال کے فلسفہ کا مہیا کردہ ہے۔

اس شاعری کو میں اب تک محسوس کرتا اور فلسفہ کی اس آواز کو اب تک سنتا ہوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں کہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کو منتخب کرکے اقبال تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ ان دونوں نے اس طرح ترکیب پائی ہے کہ میرے نزدیک ان کا کلام نہ تو خالص شاعری کا روپ رکھتا ہے اور نہ نرے فلسفہ کا رنگ۔ یوں کہئے کہ گویا ان دونوں نے عرفان عمرانی کے مرکب کی شکل پائی ہے اور اپنا اپنا حق ادا کرتے ہیں۔

اقبال نے جو اثر مجھ پر چھوڑا ہے اس کو واضح کرنے کے لئے میں نے عرفانِ عمرانی کا لفظ استعمال کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اقبال نے عالمی تصور کے سلسلہ میں اپنے پاس سے جو چیز پیش کی ہے وہ اس سے نمایاں ہو جاتی ہے اور زندگی کے اس پیام جاوید کی طرف اشارا کرتا ہے جو ہمیشہ سے روحِ فطرت میں کارفرما نظر آیا ہے اور بنی نوع انسان کی حیاتِ مدنی کے لئے ایک ایسے مطمح نظر کو متعین کرتا ہے جس کو اس وقت ہر جگہ فراموش کیا جا رہا ہے۔

اقبال کی قوم پرستی کی یہ داستان اس زمانہ کی ہے جب کہ اُن کا عالمِ شباب تھا اور فطرت کا اقتضا یہی تھا کہ اس وقت جب کہ ہندوستان کے ایک بیدار اور ترقی یافتہ طبقہ کے دلوں کو نام نہاد قوم پرستی کا مضراب آہستہ آہستہ چھیڑ رہا تھا۔ اقبال بھی مست ہو کر ایسے ہی نغمے الاپنے لگے لیکن جب وہ یورپ گئے اور ان کی نظر نے دنیا کے حوادث، اقوام عالم کے رجحانات اور انسانیت کی بے کسی اور مجبوری کا بہت قریب سے مطالعہ کیا اور زندگی کے تجربات نے جب ان کی پرواز نظر کو مزید تقویت بخشی تو وہ قومیت کا محدود تصور بہت پیچھے رہ گیا اور وہ ایک پاکیزہ اور بلند و بالا مطمح نظر کے حامی ہو گئے یہی وہ مطمح نظر ہے جو انسانیت کی نجات کا باعث ہے۔

سید عبداللطیف سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دئے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرادیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جارہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور محبوبی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقایق کی گتھیوں اور سیاسیات حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کردیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی۔ اقبال نے صاف صاف اعلان کردیا ہے ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق / نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش / میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہی ہیں لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ انھوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا۔

وہ کہتے ہیں ؎

صحبت بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھکو / نہ کر خارا شگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

فروتر ہے شکوہ امیر و سلطان سے / وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی
مری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی / شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

(اقتباس)

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ زبان و محاورہ کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے :-

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں / کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی
مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی / کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں
مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ / کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ
تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا / کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر
خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری / وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی حقیقت نگاری شاعری کے لوازم ہوتے جارہے ہیں۔ معاملہ بندی آسمان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلی یا لکھنؤ کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جارہی ہے۔ مولوی حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلفات لایعنی اور خیالی لوازم شعری کی مدافعت اس مہذب پیرایہ میں کی تھی کہ ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی / بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال ضروریات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کرکے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کردیا اور اردو شاعری یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہوگئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود

کردی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا اور بغیر شاعری یا پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ اہلِ محفل کو دعوتِ عمل دیتے ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مئے لالہ فام نکالیں۔ اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوقِ خودی نہیں رکھتے ان سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

قدم نہیں تم سے حلقۂ سخن میں بیٹھو کہ مجھ سے ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس سے کما حقہٗ محظوظ ہونے کے قابل نہیں ہوی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں۔

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہلِ مدرسہ اہلِ خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ سے اب تک ملت و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خونِ جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوامِ ساقی

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہارِ بوالہوسی اور زلف و کاکل خد و خال اور رجوع و کمر کے مضامین باندھنے کی اچھی توضیح کی ہے کہ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ "آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" جتنا اردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔

عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں۔ جب تک آدمیوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ حیات اور باعث افتخار ثابت نہیں ہو سکتی۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بیکار ہے۔ وہ بادِ سحری کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں
بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحرخیز

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ
از ہرچہ بآئینہ نماید بپرہیز

آخر میں ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سنائے دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحہ عمل کا کام دے رہے ہیں اور جن میں اقبال شاعروں ہی سے مخاطب ہیں ۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے

شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعت نظر اور مرحلۂ شوق کی گوناگونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے ۔ اقبال کی تلخ نوائیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ تسلیم و سیماب اور جوش و ساغر جیسے پختہ مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا ۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے ۔ ایک زمانہ میں ناسخ و آتش کے اثر سے الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان متروک ہو گئے تھے اور آج اقبال کے اثر سے بہت سے فرسودہ خیالات، لایعنی تکلفات اور غیر ضروری لوازم شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبال کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہل اردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہوگی ۔

سید محی الدین قادری زور

سونے والوں کو ' پیام صبح نو ' دیتی ہوئی
خواب کی دنیا اٹھی ' انگڑائیاں لیتی ہوئی

مطلع مشرق پہ چمکا ' آفتاب شاعری
ہر کرن ' جس کی بنی ' تار رباب شاعری

دل پہ تھا جو داغ غفلت ' اس کو آہیں دھو گئیں
خون مشرق میں ہزاروں بجلیاں حل ہو گئیں

ضبط کے زخم نہاں ' فریاد سے بھرنے لگے
یعنی بندے بھی خدا سے گفتگو کرنے لگے

عارض پر نور جھلکا ' گیسوئے شب رنگ سے
جوئبار ساز دل نکلی ' سکوت سنگ سے

اشک خونیں میں نظر آئی تبسم کی جھلک
نغمۂ بلبل بنی ' خاموش پھولوں کی مہک

کارواں بڑھنے لگا ' تیزی سے منزل کی طرف
کائنات درد خود کھنچنے لگی ' دل کی طرف

دہر کے دھارے پہ طوفانی ہوا بہنے لگی
ناؤ ' مشرق کی کنارے کی طرف بہنے لگی

جاگ اٹھا مشرق ' دل اقبال کی دھڑکن گواہ
واہ کیا محشر لئے آتی ہے جس کے لب پہ آہ

قلب شاعر سے صداقت لے کے نکلی شاعری
سچ کہا ہے "شاعری جزویست از پیغمبری"

میکش

اقبال کی حسن کاری

شاعری حسن کاری کا سب سے بلند مظہر ہے اور شاعر حسن کاری کا مبالغہ۔ شاعر ایک ایسا حسن کار ہے جو بجائے رنگ و موقلم، سنگ و تیشہ، رباب و مضراب کے الفاظ اور قلم کو تخلیق کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس لئے جس قدر بڑا شاعر ہوگا اسی قدر وہ حقیقی معنوں میں بڑا حسن کار ہوگا۔ اقبال بڑا شاعر ہے اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ ہم خود "یوم اقبال" منا رہے ہیں۔ چونکہ وہ بڑا شاعر ہے اس لئے وہ بڑا حسن کار بھی ہے اور اس موقع کو غنیمت جان کر میں اقبال کو بحیثیت "حسن کار" آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

شاعر جب حسن کارانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے تو اس کا کلام تصور کی نگاہ میں ایک رنگین تصویر، خوبصورت مجسمہ اور دلکش نغمہ بن جاتا ہے۔ وہی ذرائع جو حرفِ عام میں حسن کار کی حسن آفرینی کو پیش کرتے ہیں، شاعر الفاظ اور صرف الفاظ کو استعمال کر کے آپ کے تخیل کے پردے پر حسین ارتسامات پیدا کر دیتا ہے۔

جب ہم اقبال کو اس نقطۂ نگاہ سے جانچتے ہیں تو ہم اس کو اردو اور فارسی کے بلند شاعر کی بجائے ہندوستان کا سب سے انوکھا حسن کار پاتے ہیں۔ اس کی حسن کاری میں مشرق کی خوبیاں، مغرب کا پرتو اور مسلم کی ذہنیت جلوہ گر ہونے لگتی ہے۔

اقبال شاعرِ قدرت ہے اور قدرت ہی اس کو تخیل

ایک دلچسپ مقالہ کی چند سطریں

کی بلند پروازی میں مدد دیتی ہے۔ قدرتی مناظر ہر بڑے شاعر کے لئے جاذبِ نظر ہوتے ہیں اور کوئی زبان مناظری شاعری سے خالی نہیں۔ اقبال کا کلام بھی ان چیزوں سے پُر ہے، خواہ وہ اردو میں ہو یا فارسی میں۔ شاعر کی رنگ کاری کو دیکھنے کے لئے اسی قسم کا کلام پیش نظر ہو جاتا ہے۔ جس میں فطرت کے ہر لمحہ، ہر موسم، ہر کیفیت کو اقبال نے چھوٹے اور بڑے canvas پر لفظوں کے ذریعہ رنگ دیا ہے۔ ایک نظم میں وہ ایک خاموش پرکیف، سوز و گداز سے بھرا ہوا منظر پیش کرتا ہے، کہتا ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی ۔۔ شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی
وادی کے نوا فروش خاموش ۔۔ کہسار کے سبز پوش خاموش
فطرت بے ہوش ہو گئی ہے ۔۔ آغوش میں شب کے سو گئی ہے۔

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے
نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

تاروں کا خموش کارواں ہے ۔۔ یہ قافلہ بے درا رواں ہے
خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا ۔۔ فطرت ہے مراقبے میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا
آغوش میں غم کو لے کے سو جا

صبح کا پرفروش منظر، رنگوں کا تلاطم، نور و ظلمت کی کشمکش، اور بتدریج ظلمت پر نور کا غلبہ اس طرح کہ کوئی۔

کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغ آب دار

نظم کیا ہے رنگوں کا ایک مرقع ہے جو معمولی رنگوں اور موقلم

کی ہی سے بلند اور بالا ہے۔ اب رات کا منظر دیکھئے قلعہ گولکنڈہ کے پیچھے گورستان شاہی کے قریب شاعر بیٹھا ہوا ہے آسمان پر ابر بھی ہے چاند بھی ہے۔ حسن کار کے لئے بہترین موضوع ہے۔ گورستان کا مایوس منظر نورانی حسن میں گم ہے جس کو حسن کار شاعر یوں ادا کرتا ہے۔

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے　　کچھ مکدر سا جبین ماہ کا آئینہ ہے
چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں　　صبح صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں
کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی　　بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

کیا ان اشعار کو پڑھنے کے بعد بھی وہ شخص جس نے قطب شاہیوں کی آخری آرام گاہ کو دیکھا ہے اپنے سامنے ایک حسین تصور گورستان شاہی اور موسم باران کی چاندنی رات کا محسوس نہیں کرتا۔ یہ لفظوں کی رنگ کاری ہے۔

اب فارسی کلام کی موسیقی دیکھئے اس کلام میں لفظ اور ہم آہنگی کی بیحد بہتات ہے۔

بلبلاں در صفیر　　صلصلگان در خروش
خون چمن گرم جوش　　اے کہ نشینی خموش
در شکن آئین ہوش　　بادۂ معنی بنوش
نغمہ سرا، گل بپوش
بلبلاں در صفیر　　صلصلگان در خروش

سید محمد اکبر وفا قانی

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا　　جانب مشرق اُجالا سا نظر آنے لگا
موت کی پرچھائیاں چھٹنے لگیں چھٹنے لگیں　　ظلمتوں کی چادریں ہٹنے لگیں ہٹنے لگیں
اک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا　　آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا
عالم بالا پہ باہم شورے ہونے لگے　　آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے
پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا　　زندگی کی موٹر پر گاتا ہوا پایا گیا
وہ نقیب زندگی شام و سحر گاتا گیا　　کوبہ کو، کوچہ بہ کوچہ در بہ در گاتا گیا
گیت سننے کے لئے خلق خدا آنے لگی　　گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی
نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں　　صور اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں

عرش کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے

مخدوم محی الدین

مجاہد اقبال

بال جبریل اور ضرب کلیم کی روشنی میں

(اقتباس)

اقبال کے کلام کے کئی پہلو ہیں، اسی مناسبت سے اُن پر بحث کی جاتی ہے۔ ان ہی پہلوؤں میں سے ایک پہلو جہاد کا ہے اور غالباً غالب پہلو بھی یہی ہے۔ اقبال کے پیش نظر انفرادی اور اجتماعی سیرت کا ایک خاکہ ہے جس کسی کو وہ اپنے نصب العین سے ہٹا ہوا پاتا ہے اُس کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ جس کسی کردار یا ارادہ میں اپنے خیال کی جھلک بھی دیکھتا ہے تو اُس سے متاثر ہوتا ہے مجاہد کی خود اقبال نے یہ تعریف کی ہے:

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی — گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں، نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق — نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش — میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
مشکل ہے کہ اک بندۂ حق بین و حق اندیش — خاشاک کے تودے کو کہے کوہ دماوند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش — میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظر باز و نکو بین و کم آزار — آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم — کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوق شکر خند
چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال — کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

یہی ہے مجاہد کی تعریف، یہی بندۂ گستاخ کہیں اقبال کہیں مومن، کہیں قلندر، کہیں درویش اور کہیں مرد کامل کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ مرد مجاہد ہر عہد کے سماجی حالات کے مطابق کبھی مصلح، کبھی مدبر، کبھی شاعر اور کبھی پیغمبر کے پیکروں میں نمودار ہوا ہے۔ اس کا کام کلیسا اور حرم کے چراغ گل کرنا ہے تاکہ خدا اور انسان میں کوئی پردہ حائل نہ رہے۔ اس کا کام میری و قیصری کے ایوانوں کو ڈھانا ہے تاکہ ابن آدم اس ارض اللہ پر نیابت الٰہی کا حقیقی منصب ادا کرے۔ خونخواری نہیں بلکہ محبت کرنا سیکھے وہ حق پرست اور باطل شکن ہے۔ اس کی بجلیاں اپنوں اور بیگانوں کا امتیاز نہیں کرتیں۔ وہ فرعون کے لئے موسیٰ اور لات و ہبل کے لئے محمد ہے لات و ہبل چاہے حرم کے ہوں یا سومنات کے، عرب کے ہوں یا عجم کے۔ فرعون چاہے مشرق کے ہوں یا مغرب کے، مدرسہ کے ہوں یا خانقاہ کے۔

اقبال کے کلام کا مرکزی جذبہ عشق ہے۔ اس کی ساری تعلیمات اس کے سارے شاعرانہ تخیلات اسی جذبے کا طواف کرتے ہیں وہ عشق ہی کے بازوؤں پر بیٹھ کر آسمانوں کی سیر کرتا ہے فضاؤں میں اڑنا اس کا محبوب شغلہ ہے گنبد نیلوفری میں اپنا نشیمن بنانا چاہتا ہے۔ اس کے کلام کے ہر ورق سے عالم بالا کی بو آتی ہے مگر چونکہ فلسفیانہ تجسس کا نقطۂ پرواز دنیاوی حقایق ہی میں ہے اس لئے آسمانوں کی سیر میں بھی اقبال کا دامن زمین ہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ وہ نیند میں بھی زندگی کو نہیں بھولتا۔ ہرچند وہ عملی دنیا کی کشمکش سے منہ چھپا کر داخلیت میں بند ہو جانا چاہتا ہے۔ باوجود خاکی ہونے کے خاک سے پیوند نہیں رکھنا چاہتا بلکہ اس کی ذات میں صرف عشق ہی نہیں اس میں عقل کا عنصر بھی شامل ہے اور بام حرم کا یہ کبوتر زندگی اور اس کی تلخیوں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انسان کے پیش نظر جب کوئی مقصد ہوتا ہے تو وہ اپنی آواز سے بولتا ہے۔ مگر جب کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے تو وہ گایا کرتا ہے۔ جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ مصوری کرتا ہے۔ انسان کی جب کوئی منزل ہوتی ہے تو وہ اپنے پاؤں سے چلتا ہے جب کچھ نہیں ہوتا تو وہ رقص کرتا ہے۔ اقبال کی زندگی کا سارا جہاد اسی دنیا کے لئے ہے

وطن سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
آ غیریت کے پردے ایک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں

ہندوستان کی عظمت پارینہ کو یاد دلا کر اہل ہند کے دلوں میں احساس برتری اور حب الوطنی کے جذبات کو اس طرح بیدار کرتا ہے:

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا — سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو حق نے جس کی زر کا اثر دیا تھا — ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ملی شاعری: لیکن ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے اقبال کے خیالات کی کایا پلٹ دی۔ اس نے دیکھا کہ ملت بیضا کا چراغ کوئی دم کا مہمان ہے اور مسلمانان عالم کا سیاسی اقتدار اور تیرہ سو سال کا تمدن صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو رہا ہے اس کے حساس دل کو جسے اسلام اور اہل اسلام سے سچی ہمدردی ہے چوٹ لگتی ہے اس کی حمیت ملی جوش میں آتی ہے اب وہ اپنا موضوع سخن بجائے وطنیت عالمگیر اسلامی اخوت بنا لیتا ہے اور اپنی تمام توجہ مسلمانان عالم کی فلاح و صلاح کی طرف منعطف کر دیتا ہے اس کا ترانہ اب بجائے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" ہو جاتا ہے۔ دنیائے اسلام کی ذلت و رسوائی اسے اس قدر متاثر کرتی ہے کہ وہ "عجز کے اسرار" کو پس پشت ڈال کر اپنی مشہور و معروف نظم "شکوہ" میں اللہ سے بھی "برہم" ہو جاتا ہے اور اس برہمی کے آثار اس کی تازہ ترین تصانیف میں بھی باقی ہیں:

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

ایک دوسرے مقام پر یوں شکوہ سنج ہوتا ہے:

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے — بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم — بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

دنیائے اسلام کے زوال و پستی کا سبب اس کے نزدیک صحیح اسلامی اسپرٹ کا فقدان ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے — مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق — کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

اس کا ایقان ہے کہ اسلام ہی انسانیت کا علمبردار ہے وہ سمجھتا ہے کہ اگر اقوام عالم اسلام کے بتائے ہوئے اصول پر کاربند ہو جائیں تو عصر حاضر کی ساری معاشی کشمکش اور سیاسی اضطراب کا خاتمہ ہو جائے لیکن یہ وہ اسلام نہیں جو نام نہاد مولویوں اور صوفیوں کا بتلایا ہوا ہے

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

غرض اقبال نے اپنی شعلہ نوائی سے مسلمانان عالم میں موت و حیات کی ایک ایسی چنگاری پیدا کر دی کہ دنیائے اسلام اس کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتی۔

سیاسی شاعری: سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اقبال ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ ایک مفکر کی حیثیت سے اس نے سیاسیات حاضرہ کے تقریباً تمام پہلوؤں پر رائے زنی کی ہے۔ وہ ناروا قومیت کی سخت مذمت کرتا ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جنگ و جدل کا اہم ترین سبب اقوام عالم کی رقابت اور ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کی خواہش ہے جس سے انسانیت کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔

(اقتباس) عباس جعفری

مشرق کے مایۂ ناز شاعر کی زندگی پر ایک نظر

مشرق کے مایۂ ناز شاعر اعظم اور دنیا کے مفکر اعظم ڈاکٹر سر محمد اقبال بار۔ ایٹ لا ۱۸۷۵ء میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے آپ کشمیر کے ایک شریف ہندو گھرانے کے چشم و چراغ ہیں ابتدائی تعلیم آپ نے "مکتب" میں پائی، اور پھر انگریزی تعلیم کے لئے ہائی اسکول میں شریک ہے جہاں آپ اپنی خداداد قابلیت اور ذہانت طبع کی وجہ سے بہت جلد ممتاز ہو گئے تقریباً ہر جماعت میں آپ کو قابلیت کی وجہ سے وظیفہ ملتا رہا۔ آپ کی اوائل عمر کی خداداد قابلیت کا پتہ حسب ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے ایک مرتبہ اقبال جماعت میں دیر سے داخل ہوئے اس پر فاضل استاد نے کہا "کیا بات ہے اقبال تم اکثر جماعت میں دیر سے آتے ہو" اقبال نے فوراً جواب دیا "قبلہ" اقبال ہمیشہ دیر سے آیا کرتا ہے۔

میٹرک کامیاب کرنے کے بعد اقبال سیالکوٹ کے کالج میں شریک ہوئے جہاں خوش قسمتی سے اقبال کو علوم شرقی کے علامہ شمس العلماء سید میر حسن جیسا استاد ملا۔ ان کی تعلیم کا یہ خاصہ تھا کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھتا اس کی طبیعت میں زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے چونکہ اقبال کی طبیعت میں علم و ادب سے قدرتی طور پر مناسبت موجود تھی اس لئے مولوی صاحب کی تلمیذ ہونے پر سہاگہ کا کام کر گئی اور ابھی اسکول ہی میں تھے کہ کلام موزوں زبان سے نکلنے لگا۔ اس زمانہ میں فصیح الملک مرزا داغ مرحوم استاد حضرت غفران مکاں کا بہت شہرہ تھا۔ چنانچہ اقبال نے اپنا ابتدائی کلام خطوط کے ذریعہ انہیں کو بغرض اصلاح روانہ کیا۔ داغ مرحوم فخر کیا کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہے جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی۔

سیالکوٹ کالج میں ایف۔ اے کامیاب کرنے کے بعد بی، اے کے لئے اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ جہاں اقبال جیسے فلسفہ پسند طالب علم کو پروفیسر آرنلڈ (جو بعد کو سر ٹامس آرنلڈ ہوئے) جیسا غیر معمولی قابلیت کا استاد ملا۔ یہ سلسلہ تلمذ اقبال کو کھینچ لے گیا، اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا، اور اقبال آرنلڈ کی قابلیت کے معترف ہیں۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کو ڈاکٹر میک ٹیگرٹ اور براؤن نکلسن ۔۔۔۔۔۔ جیسے قابل اصحاب ملے۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کی مشہور فارسی نظم اسرار خودی کو انگریزی کا جامہ پہنایا۔ خوش قسمتی سے اقبال کو مولانا شبلی مرحوم مولانا حالی مرحوم اور مولانا اکبر آبادی کا ساتھ ملا۔

اقبال کچھ دنوں گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر بھی رہ چکے ہیں اس زمانہ میں علمی مشاغل کی شرکت کی وجہ سے فی البدیہہ اشعار کا دریا بہاتے تھے جسے ان کے ساتھی اور طلبا نوٹ کر لیا کرتے تھے اقبال نے کبھی فرمایش پر نظم یا غزل نہیں کہی، بلکہ جب کبھی طبیعت موزوں رہتی تو زبان سے اشعار کا دریا امنڈ آتا تھا۔ آواز میں سوز و گداز اور ترنم کی وجہ سے اقبال جب کبھی نظم سر محفل پڑھتے تو خود بھی وجد کرتے اور محفل کو بھی وجد میں لاتے۔

اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کی جو خدمت کی ہے شاید کسی بڑے لیڈر نے بھی نہ کی ہوگی۔ انجمن حمایت اسلام لاہور میں جب آپ نے اپنی معرکتہ آلارا نظم "شکوہ" سنائی تو اس نظم نے مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے میں ایک معجزہ کا کام کیا۔ بعض "مولوی" قسم کے حضرات نے اقبال پر اس نظم کی وجہ سے کفر کا فتویٰ لگا ہی دیا ہوتا اگر اقبال "جواب شکوہ" سے انہیں ٹھنڈا نہ کر دیتے۔

(اقتباس)

محمد حبیب اللہ ادج

وفات کے بعد

ڈاکٹر سر محمد اقبال کے انتقال کی خبر

لاہور ۲۱ اپریل۔ آج صبح کے ساڑھے پانچ بجے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا انتقال ہوگیا جو چند سال سے علیل اور حال ہی میں صاحب فراش ہوگئے تھے ان کی وفات غیر متوقع اور اچانک تھی۔ چنانچہ اس مشہور شاعر کے چند ایک قریبی رشتہ دار وفات کے وقت ان کے پاس تھے۔ سر اقبال گزشتہ تین سال سے دمہ میں مبتلا تھے اور گزشتہ تین مہینے سے وہ بستر علالت پر پڑے رہے۔

آج صبح کے ۵ بجے ان کی حالت یکایک دگرگوں ہوگئی اور ساڑھے ۵ بجے طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا اس طرح کہ اقبال کا سر ان کے پرانے اور وفادار خادم علی بخش کی گود میں تھا۔ چند روز قبل سر اقبال کو علم ہو چکا تھا کہ ان کی حالت بگڑتی جا رہی ہے بنابریں انہوں نے ایک وصیت نامہ تیار کر لیا۔ بہر حال صحت یابی سے بالکل مایوسی نہیں ہوگئی تھی کیونکہ چند روز قبل انھوں نے اپنی پیش نظر کتاب لکھوانے کے لئے ایک آدمی کو ملازم رکھا تھا۔

آخری الفاظ جو شاعر مشرق کی زبان سے نکلے نہایت اہم ہیں۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے "میں موت سے نہیں گھبراتا میں مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں"۔

سر محمد اقبال مرحوم کے پسماندوں میں دو لڑکے ایک لڑکی اور ایک بڑے بھائی اور تین بہنیں اور متعدد احباب اور سارے اردو فارسی داں تعدیل ہے اس شاعر کی وفات پر وقف ماتم ہوں گے۔

اقبال مرحوم کے متعلق مزید تفصیلات

یوں تو ڈاکٹروں نے کہہ ہی دیا تھا کہ مرض لا علاج ہے اور زندگی برسوں کی نہیں بلکہ مہینوں کی ہے مگر گزشتہ چار پانچ مہینوں میں اگرچہ علاج کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا لیکن حالت گرتی ہی گئی۔

مغربی طب کے ماہروں میں سے ڈاکٹر محمد یوسف خاں ڈاکٹر یار محمد خاں ڈاکٹر کیپٹن الٰہی بخش۔ ڈاکٹر جمعیت سنگھ۔ کرنل امیر چند۔ اور یونانی اطبا میں سے حکیم عبدالوہاب صاحب عرف نابینا صاحب برسوں سے مرحوم کے معالج تھے۔ حیدر آباد سے بھی آخر وقت تک دوا بھیجتے رہے اس طرف حکیم محمد حسن صاحب قرشی کے علاج سے بہت سکون ہوگیا تھا گرچہ سات روز قبل سے طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ عام طور پر کہا جاتا تھا کہ دل پھیل گیا ہے اور اس کی ایک نالی خراب ہوگئی ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات ضعف قلب کے دورے ہوتے تھے جن سے ضیق النفس کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی تھی۔ تین روز سے بلغم کے ساتھ خون آنا شروع ہوگیا تھا اور جسم کے بائیں حصے پر ورم تھا۔

۲۰ اپریل کی شام کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ حالت گرتی جا رہی ہے لیکن ساڑھے بارہ بجے تک چند عقیدت مند پاس ہی موجود رہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت سنبھلی ہوئی ہے۔ رات کو کسی قدر نیند بھی آگئی تھی۔ تین بجے کے قریب درد شروع ہوا۔ پانچ بجے کے قریب راجہ حسن اختر صاحب کو حکیم قرشی صاحب کو لانے کے لئے بھیجا گیا۔ ان کے جانے سے پیشتر علامہ مرحوم نے یہ دو شعر سنائے جو کچھ عرصہ قبل کہے گئے تھے۔

سرود رفتہ باز آید کہ ناید	نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار ایں فقیرے	دگر دانائے راز آید کہ ناید

راجہ صاحب پانچ بج کر کچھ منٹ بعد حکیم صاحب کو لانے کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ کوئی سوا پانچ بجے ایک دھکا سا محسوس ہوا۔ حضرت مرحوم کا محبوب اور دیرینہ ملازم علی بخش اس وقت سرہانے کھڑا تھا۔ چند سکنڈ ہی میں وہ زبان ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی جس نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو زندگی کا پیغام دیا تھا۔

یہ دل شکن خبر سرعت کے ساتھ سارے شہر میں پھیل گئی۔

تمام اسلامی حلقوں میں ماتم کے طور پر دکانیں بند ہو گئیں۔ لوگ جوق درجوق مرحوم کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ زمین کے لئے جگہ کے تعین کا مسئلہ بہت اہم ہو گیا تھا۔ بالآخر قرار پایا کہ شاہی مسجد کے بڑے دروازے کے باہر سیڑھیوں کی بائیں جانب کا قطعہ موزوں ہے۔ چند حضرات کا وفد ہز اکسلنسی گورنر کی خدمت میں بھیجا۔ ہز اکسلنسی سر ہنری کریک نے فوراً اجازت دی اور محکمہ آثار قدیمہ کی منظوری کا بھی اہتمام کر دیا۔ پانچ بجے گورنر پنجاب کے نمایندے کی حیثیت سے ان کے اے ڈی سی کانگ اور چیف سکریٹری و کمشنر صاحب کوٹھی پر آئے اس کے بعد ہی جنازہ اٹھایا گیا چارپائی میں لمبے لمبے بانس باندھ دیے گئے تھے تاکہ بہت سے لوگ وقت واحد میں کندھا دے سکیں۔ جنازہ پہلے اسلامیہ کالج لایا گیا۔ پھر قرار پایا کہ نماز جنازہ شاہی مسجد میں ہو جہاں مسلمان زیادہ شریک ہو سکیں۔ سات بجے کے قریب جنازہ شاہی مسجد پہنچا اور ساٹھ ستر ہزار آدمیوں نے شرکت کی اور آٹھ بجے کے قریب حضوری باغ کے کونے پر مسجد عالمگیر کے مینار کے سایے میں میت سپرد خاک کی گئی۔

علامہ مرحوم کے بڑے بیٹے آفتاب اقبال ہیں اور چھوٹے بیٹے جاوید اقبال جن کی عمر تیرہ برس کی ہے چھوٹی صاحبزادی منیرہ بانو ہے جس کی عمر صرف چھ برس ہے۔ بہت زمانہ پیشتر ہی مرحوم نے ایک وصیت نامہ مکمل کرا کے رجسٹرار کے پاس محفوظ کرا دیا تھا جس میں جاوید اور منیرہ بانو کے ولی چار اشخاص، چودھری محمد حسین ایم اے، منشی طاہر الدین، شیخ اعجاز احمد اور بچوں کے ماموں خواجہ عبدالغنی صاحب کو ٹھیرایا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے۔ بقیہ تین حضرات وصیت نامہ کی تعمیل کریں گے۔

بیانات

ڈاکٹر ٹیگور: سر محمد اقبال کی وفات نے ہمارے ادب میں ایسی جگہ خالی کر دی ہے کہ ایک کاری زخم کی طرح اس کے مندمل ہونے کے لئے ایک نہایت طویل عرصہ درکار ہے۔ ہندوستان جس کی جگہ دنیا میں بہت تنگ ہے ایسے شاعر کو نہیں کھو سکتا تھا جس کی شاعری ایسی عالمگیر قدر و قیمت رکھتی تھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو: مجھے اس واقعہ کی خبر سن کر عمیق رنج ہوا۔ کچھ ہی عرصہ قبل مجھے ان سے ایک طویل ملاقات کی عزت حاصل ہوئی تھی جب وہ بستر علالت پر لیٹے ہوئے تھے۔ اور ان کی تیز فہم و فراست اور محبت آزادی وطن کا مجھ پر بڑا اثر ہوا ان کی وفات سے ہندوستان ایک شاندار اور درخشاں ستارہ سے محروم ہو گیا لیکن ان کی عظیم الشان نظمیں آنے والی نسلوں کے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں گی اور ان میں جوش عمل پیدا کریں گی۔

سر سلطان احمد: سر محمد اقبال مرحوم کی رحلت کی خبر سن کر مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ ان کے اٹھ جانے سے ہندوستان عہد حاضر کے عظیم ترین شعراء میں سے ایک سے محروم ہو گیا ان کی شاعری میں اردو ادب کی لطافت اور حسن اور فلسفہ تصوف اور ایرانی تمدن کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی نمایندہ نظموں کا مقصد مسلمانان ہند کو ایک ایسے بلند رتبہ تک لے جانا تھا جو ان کے شاندار ماضی کے حتی الامکان قریب ہو۔ سر محمد اقبال ایک بڑے شاعر تھے لیکن میری رائے میں وہ شاعر سے بڑے فلسفی تھے وہ بجائے خود ایک جماعت تھے اور یہ سوچنا بھی ناممکن ہے کہ کوئی شخص جلد ان کی جگہ لے سکے گا۔

مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار:۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کی رخصت سے ہندوستان ایک زبردست ترین مفکر سے محروم ہو گیا ہے شاعر کی حیثیت سے چند ہی ان کے ہم پلہ تھے ان کی کئی نظمیں یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور یقیناً طور پر ان کو بین الاقوامی شہرت کا حامل تصور کیا جاتا ہے مسولینی ان کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس لئے اقبال مرحوم کی

نظمیں اطالوی زبان میں ترجمہ کرائی ہیں ان کی بعض نظموں نے ہندوستان میں ایک نئی وطنی روح پھونک دی ہے۔ ہندوستان ان کی وجہ سے مفلس ہو گیا ہے۔

نواب بہادر یار جنگ اقبال کی موت نہ صرف مسلم قوم کا بلکہ مشرق اور دنیا کا ایک عظیم اور ناقابل تلافی نقصان ہے ان کی قوئے عمل نے ان کے لئے عند الناس اور عند اللہ وہ مقام رفیع پیدا کر دیا ہے کہ ہمارے فاتحہ اور دعا سے مستغنی ہے ان کا بہترین صلہ اور ان کی سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان کے پیغام کو مشعل راہ بنائیں۔ "بانگ درا" اور "ضرب کلیم" سے چونکیں اور "اسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کو سمجھیں۔ "جاوید نامہ" کو حرز جان بنائیں اور وہ مقام پیدا کریں جہاں اقبال ہم کو دیکھنا چاہتے تھے۔

مسٹر سوباش بوس صدر کانگرس سر محمد اقبال کی وفات کے یہ معنی ہیں کہ ہندوستان کے آسمانِ ادب کے نہایت درخشاں ستاروں میں سے ایک غائب ہو گیا۔ ایک نہایت اعلیٰ درجہ کے شاعر ہونے کے علاوہ وہ ایک نادر شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی وفات سے ہمیں جو نقصان پہونچا ہے اس کو سارا ملک محسوس کرے گا۔ پچھلے دنوں ان کے سیاسی خیالات ایسے تھے کہ ہم میں بہت سے ان سے اتفاق نہیں کر سکتے تھے لیکن کسی کو ان کے خلوص کی نسبت کبھی کوئی شبہ نہیں ہوا۔ غمگینی والم کے اس موقع پر سارا ملک امڈ چکا ہے اور ہم ہندوستان کے عظیم ترین فرزندوں میں سے ایک کے احترام میں اپنے سر جھکا دیتے ہیں۔ ان کی یاد ان کے ہم وطنوں کے قلوب میں ہمیشہ جاگزیں رہے گی۔

مسٹر محمد علی جناح صدر مسلم لیگ مجھے سر محمد اقبال کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ وہ عالمی شہرت کے ایک نہایت ممتاز شاعر تھے اور ان کی شہرت اور ان کے کلام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ملک اور مسلمانوں کی انھوں نے اتنی بہت سی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ عظیم ترین ہندوستانی کے ریکارڈ سے کیا جا سکتا ہے جو کبھی پیدا ہوا ہو۔ حال تک وہ پنجاب کی صوبہ وار مسلم لیگ کے صدر تھے جب ایک غیر متوقع علالت نے انھیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ کل ہند مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے زبردست حامی تھے میرے لئے وہ ایک رہنما تھے، دوست اور فلسفی اور تاریک ترین لمحوں میں جن میں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا وہ چٹان کی طرح قائم رہے۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی کبھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا صرف تین دن قبل انھوں نے اس کامل اتحاد کا ذکر پڑھا یا سنا ہوگا جو کلکتہ میں پنجاب کے مسلم قائدوں کے مابین ہو گیا اور آج میں فخر و مباہات کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ پنجاب پورے طور پر لیگ کے ساتھ اور مسلم لیگ کے علم تلے آ چکے ہیں جو یقیناً سر اقبال کے لئے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس مفارقت میں میری نہایت مخلصانہ اور عمیق ترین ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں اس نازک وقت میں ہندوستان کو اور خصوصاً مسلمانوں کو ایک عجیب نقصان پہنچا ہے۔

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مجھے سر محمد اقبال کی وفات کی خبر سن کر سخت صدمہ ہوا۔ صرف دو مہینے پہلے میں لاہور میں ان سے ملا تھا۔ ان کا شمار دنیا کے موجودہ عظیم ترین شعراء میں سے تھا۔ فارسی اور اردو شاعری پر کامل عبور و قابلیت رکھتے تھے۔ اور گزشتہ تیس سال سے میں نہایت وسیع النظر شاعر و مفکر کی حیثیت سے ان کی قدر کر رہا ہوں۔ ان کی وفات سے ہندوستان ایک عظیم الشان ثقافت اور ایک عظیم الشان شاعر سے محروم ہو گیا۔ مجھے ان کے خاندان سے ہمدردی ہے۔

تعزیتی جلسے

انجمن خواتین دکن

یکشنبہ ۱۷ اپریل پانچ بجے ہمایوں نگر کے مدرسۂ صفدریہ میں تعزیتی جلسہ ہوا معزز خواتین اور مدرسہ کی طالبات شریک تھیں بسنو ہمایوں مرزا صاحبہ کی تحریک اور بیگم بہادر یار جنگ کی تائید سے بیگم ممتاز یار الدولہ صدر نشین ہوئیں۔ بسنو ہمایوں مرزا صاحبہ نے رزولیوشن پیش کرتے ہوئے سر محمد اقبال کے حالات زندگی بیان کئے۔ ان کی تائید میں مسز صوفی صاحبہ نے تقریر کی بعد میں راحت النساء بیگم صاحبہ بنت محمد غوث صاحب نے سر محمد اقبال کے متعلق تقریر کی۔

جمعیت مسلم نونہالان سکندرآباد

مولوی یوسف خاں صاحب کی صدارت میں

جلسہ منعقد ہوا جس میں ارکان و دیگر حضرات کافی تعداد میں شریک تھے بسٹر غوری نے اپنی تقریر کے آغاز میں کہا ہندوستان اور خصوصاً دنیائے اسلام کے لئے شاعر اعظم کی جدائی ایک سانحہ عظیم ہے۔ اقبال کا کلام مسلمانوں کو مرنے کی تعلیم نہیں دیتا ہے گو آج اقبال ہم سے جدا ہو گئے لیکن ان کا پیام ابھی موجود ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ جوش اور تڑپ پیدا کریں جو اقبال کے کلام میں موجود ہے۔ مسٹر برہان اللہ نے کہا کہ علامہ اقبال کی موت مشرق اور اہل مشرق کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ مسٹر فیاض علی بیگ نے ایک مقالہ پڑھا جس میں علامہ اقبال کے کلام اور حالات زندگی پر تبصرہ اور ان کے انتقال پر اظہار تاسف کیا گیا مولوی یوسف علی خاں صاحب نے کہا کہ اقبال کی روح کو اسی وقت مسرت حاصل ہو سکتی ہے جب کہ مسلم نوجوان اقبال کے پیام کو پیش نظر رکھ کر میدان عمل میں مجاہدانہ استقلال کے ساتھ گامزن ہو جائیں گے۔ صدارتی تقریر کے اختتام پر صدر نے حسب ذیل قرارداد پڑھ کر سنائی جس کو حاضرین نے کھڑے ہو کر منظور کیا۔

"علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات ہندوستان اور خصوصاً دنیائے اسلام کے لئے ایک سانحۂ عظیم ہے ہم جمیع اراکین مسلم نونہالان سکندرآباد مرحوم کی اس بے وقت وفات پر انتہائی تاسف کا اظہار کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ شاعر عظیم نے اپنے الہامی کلام سے اس دنیائے اسلام کے لئے جو خود فراموشی کی گھنگھور گھٹاؤں میں گم کردہ راہ تھی۔ پورے مجاہدانہ جوش کے ساتھ قوم کے ہاتھ میں خودی کی ایک مشعل دیدی جس سے دلوں کی تاریکی میں امید کی کرن پیدا ہوئی اور اسلامی بے خودی خودی سے بدل گئی۔ اس لئے اگر علامہ اقبال کو اسلام کی روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔"

مدرسۂ فوقانیہ دارالشفاء

کی جانب سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات حسرت آیات کا تعزیتی جلسہ

مولوی سید نور الحسن صاحب بی اے ایل ٹی ہیڈ ماسٹر کی صدارت میں منعقد ہوا جلسہ کا آغاز مرزا حیدر حسین صدر بزم ادب و متعلم جماعت دہم کی تقریر سے ہوا۔ صدر جلسہ نے فرمایا کہ "اقبال کے مطالعہ کی فرصت مجھے بہت کم نصیب ہوئی ہے جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو نصاب میں اقبال کی نظمیں بھی تھیں اور اسی سے اقبال کو جاننے لگا تھا۔ اقبال کی عظمت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی وفات پر دنیا کے ہر گوشے سے تاسف کا اظہار کیا جا رہا ہے۔" آخر میں کرسی صدارت سے تحریک تعزیت پیش ہوئی جس کو حاضرین نے استادہ ہو کر منظور کیا۔

کیمبرج یونیورسٹی مسلم سوسائٹی

کیمبرج کے مسلم طلبا ۲۲ اپریل کو جمعہ کی نماز کے لئے اکٹھا ہوئے اور انھوں نے مشرق کے زبردست فلسفی اور شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کی وفات پر اظہار رنج کیا ایک قرارداد منظور کی۔ نماز کے بعد نماز جنازہ پڑھی گئی

پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن

زیر صدارت

یہاں عبدالحی صاحب وزیر تعلیم حکومت پنجاب برکت علی اسلامیہ ہال بیرون موچی دروازہ میں منعقد ہوا۔ ہال طلبا اور معززین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں علامہ موصوف کے سوانح حیات، فلسفہ، روشن خیالی اور تعلیم اسلامی پیش کرتے ہوئے ان احسانات پر اظہار خیال کیا جو علامہ مرحوم کے ذریعے سے قوم کو حاصل ہوئے انھوں نے کہا کہ لوگ مرحوم پر روپیوں کی بارش کرتے تھے اگر وہ چاہتے تو اپنی قابلیت کے عوض تمام دنیا کی دولت جمع کر سکتے تھے لیکن انھوں نے اس کی پروا نہ کی وہ سادہ زندگی پسند کرتے تھے۔ اور اخیر وقت تک سادہ زندگی بسر کی جب آپ کی زندگی میں یوم اقبال منانے کی تجویز پاس ہوئی تو اس کے ساتھ ایک تجویز یہ بھی تھی کہ ایک ایک ہزار روپے دینے والے ایک سو معطیوں سے ایک لاکھ روپیہ جمع کر کے علامہ اقبال کی خدمت میں تھیلی پیش کی جائے۔ مگر آپ نے اس تجویز کو پسند نہ کیا اور کہا کہ اگر یہی ارادہ ہے تو یہ روپیہ اسلامی تعلیم اور اسلامی مشن پر خرچ کیا جائے۔ انھوں نے اپنی زندگی میں دولت کی کبھی پروا نہیں کی۔ وہ اپنی قابلیت اور لٹریچر کے لحاظ سے زندۂ جاوید ہیں۔ اس کے بعد ملک برکت علی صاحب ایم ایل اے نے علامہ اقبال کے سوانح حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ مرحوم نے ملت کی بڑی خدمات کی ہیں انھوں نے مشرقی اور مغربی تخیل کو اسلامی رنگ میں پیش کیا۔ علامہ اقبال کی تعلیم لازوال اور اقبال زندۂ جاوید ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ شجاع اللہ خاں صاحب نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شخصیت اسلامیت جذبۂ حب وطن اور جذبۂ حب اسلام ایسی چیزیں ہیں جن کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔ آپ کی دلی خواہش تھی کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک نقطہ پر آ جائیں۔

اسٹاف یونین آف دی سنٹرل ایکسچینج بنک لمیٹڈ کے ارکان نے قیام یادگار کا سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے

اسلامیہ کالج پشاور اسٹاف اور طالب علموں کا ایک غیر معمولی جلسہ زیر صدارت عبدالحی صاحب طالب علم بی اے کلاس منعقد ہوا۔ پروفیسر شیخ محمد تیمور صاحب نے علامہ موصوف کی شاعری اور فلسفہ پر ایک مبسوط تقریر کی۔

بزم احباب کی جانب سے شاعر مشرق علامہ اقبال کی وفات کا تعزیتی جلسہ ۲۳ خورداد کو منعقد ہوا۔

انجمن مسلم نوجوانان گلبرگہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم کا جلسۂ تعزیت زیر صدارت مولوی مرزا حسین احمد بیگ صاحب ایچ سی ایس ناظم عدالت صوبہ گلبرگہ منعقد ہوا۔ جس میں مولوی محمد احمد خاں صاحب وکیل ہائیکورٹ نے "اقبال بحیثیت مصلح قوم" کے عنوان پر تقریر کی مولوی سید عزیز حسین صاحب شوق عابدی نے ایک نظم سنائی۔

حیدرآباد کا سب سے بڑا تعزیتی جلسہ

مسز سروجنی نائیڈو کی صدارت میں ۲۷ خورداد کی شام میں پونے پانچ بجے سے زمرد محل تھیٹر میں علامہ اقبال مرحوم کا تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ تھیٹر اصحاب و خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا یہ جلسہ سوم مسلم نوجوانان دکن کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں حسب ذیل پیامات پڑھے گئے۔

ہز ہائی نس ولیعہد بہادر شہزادہ برار "مہربانی فرما کر ہندوستان کے ایسے سپوت اور مشہور شاعر کی رحلت پر میری طرف سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کر دیجیے۔ ان کی تصانیف ہمیشہ ان کی یاد تازہ کرتی رہیں گی۔"

والاشان نواب معظم جاہ بہادر "ڈاکٹر اقبال کی

افسوس ناک رحلت مسلمانوں کے لیے ناقابل تلافی نقصان اور دنیائے ادب پر ایک ناقابل فراموش ضرب ہے۔"

رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری — اقبال کی رحلت سے ہندوستان اور بیرون ہندوستان نے اپنی ایک انتہائی حیات بخش آواز کھو دی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کی ممتاز صدارت میں حیدرآباد اس کے نقصان پر اپنے شایان شان اظہار رنج کریگا۔ خدا کرے کہ اقبال کے پیغام کے ذریعہ ہمارا ملک اپنی روح حاصل کرے۔

سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور — گو میں بہت دور ہوں مجھے اجازت دیجئے کہ اردو اور فارسی کے ایک عظیم المرتبت شاعر کی یادگار میں جو جلسہ منعقد ہو رہا ہے اس میں روحانی طور پر آپ لوگوں کے ساتھ شریک ہوں اور یہ بہت موزوں و مناسب بات ہے کہ حیدرآباد جو اردو زبان اور ادب کا خاص مرکز ہوتا جا رہا ہے اس عظیم المرتبت شاعر اور فلسفی کی وفات پر اس انداز میں اظہار افسوس کرے۔ سر محمد اقبال نے اردو شاعری پر ایک پاکیزہ اثر ڈالا ہے۔ اردو زبان کے ساتھ ان کا نام بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب — ڈاکٹر سر محمد اقبال کی رحلت سے مشرق کا سب سے بڑا فلسفی اور شاعر جاتا رہا جو ناقابل تلافی نقصان ہے۔ پنجاب اس عالمگیر اظہار تاسف و ہمدردی کی قدر کرتا ہے جو اس کے نقصان عظیم میں کیا گیا۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ — ڈاکٹر اقبال کی رحلت سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ میں دلی رنج و ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔

راجہ صاحب محمود آباد — اسلام کے عظیم المرتبت فلسفی اور شاعر سر محمد اقبال کی رحلت اس درجہ مایوس کن ہے کہ اس کی اصلیت کو ہم پوری طرح محسوس نہیں کر سکتے ان کی آواز آئندہ ہمیں سنائی نہ دے سکیگی مگر ان کا حیات بخش پیغام روزافزوں طاقت کے ساتھ گونجا کرے گا میں حیدرآباد کے نوجوان مسلمانوں کے ساتھ ان کے ماتم میں شریک ہوں۔

ڈاکٹر سید محمود — ڈاکٹر اقبال کی رحلت ایک عظیم قومی نقصان ہے آج ہمارا ہندوستان ان کی وفات کے لئے ماتم کر رہا ہے۔ ان کی تصانیف ہمیشہ کے لئے یادگار رہیں گی۔

محمد علی جناح — میں اس تعزیتی جلسہ میں آپ کا شریک ہوں۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے اقبال کے کھونے کے غم میں میں برابر کا حصہ دار ہوں۔

مرزا یار جنگ بہادر — اقبال ہمیشہ دل کے فلسفہ میں غرقاب رہتے تھے اور شاعری کو انھوں نے جذبات دل کی اظہار کا ایک آلہ بنا رکھا تھا ان کی اصل غرض اور نیت اظہار شاعری نہیں تھی جب ان کے دل کی آگ اٹھتی تھی تو وہ اس کو شاعری سے بجھاتے تھے۔ ایسی ہستی کی وفات سے میرا دل بھی تڑپ رہا ہے۔

سر امین جنگ بہادر — ڈاکٹر سر محمد اقبال کی ہستی ہندوستان میں تو کیا تمام علمی دنیا میں مسلم اور نادر کی ایک تھی۔ انھوں نے نہ صرف شاعری و فلسفہ میں مسلمانوں کا بول بالا کیا تھا بلکہ قوم کے لئے ایسے نمایاں کام کئے جو ان کے ترانے کے مانند کبھی نہیں بھولے جا سکتے۔ "اسرار خودی" جو انھوں نے اپنی ایک مثنوی اور چند انگریزی لکچروں میں ظاہر کئے وہ میری رائے میں ایسے ہیں جو اگر اس زمانے میں نوجوان سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہوں تو مسلمانوں کو ترقی کے بڑے سے بڑے زینہ پر پہونچا دیں گے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (منتخب ادارۂ ادبیات اردو) — اقبال کی وفات وہ سانحۂ عظیم ہے جس پر بلاد مشرق اندر خاکستر دنیا

جتنا ماتم کرے کم ہے۔ اس شاعر اعظم نے اردو زبان کی حقیقی عظمت کو بے نقاب کر دیا اور اپنے بلند پایہ کلام کے ذریعہ سے ثابت کر دکھایا کہ یہ زبان دنیا کی بڑی سے بڑی اور ترقی یافتہ زبانوں کی ہم پلہ ہے اور نکل سے مشکل اور اہم سے اہم فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کی متحمل ہو سکتی ہے۔

اردو شاعری کو عصر حاضر کی ضروریات کے مطابق بنا کر اردو ادبیات کی تاریخ میں اقبال نے قلیل عرصہ میں جو زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے، اس کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ اردو کو اقبال جیسا محسن شاید پھر کبھی صدیوں ہی میں مل سکے گا۔ ادارہ ادبیات اردو نے اپنے ماہنامہ سب رس کا آئندہ شمارہ اسی شاعر اعظم کے سوانح حیات اور خصوصیات کلام کے لئے وقف کر دیا ہے اور موتمر مسلم نوجوانان حیدرآباد کی ان مساعی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جن کی بنا پر آج یہ جلسہ تعزیت دکن کی ایک قابل فخر ہستی کی صدارت میں منایا جا رہا ہے۔ اپنے باکمالوں کی صحیح قدر و منزلت کرنا ہر قوم کا فرض اولین ہے، اور جو لوگ اس فرض سے واقف ہو جاتے ہیں وہ شاہراہ ترقی سے کبھی نہیں بھٹک سکتے۔

اقبال نے جس تہذیب کی نمایندگی کی اور جو پیغام تمام دنیا کو پہنچایا۔ اس سے اہل حیدرآباد کو خاص طور پر تعلق ہے کیونکہ عصر حاضر میں یہی ایک ایسا خطہ رہ گیا ہے جس کی نظیر مشرق و مغرب میں کہیں نہیں مل سکتی اور تین ماہ قبل کے یوم اقبال اور آج کے اس جلسہ تعزیت نے ثابت کر دیا کہ حیدرآباد کے نوجوان اپنے ملک کی اس اہمیت سے ناواقف نہیں ہیں اور اقبال کے پیغام کو سمجھنے اور اس کی ہدایتوں پر عمل پیرا ہونے کی خاص صلاحیت رکھتے ہیں۔

— **نواب مہدی یار جنگ بہادر** نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ سر محمد اقبال کا دنیا سے اٹھ جانا ناقابل تلافی نقصان ہے یوں تو دنیا میں بہت سے انسان پیدا ہوتے ہیں لیکن اقبال جیسی عظیم ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ اقبال صفات اور خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ اقبال شیدائے وطن تھے حب وطن کا جذبہ ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ گو اقبال مسلمان تھے۔ لیکن ان کا پیام سارے ہندوستان کے لئے تھا۔ وہ پورے ملک کے ترجمان تھے۔ مجھے ان سے تین چار مرتبہ ہی ملاقات کی سعادت ملی۔ ان کی صحبت فیض بخش تھی۔ اب ان کا جانشین ہونا محال ہے۔

— **راجہ پرتاب گیرجی** نے ہندوؤں کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا کہ ہندو مسلمان پارسی عیسائی کون ایسا ہے جو اقبال کو نہیں چاہتا۔ اقبال ہے تو سب کچھ اقبال نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو اس نہ مٹنے والے اقبال پر شیدا ہوا ہوں۔ جو نہ صرف اپنے میٹھے میٹھے راگوں سے دلوں کو موہ رہا تھا بلکہ اپنے پرجوش ترانوں سے خدا کی مخلوق کو غفلت کی نیند سے جگا رہا تھا۔ وہ روحانیت کی نشہ میں چور تھا کہ جو اس کے نشہ کو دیکھے خود بخود مخمور ہو جائے یعنی وہ رند بھی تھا اور زاہد بھی اور شاعر بھی تھا اور متقی بھی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کا بانی رہا ہے۔

— **ڈاکٹر یوسف حسین خاں** نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف لیڈر تھا بلکہ نغمہ طراز تھا اس نے اپنے گیت سے نوجوانوں کو بیدار کیا موت نے اسے ہم سے چھین لیا۔ لیکن اقبال کا پیام مسلمانان ہند اور اسلام کے ساتھ باقی رہے گا۔ اقبال کا فلسفہ خودداری کا فلسفہ تھا بہت خود اشعار کے ذریعہ ثابت کیا کہ اقبال وطن پرست شاعر تھا اور اس کا دل حب وطن سے لبریز۔

— **ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم** نے کہا کہ ہر شخص کی دنیا میں دو حیثیتیں ہوتی ہیں ایک پبلک حیثیت یعنی شہرت اور دوسری ذاتی و شخصی حیثیت مجھ کو علامہ اقبال سے اسی دوسری حیثیت سے بہت قریبی اور گہرا تعلق رہا۔ ان کی صحبت سے گوناگوں فیض اٹھاتا رہا۔ فلسفہ کا ذوق شاعری کا ذوق اور آزادی فکر اور تقریر کا ذوق مرحوم کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے جب میں لاہور سے حیدرآباد آیا تو میری یہ فیض یابی کچھ کم ہو گئی۔ ایک وقت میں

پانچ بجے شام سے گیارہ بجے رات تک اقبال کے ساتھ رہا اور اقبال برابر میرے سوالات کا پیشانی پر شکن ڈالے بغیر جواب دیتے رہے اور اسی دوران میں مجھ سے کہا کہ دیکھو میں ایک گر بتاتا ہوں انسان میں جب تک نئے خیالات قبول کرنے کی صلاحیت ہے وہ زندہ ہے اور جب اس میں نئے افکار کو قبول کرنے کی استعداد ختم ہو گئی اور وہ اپنے پچھلے خیالات میں چکر کھانے لگا تو سمجھو کہ وہ مر گیا۔"

اقبال کی زندگی کے دو پہلوؤں پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا۔ ایک ان کی سادگی اور دوسرے مساوات! اقبال کی زندگی اتنی سادہ تھی کہ انہیں اس کی تک خبر نہیں رہتی تھی کہ ان کے پاس کتنے کپڑے رہ گئے ہیں، کتنے پھٹ گئے اور پرانے ہو گئے ہیں۔ کینوس کی ایک کرسی تھی جس پر وہ بیٹھا کرتے اور ایک چار پائی تھی آخر عمر میں چار پائی پر ایک تکیہ رکھ لیا کرتے تھے۔ ان سے ملاقات کے لئے کوئی وقت مقرر نہ تھا ان کا دروازہ چوبیس گھنٹے ہر بڑے چھوٹے اعلیٰ و ادنیٰ کے لئے کھلا رہتا۔ معمولی انسان اور طلبا بھی آتے، اور سیاست داں اور ناشر بھی اور اقبال کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ سب کے ساتھ مساوی گفتگو کرتے تھے۔ ہر ایک کی باتوں کا جواب دیتے اور اگر کسی کی زبان سے دلچسپ بات نکلتی خواہ کسی درجہ کا شخص ہو اس پر زیادہ توجہ کرتے۔ ہر ملاقاتی سے وہ اس کے مذاق کے مطابق گفتگو کرتے اور ہر شخص ان سے ایک نہ ایک نکتہ یا جوہر خیال حاصل کر لیتا تھا۔ اقبال کے وفادار ملازم علی بخش کا ذکر کیا جو تیس سال تک اقبال کی خدمت انجام دیتا رہا۔

"علی بخش نے شادی تک نہیں کی محض اس خیال سے کہ کہیں وقت نہ بٹ جائے اور جب اقبال مجھے آواز دیں تو میں موجود نہ رہوں۔" اقبال نے اسی ملازم کی گود میں اپنی آخری سانس لی۔

— **نواب کیقباد جنگ بہادر** نے پارسیوں کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا کہ آج ہم اس ناقابل تلافی نقصان پر اظہار افسوس کے لئے جمع ہوئے ہیں جو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی المناک موت نے نہ صرف ملک ہند یا ملت اسلامیہ پر بلکہ پوری متمدن دنیا پر ڈھایا ہے۔ اقبال ہند کو اپنا وطن اور اہل ہند کو اپنا ہم قوم سمجھتے تھے۔ کلام کا نمونہ پیش کرتے ہوئے اقبال کی وطن اور قوم پرستی کا مکمل ثبوت پیش کیا۔ آخر میں کہا کہ اقبال کے دل میں ہند اور اہل ہند کی سچی محبت جاگزیں تھی البتہ اظہار محبت کے طریقہ میں تجربہ کی پختگی اور دور ایام نے تبدیلی پیدا کر دی۔ اس جلسہ میں ماہر صاحب، امجد حسین نعمان صاحب، حبیب اللہ صاحب اوج اور مخدوم محی الدین صاحب نے اپنی نظمیں سنائیں اور خلیق احمد صاحب نعمانی نے ایک موثر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی رحلت دنیائے انسانیت کے لئے ایک اندوہناک سانحہ ہے جس نے بنی نوع انسان کے دلوں میں گہرا ناسور ڈال دیا ہے۔ اقبال کا پیام اور جملہ پہلوان سیرت [illegible] کا موضوع ہے۔ اس تقریر کے بعد یہ شاندار جلسہ ختم ہوا۔

علامہ اقبال کی وفات سے متعلق جو تفصیلات اور بیانات شایع ہوئے۔ ان کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے۔ خصوصاً حیدرآباد میں جو تعزیتی جلسے ہوئے ان کی روداد تقاریر کے اقتباسات اور نظموں کو بھی گزشتہ صفحات میں شایع کیا گیا ہے تاکہ آئندہ جو بھی علامہ مرحوم کے متعلق کام کرنا چاہیں تو ان کو زیادہ سے زیادہ مواد ایک جگہ مل سکے۔

خواجہ حمید الدین شاہد

اقبال کی نسبت میرے ذاتی تاثرات

مدت سے میری خواہش تھی کہ اقبال کی نسبت اپنے ذاتی تاثرات کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کروں مگر میری فطری کاہلی اس خواہش کی تکمیل میں مانع ہوتی رہی۔ مجھے اس کا افسوس ہے بہت سخت افسوس ہے۔ اب وہ شاعرِ اعظم وہ عظیم المرتبت انسان اس عالمِ فانی سے کوچ کر گیا ہے اور وقت گزر جانے کے بعد اپنے تاثرات قلمبند کرنے بیٹھا ہوں۔ کاش! میں یہ کام اس کی زندگی ہی میں انجام دے لیتا۔ آہ! اگر میں ایسا کر سکتا تو اس مضمون کی ایک سطر بلکہ ایک ایک لفظ لکھتے وقت کتنی مسرت اور کتنا لطف محسوس کرتا۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب پچھتانے سے کیا فائدہ ہے۔ آج میں اپنی کاہلی اور اپنے اوپر نفریں کرتے ہوئے اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی کوشش کرتا ہوں۔ اقبال کی شاعری سے میں پہلی مرتبہ کس طرح روشناس ہوا اور اس کا مجھ پر کیا اثر پڑا یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے اس لئے کسی قدر تفصیل سے اس کو سپردِ قلم کرتا ہوں۔

بچپن کا ذکر ہے جس کو شاید ایک قرن سے کچھ زیادہ ہی عرصہ گزرا ہے کہ میں دادا جان کی کتابوں کی الماری کھول کر پرانی کتابوں کو الٹ پلٹ کر رہا تھا اتفاقاً رسالہ "مخزن" کا ایک بوسیدہ اور کرم خوردہ نمبر میرے ہاتھ لگا اور میں بڑے اشتیاق سے اس کی اوراق گردانی کرنے لگا۔ اس نمبر میں اقبال کی ایک نظم کوہِ ہمالہ موجود تھی۔ میں نے اس نظم کو شروع سے آخر تک دیکھا۔ اگر میں اپنے ان تاثرات کو جو اس نظم کو پڑھنے سے میرے دل و دماغ پر مرتب ہوئے ضبطِ تحریر میں لاؤں تو معلوم نہیں کتنے صفحے سیاہ ہو جائیں۔ مختصر یہ کہ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے ایک نئی دنیا اپنی تمام رنگا رنگیوں اور اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ موجود ہو گئی ہے جس کو میں نے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا اور جس کے دیکھنے کی مجھے کوئی توقع ہی نہیں تھی۔ مجھے شعراء اور ان کے کلام سے آغازِ طفولیت سے ہی بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس زمانے میں بھی میں کسی نہ کسی حد تک میرؔ اور سوداؔ، انشاءؔ اور مصحفیؔ، غالبؔ اور ذوقؔ، انیسؔ اور دبیرؔ، داغؔ اور امیرؔ کے کلام سے واقف ہو چکا تھا لیکن اقبال میرے لئے بالکل نیا شاعر تھا اور اس کی شاعری میرے لئے ایک ایسی چیز تھی جس کی مثال مجھے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ کوہِ ہمالہ والی نظم میں اقبال نے فطرت کے حسن کی نقاشی کی ہے۔ میں چونکہ اس حسن کا بچپن ہی سے نہ صرف قدر دان بلکہ پرستار ہوں یہ نقاشی مجھے بڑی دلچسپ اور دلکش نظر آئی۔ میں جب اس شعر پر پہنچا۔

برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالم تاب پر

تو میری عجیب حالت ہو گئی۔ میرا تخیل پرواز کرنے لگا اور آن کی آن میں میں نے اپنے کو کوہِ ہمالہ کے دامن میں پایا۔ تخیل کی آنکھوں سے میں نے دیکھا کہ کوہِ ہمالہ میرے سامنے برف کی "دستارِ فضیلت" باندھے کھڑا ہے۔ جس پر "مہرِ عالم تاب" کی ہزارہا کرنیں جگمگ جگمگ کر رہی ہیں۔ آہ! بچپن کا تخیل بھی کتنا طاقتور اور کتنا پُرلطف ہوتا ہے۔

میں نے اس نظم کو کئی مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھا اور نہیں کہہ سکتا کہ کتنا لطف اٹھایا۔ اس دن سے آج تک اگرچہ اس کو ایک زمانہ گزر چکا ہے میں اس نظم کو کم از کم مہینہ میں ایک مرتبہ بلکہ بعض اوقات ہفتہ میں دو چار مرتبہ پڑھ لیتا ہوں اور ہر دفعہ اپنے اندر ایک طوفانِ مسرت محسوس کرتا ہوں۔ یہی وہ واقعہ ہے جس کے باعث میں اقبال کی شاعری سے پہلی مرتبہ روشناس ہوا۔ اس وقت سے اب تک مجھے اقبال اور اس کی شاعری سے بڑا شغف رہا ہے۔ اس کے بعد کا ذکر ہے کہ میں اپنے والد اور خاندان کے ساتھ ایک ضلع میں رہا کرتا تھا۔ ہمارا مکان بستی سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے قریب چند مزدور اور باغبان تو رہا کرتے تھے مگر کسی ایسے شخص کا مکان نہیں تھا جس سے یا جس کے خاندان سے میں اپنی مجلسی حیثیت کے

سب رس

جولائی ۱۹۳۰ء

لوگوں سے ربط پیدا کر سکی۔ اس زمانہ میں میرے بڑے بھائی علیگڑھ میں زیر تعلیم تھے اور والد بالعموم دورے پر رہا کرتے تھے۔ میں مجبور تھا کہ بڑی حد تک اپنی زندگی کو تنہائی میں گذاروں اور اپنی مرضی کے مطابق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہوں۔ سارہ والد نے میری صحت کی خرابی کے باعث مجھے کسی مدرسہ میں شریک نہیں کرایا تھا اس لئے میں آزادی سے اپنی پسند کے موافق کتابوں کا مطالعہ کرتا رہتا تھا اور جب اس کام سے طبیعت اکتا جاتی تھی تو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہو جایا کرتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لئے بڑا نازک اور طوفانی تھا کیونکہ میں آغاز شباب کی خطرناک منزل میں داخل ہو رہا تھا۔ آغاز شباب کا زمانہ انسان کی زندگی میں کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ اس دور میں انسان طفلانہ کھیلوں اور اپنے کم عمر دوستوں سے کچھ بیزار ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ بڑے لوگوں کی مجلسوں اور کھیلوں میں آزادی کے ساتھ شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ فطرتاً اس زمانے میں انسان کو تنہائی کا تلخ احساس ہوتا ہے اور دنیا کی بندشوں کے خلاف اس کے دل میں بغاوت کے جذبات بڑی شدت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ یوں بھی ایک انسان کے دل میں تنہائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے میرے دلی جذبات کی کیا کیفیت ہوگی میں حقیقی معنوں میں بالکل تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔ ایک طرف تو میرے چھوٹے بھائی بہن مجھ سے بہت زیادہ کم عمر تھے اس لئے میں ان کے ساتھ رات دن کھیل میں مصروف رہ کر اپنے وقار کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور دوسری طرف جن لوگوں سے مثلاً ملازمین وغیرہ سے مجھے سابقہ پڑتا تھا۔ میں ان کے ساتھ بھی بلا تکلف اور بغیر اذیت محسوس کئے ہوئے اپنا زیادہ وقت نہیں گذار سکتا تھا۔ یہ زمانہ میری زندگی کا بڑا نازک دور تھا جس میں قوس قزح کی رنگینیاں بھی تھیں اور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی۔ اس زمانے میں میرے دل کی دنیا پر کبھی آفتاب عالم تاب کی ہزاروں کرنیں جگمگاتی تھیں اور کبھی سیاہ بادلوں کی وحشتناک تاریکی بھی چھا جاتی تھی۔ میں اس زمانے میں ذہنی اعتبار سے بھی اور مادی اعتبار سے بھی سخت ہولناک تنہائی کی مصیبتیں برداشت کیا کرتا تھا اگرچہ اس زمانہ کو ایک طویل عرصہ گذر چکا ہے لیکن مجھے اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں اپنا دل بہلانے کے لئے کیسی کیسی دلچسپ ترکیبیں نکالا کرتا تھا۔ کبھی تو بلند درختوں پر چڑھ کر بیٹھ جاتا تھا اور نیلگوں آسمان کی طرف گھنٹوں ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی ندی کے کنارے جا کر چھوٹے چھوٹے ریت کے ذروں کو جمع کرتا تھا اور پانی کی لہروں کو گن گن کر وقت کاٹا کرتا تھا۔ کبھی اشعار گنگنانا تھا اور کبھی یہ تصور کرکے کہ میرے سامنے ہزاروں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں حسن فطرت پر برجستہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ لیکن یہ تمام ترکیبیں بھی میرا دل بہلانے کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوتی تھیں۔ میں بالآخر سخت مایوسی اور کوفت کی حالت میں اپنے پلنگ پر جا لیٹتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے سے سوال کرتا تھا کہ آخر اللہ میاں نے مجھ کو کیوں پیدا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب مجھے کیا ملتا۔ میں اس زمانہ کو آج تک یہی سوال کرتا چلا آ رہا ہوں لیکن ابھی تک اس کا کوئی جواب نہیں ملا ہے اور نہ آئندہ ملنے کی توقع ہے۔ خیر اس زمانے کا ذکر ہے کہ میں اردو نظم و نثر کی کتابیں بڑی کثرت سے اور بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اقبال کے کلام سے واقفیت کے متذکرہ صدر واقعے کے بعد سے مجھے اس کے کلام سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میں کتب فروشوں کی فہرستوں کو باستیعاب دیکھا کرتا تھا اور جہاں کہیں اقبال کی کسی نظم کے شائع ہونے کی کیفیت معلوم ہوتی تو فوراً ذریعہ وی۔ پی اس نظم کو منگوا لیتا تھا۔ اس زمانہ میں بانگ درا شائع نہیں ہوئی تھی۔ اقبال کی چھوٹی چھوٹی نظمیں مرغوب ایجنسی لاہور سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اس ایجنسی سے شکوہ، جواب شکوہ، تصویر درد اور شمع و شاعر منگوائیں اور روزانہ ان کا مطالعہ وظیفے کے طور پر کیا کرتا تھا۔ شروع ہی سے مجھے اس کا کامل احساس ہو گیا تھا کہ اقبال کی شاعری میری روح کی آواز ہے۔ جب کبھی اقبال کی کوئی تازہ نظم وصول ہوتی تو میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہتی۔ میں کسی درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور گھنٹوں اس کا مطالعہ کرتا رہتا۔ اس وقت مجھے نہ تو نیلگوں آسمان کو دیکھنے کا خیال آتا اور نہ ندی کے کنارے جا کر ریت کے ذروں کو جمع کرنے کا۔ جب تک اقبال کی نظم میرے ہاتھ میں رہتی، میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ ایک بہت بڑی نعمت غیر مترقبہ میرے ہاتھ لگی ہے۔ اس زمانہ میں مجھے اقبال کی اکثر طولانی نظمیں زبانی یاد ہو گئی تھیں اور میں تنہائی کے

تلخ ترین احساس کو مٹانے کے لیے ان کو اکثر پڑھا کرتا تھا۔ خاص کر شیخ رشاعر کے یہ دو اشعار ؎

در جہان مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم — نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ
مدتے مانندِ تو من ہم نفس می سوختم — در طوافِ شعلہ ام بالے نہ زد پروانۂ

میری زبان پر ہمیشہ جاری رہتے تھے۔ میں شام کے وقت وسیع میدان میں تنہا جادہ پیمائی کرتے ہوئے ان اشعار کو بڑے سوز و گداز سے پڑھا کرتا تھا اور مجھے ان سے ناقابلِ بیان تسکین حاصل ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ایسے لمحوں میں جب مجھے اپنی تنہائی کا احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا تو مذکورہ بالا دو اشعار خود بخود میری زبان پر جاری ہو جاتے تھے اور میں اپنے دل سے کہتا تھا کہ دنیا میں ایک تو ہی ایسا نہیں ہے جو تنہائی کی جانفرسا تکالیف برداشت کر رہا ہے۔ خود ڈاکٹر اقبال کو بھی اس مصیبت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس تصور کے ساتھ ہی مجھے بڑی تسکین حاصل ہوتی تھی اور میں اپنے اندر ایک حیاتِ تازہ محسوس کرتا تھا جو زندگی اور اس کے سارے مصائب کو بہ آسانی برداشت کر سکتی ہے۔ یہ زمانہ بدل گیا۔ میری زندگی کا یہ نازک دور گذر گیا۔ آغازِ شباب کا عجیب و غریب اور رنگین عہد اپنی تمام طفلانہ دلچسپیوں کے ساتھ اختتام کو پہنچ گیا، اور میں اب شباب کی مست و مخمور اور دلکش سرحد میں داخل ہوا۔ حالات بھی بدل گئے۔ مجھے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ ایک خوش نصیبی کی بدولت میں میٹرک کامیاب ہو گیا۔ اور مجھے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی یہاں میرے لئے دوستوں کی کچھ کمی نہیں تھی۔ پورے کالج میں مجھے ہر طرف اپنے دوست ہی دوست نظر آتے تھے۔ میں نے تہیہ کیا کہ تقدیر نے جس نعمت سے (یعنی دوستوں سے) مجھے آغازِ شباب میں محروم رکھا تھا، اب اس کو حاصل کروں اور اس طرح حاصل کروں کہ آج تک کسی نے اس طرح حاصل نہ کیا ہوگا۔ میں نے اپنے دوستوں کے حلقے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی دل میں ٹھان لی۔ مجھے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ چند ماہ کے اندر میرے دوستوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ انٹرمیڈیٹ سال اول سے لے کر ایم اے سال آخری تک ہر جماعت میں مجھے اپنے چند دوست مل گئے۔ اب میں تنہائی سے سخت بیزار ہو گیا تھا اور حتی الامکان اپنے کو اس خطرہ سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس زمانہ میں میں تنہا بیٹھ کر کبھی کتابوں کا مطالعہ نہ کرتا تھا، بلکہ جہاں تک بھی ممکن ہوتا دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ امتحان کی تیاری بھی پانچ چھ دوستوں کے ساتھ کرتا تھا۔ یہ زمانہ میرے لئے اگرچہ بڑا دلچسپ اور پرلطف رہا لیکن کبھی کبھی رات میں سوتے وقت یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنی پہلی سطح پر نہیں رہا ہوں بلکہ کچھ نیچے اتر آیا ہوں، اور اگر یہی لیل و نہار ہیں تو غالباً بہت کچھ نیچے اتر آ جاؤں گا۔ لیکن مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں تھی کیونکہ مجھے اس کا حق حاصل نہیں تھا کہ میں جو اتنے عرصہ تک تنہائی کے جانفرسا مصائب برداشت کر چکا ہوں کچھ دنوں تک دوستوں کی دوستی کا لطف اٹھاؤں اور زندگی کو ہنس بول کر گذار دوں۔ میں اس خیال کے تحت اپنی موجودہ زندگی میں تبدیلی کرنے پر کسی طرح تیار نہ تھا۔ وقت سے بہت پہلے کالج جاتا تھا۔ جہاں میرے دوست میرے منتظر رہتے تھے اور کالج ختم ہونے کے بہت دیر بعد تک دوستوں سے باتیں کرتے چمن میں گلگشت کرتا رہتا تھا۔ تعطیلات میں بھی میں اپنا وقت دوستوں کے ساتھ کسی نہ کسی رسٹوران میں گزارتا تھا یا کبھی گنڈی پیٹ یا ہفت گنبدوں کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ اس طرح دو تین سال گذر گئے۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ تنہائی اگرچہ سخت تکلیف دہ اور اذیت رساں ہے مگر وہ حقیقت ہے اور دوستوں کا لطف ملاقات گو کتنا ہی فرحت بخش اور دلکش ہو مگر ایک سراب ہے۔ انسان تنہا پیدا ہوتا ہے اور تنہا ہی مرتا ہے۔ دوست عمر کی چند منزلوں تک ساتھ دے سکتے ہیں مگر ہمیشہ تو ساتھ نہیں دے سکتے۔ جس زمانہ میں میرے دل میں یہ احساس رفتہ رفتہ پیدا ہو رہا تھا اسی زمانہ کا ذکر ہے کہ میرے ایک دوست نے برسبیل تذکرہ اقبال کی پیام مشرق شائع ہونے کا ذکر کیا۔ اس کتاب کو شائع ہو کر غالباً کچھ عرصہ گذر چکا تھا مگر میں نے ایسے دوستوں کے ہنگاموں میں محویت کے باعث اب تک نہیں دیکھا تھا۔ پیام مشرق کا ذکر ایک

عزیز دوست کی زبانی سن کر بےتاب ہوگیا اور فوراً ایک کتب فروش کی دکان پر دوڑا دوڑا گیا۔ حسن اتفاق سے مجھے یہ کتاب وہاں مل گئی میں نے اسے خرید لیا اور گھر جاکر رات کے وقت اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ دیر تک محویت کے عالم میں اس کو پڑھتے رہا۔ آدھی رات کے وقت اچانک میری نظر "تنہائی" والی مشہور و معروف نظم پر پڑی۔ میں اس عجیب و غریب نظم کو صبح کے چار بجے تک پڑھتا رہا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس وقت میرے دل کی کیا حالت تھی اور میرے جذبات کی طوفان خیزی کس درجہ تک پہنچ گئی تھی۔ خاص کر اس بند کو پڑھتے وقت ؎

شدم بحضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر — کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست
جہاں تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل — چمن خوش است ولے در خورِ نوایم نیست
تبسمے بلبِ او رسید و ہیچ نگفت

میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

مسلسل تین روز تک میں کالج نہیں گیا اور مسلسل تین روز تک صبح کے سات بجے سے رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میں پیام مشرق پڑھتا رہتا تھا۔ پیام مشرق میں مجھے وہ سب کچھ مل گیا جس کے لئے میری روح اتنے عرصہ سے بےقرار تھی۔ تخیل، ترنم، فلسفہ، تصوف، حسن، عشق، فطرت، میں نے اس چھوٹی سی کتاب میں کیا نہیں دیکھا۔ اگر میں ان تمام احساسات، جذبات اور تصورات کو یہاں پیش کر دوں جو اس کتاب کو پڑھتے وقت میرے قلب و دماغ میں پیدا ہوئے تھے تو یہ داستان بہت طولانی ہو جائے گی۔ اس لئے چند دلچسپ اشاروں پر اکتفا کرتا ہوں :- غزل کا شعر ہے

حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں — دلبراں، زہرہ وشاں، گلبدناں، سیم براں

غور کیجئے کہ اقبال نے تصور کے لئے اس شعر میں کیسی عجیب دنیا فراہم کی ہے جو بیک وقت دلکش بھی ہے۔ اور غم انگیز بھی۔ دلکشی اور غم انگیزی کا اس شعر میں جو سنگم نظر آتا ہے وہ میرے لئے معجزہ سے کم نہیں ہے۔ اس شعر کا مجھ پر کیا اثر ہوا اس کا ذکر کر کے میں شعر کے لطف کو ضائع کرنا نہیں چاہتا یہ باتیں محسوس کرنے کی ہیں بیان کرنے کی نہیں ہیں۔ البتہ اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس شعر کی بدولت میں ہفتوں تک تخیل کی ایک ایسی دنیا میں پرواز کرتا رہا۔ جہاں ہر طرف خونِ شفق کی رنگینیاں نظر آتی تھیں اور جہاں ہر وقت آبشاروں کی مدھم و رواں موسیقی سامعہ نوازی کرتی تھی۔ ایک اور غزل کا شعر ہے

از ما بگو سلامے آں یارِ تند خو را — کآتش زد از نگاہے یک شہر آرزو را

اس معشوق کی شان ملاحظہ کیجئے۔ وہ معشوق ہی کیا جو یک شہر آرزو کو ایک نگاہِ گرم سے نذر آتش نہ کر سکے۔ اقبال کے یہاں معشوق کا تخیل حد درجہ بلند اور پاکیزہ ہے۔ یہاں وہ حسن کا انتہائی کمال، انتہائی دلاویزی، اور انتہائی پاکیزگی دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے انسان کو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک دلچسپی قائم رہتی ہے۔ اس کا معشوق اور شاعروں کے معشوق کی طرح نہیں ہے کہ جس سے دس پانچ سال ہی میں طبیعت اکتا جاتی ہے اور بوالہوسی "کوئی اور" کے نعرہ لگانے لگتی ہے۔ اسی تخیل کو اقبال کی ایک اردو غزل کے حسب ذیل دو اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

پردہ چہرہ سے اٹھا انجمن آرائی کر — چشمِ مہر و مہ و انجم کو تماشائی کر
تو جو بجلی ہے تو یہ چشمک پنہاں کیسی — بے حجابانہ مرے دل سے شناسائی کر

ایک اور غزل کا شعر ہے جو کسی صوفی کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہے۔

من جواں ساقیٔ و تو پیرِ کہن میکدۂ
بزم ما تشنہ و صہبا نہ تو داری و نہ من

اس شعر کا لطف کچھ وہی لوگ اٹھا سکتے ہیں جو زندگی اور اس کے راز کو سمجھنے کے لئے بے قرار رہتے ہیں وہ کبھی فلسفیوں کے خشک مقالوں پر وقت ضائع کرتے ہیں اور کبھی صوفیوں کے آستانوں پر جبہہ سائی فرماتے ہیں، لیکن دل کا سکون اور اطمینان انھیں کہیں سے بھی نہیں ملتا مجھے تو اس شعر میں ہزارہا بے قرار روحوں کی دھڑکن صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ بزم تشنہ ہے اور تشنہ ہی رہے گی۔ آہ! اس کی پیاس کون بجھا سکتا ہے۔

اقبال کی مشہور نظم "نوائے وقت" کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

چنگیزی و تیموری مشتے ز غبارِ من — ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ او از نقش و نگارِ من — خونِ جگرِ مرداں سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم من روضۂ رضوانم

میں عرض نہیں کر سکتا کہ اس بند کو پہلی مرتبہ پڑھتے وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہو گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اچانک ایک ویرانے میں مجھے دنیا کے سب سے زیادہ قیمتی جواہرات مل گئے ہیں۔ میں حیرت سے چاروں طرف دیکھتا تھا، اور اس بند کو پڑھتا تھا اور پھر اپنے چاروں طرف دیکھنے لگتا تھا۔ اس وقت مجھے وقت کی یہ آواز فضاؤں میں ہر طرف گونجتی سنائی دیتی تھی۔ اُف! اس بند میں کتنا ترنم کتنا تخیل اور کتنی حقیقت ہے۔

"آدم از بہشت بیروں آمدہ می گوید" والی نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن — دلِ کوہ و دشت و صحرا بدمے گداز کردن
ز قفس درے کشادن بہ فضائے گلستانے — رہِ آسماں نوردن بہ ستارہ راز کردن
بگدازہائے پنہاں بہ نیازہائے پیدا — نظرے ادا شناسے بہ حریمِ ناز کردن

اس نظم میں اقبال نے تخیل کے لئے ایک عجیب بستی بسائی ہے۔ آدم بہشت سے نکالا گیا ہے۔ انوارِ قدیم کی یاد اس کے دل کو تڑپا رہی ہے بہشت کی جدائی نے غم کے اتھاہ سمندر میں اس کے وجودِ عزیز کو غرق کر دیا ہے۔ ندامت اور غم کے جانگسل جذبات اس کے دل کی کشتی کو جھکولے دے رہے ہیں۔ وہ ایک ویرانے میں تنہا بالکل تنہا بیٹھا جاتا ہے اور اپنے جذبات کو آنسوؤں کے ذریعہ بہا دینا چاہتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کچھ کہتا ہے۔ اس کے الفاظ نغمہ بن کر زبان سے نکلتے ہیں جس کو سن کر کوہ و دشت و صحرا کے دل کانپنے لگ جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ یہاں اس ابنِ آدم نے آدم کے جذبات کی کیسی صحیح ترجمانی کی ہے اور آدم کے دوسرے فرزندوں کے لئے تخیل کی کیسی دلکش دنیا آباد کی ہے۔

اس قسم کی صدہا مثالیں پیامِ مشرق سے نکال کر پیش کی جا سکتی ہیں مگر میں ان کو بخوفِ طوالت نظر انداز کرتا ہوں اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کی پیامِ مشرق دیکھنے کے بعد مجھ پر اس کے شاعرانہ کمال اور بلند تخیل کا کتنا زبردست اثر پڑا ہے۔ یہ ایک واقعہ اور حقیقت ہے کہ اس کی شاعری میرے قلب و دماغ پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا ہے جو شعر اس عظیم المرتبت شاعر کے قلم سے نکلتا ہے مجھے اپنی روح کی صدائے بازگشت نظر آتا ہے۔ میں اس کے کلام کا مطالعہ محض شاعری کا لطف اٹھانے کی خاطر نہیں کرتا ہوں بلکہ جس طرح کوئی عقیدت مند مرید اپنے مرشد کے ملفوظات کو کمال عقیدت کے ساتھ پڑھتا ہے اسی طرح میں اقبال کے ایک ایک شعر کو پڑھتا ہوں اور کیف کے سمندر میں غرق ہو جاتا ہوں۔ پیامِ مشرق کے بعد میں نے اقبال کی بلا استثنا تمام تصانیف خریدی ہیں اور ہمیشہ ان کو دیکھتا رہتا ہوں۔

قدرتی طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقبال نے اس حد تک اور اس شدت کے ساتھ مجھے کیوں متاثر کیا ہے۔ یہ ایک نازک سوال ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں الجھ کر میں بڑی مشکلوں سے اس سے عہدہ برآ ہو سکتا ہوں۔ تاہم کوشش کرتا ہوں کہ اس کی نسبت سرسری طور پر چند خاص خاص وجوہ کا یہاں اظہار کر دوں۔

میرا خیال ہے کہ اقبال کی جس خصوصیت نے مجھے حد سے زیادہ اس کا گرویدہ بنا دیا ہے وہ اس کا لہجہ (TONE) ہے۔ اس کی شاعری کا لہجہ اتنا بلند اور ساحرانہ ہے کہ مجھے اردو اور فارسی شاعری میں اس کی مثال کہیں نظر نہیں آتی۔ لہجہ کی تعریف کرنی اتنی ہی مشکل ہے جتنی خود شاعری کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔ لہجہ شخصیت کا ایک آئینہ ہوتا ہے۔ جب شاعری کی شخصیت صحیح خد و خال پوری ادا کے ساتھ نظر آتی ہیں اقبال اپنے لہجے کی وجہ سے تمام اردو فارسی شاعروں میں بہت ممتاز ہے۔ وہ کسی موضوع پر بھی اظہار خیال کرے اپنے مخصوص لہجہ ہی میں کیا کرتا ہے جس سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں اقبال بول رہا ہے۔ کوہ ہمالہ جیسی ابتدائی نظموں سے لے کر ضرب کلیم اور بال جبریل کی آخری نظموں تک اقبال کا لہجہ ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔ ایک لمحے کے لئے بھی اس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ میں اس امر کو شاید تسلیم کر لوں کہ اقبال نے بعض بعض نظموں میں دوسروں کے خیالات سے اکتساب فیض کیا ہے اور کہیں کہیں توارد خیال بھی نظر آ جاتا ہے لیکن کسی طرح یہ نہیں مان سکتا کہ اقبال کا لہجہ کسی حد تک بھی کسی دوسرے شاعر کا رہین منت ہے۔ اقبال اپنے لہجہ میں شروع سے آخر تک اقبال ہے اور یہاں کسی دوسرے شاعر کی پرچھائیں تک نہیں پہنچی ہیں۔ اقبال کا لہجہ کیا ہے؟ وہ شاعری کا ایک معجزہ ہے۔ وہ ایک ایسے شخص کی آواز ہے جو دلوں پر حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے عظیم المرتبت انسان کی صدا ہے جو قوموں کے باطن میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ آسمانی آواز ہے۔ ربانی نغمہ ہے۔

دوسری خصوصیت جس کی وجہ سے اس کی شاعری نے میری روح پر پوری طرح قبضہ جما لیا ہے اس کے تخیل کی بلندی اور رفعت اور اس کا انقلاب آفریں ترنم ہے۔ اقبال کے پورے کلام میں کوئی چیز ایسی نظر نہیں آ سکتی جس میں کسی قسم کا ابتذال یا عامیانہ پن کا ذرا سا بھی رنگ جھلکتا ہو۔ اس کی بلند فطرت کسی ابتذال کا ایک اور محدود چیز کو ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گو اس نے حسن و عشق کے میدانوں میں بھی جولانی دکھائی ہے مگر کہیں بھی ہم اسے کسی "میوا" کی زلف گرہ گیر میں پھنسا ہوا نہیں دیکھتے۔ وہ حسن کو ایک انسان ایک شاعر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اسی طرح اس کی بلند فطرت وطنیت کے محدود تخیل سے بھی برگشتہ رہی ہے۔ جس طرح اس نے حسن کو ایک بوالہوس نواب کی آنکھ سے نہیں دیکھا بالکل اسی طرح وہ وطن کو بھی ایک سود خوار سرمایہ دار بن کر کبھی نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھ کروڑوں انسانوں کے دھڑکتے ہوئے دلوں کو دیکھنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ اسے بوالہوس نوابوں یا سود خوار سرمایہ داروں سے مطلقاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہی راز اقبال کے انقلاب آفریں ترنم کا ہے۔ اس کا ترنم بربط و ارغنوں یا ساز کا ترنم نہیں ہے بلکہ یہ وہ ترنم ہے جو فضائے بسیط میں ستاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے جس سے کائنات میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ہر ذرہ ایک کیف سرمدی میں ڈوب جاتا ہے۔

اقبال کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت جو کچھ کم اہم نہیں ہے یہ ہے کہ وہ مجھے ہمارے عہد کا شاعر نظر آتا ہے۔ وہی ناقابل برداشت مصائب، وہی شکوک و شبہات، وہی زندگی کے اہم اور پیچیدہ مسائل جن سے آج کل ہم دوچار ہیں اقبال بھی ان سے دوچار ہو چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سعدی اور حافظ، خیام اور امیر خسرو، نظیری اور عرفی، میر تقی اور میر درد، حکیم مومن خاں اور غالب، جامی اور اکبر کا کلام ہمیں بہت متاثر کرتا ہے اور ہم پر وجد آفریں اثرات پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب ہوتا ہے لیکن ان سب شعراء کے کلام کو پڑھتے وقت ہمیں ایک کمی ضرور محسوس ہوتی ہے اور ہماری تشنگی پوری طرح رفع نہیں ہو سکتی ہے۔ یعنی ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں کہ یہ تمام

لبارس

خواہ ہمارے دور کے نہیں ہیں۔ ان کے زمانے میں زندگی کے مسائل اس سے بہت مختلف تھے جن سے آج کل ہم دوچار ہیں۔ ان کا زندگی کے متعلق نقطۂ نظر اگر بالکل نہیں تو کسی نہ کسی حد تک ہمارے نقطۂ نظر سے ضرور مختلف تھا۔ تشکیک، ارتیابیت جو موجودہ دور مادیت کا ایک تلخ ثمر ہے ان کو انھوں نے کبھی چکھا ہی نہیں تھا۔ ان کے دلوں میں شکوک اور شبہات کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ مذہب اور اخلاق کے بنیادی اصولوں کی نسبت انھوں نے جرح و قدح کرنی سیکھی ہی نہیں تھی۔ ان کے ذہنوں میں کبھی یہ خیال پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ تصوف، وجدان اور عشق پر کوئی بحث مباحثہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بطور مسلم حقائق کے تسلیم کرتے تھے اور ان پر ایمان رکھتے تھے۔ یہی باعث ہے کہ ان کے کلام میں ایمان اور ایقان کے بکثرت جلوے نظر آتے ہیں۔ البتہ صرف خیام کے کلام میں کہیں کہیں کچھ ارتیابیت اور تشکیک کی جاں سوز بجلیاں چمکتی ہیں مگر اس کی ارتیابیت ہمارے دور کی ارتیابیت سے بہت مختلف ہے بلکہ صحیح معنوں میں اسے ارتیابیت قرار دینا بھی مشکل ہے۔ علاوہ ازیں خیام کے کلام میں بھی بہت سارے خیالات ایسے موجود ہیں جو اس کے دور کے عام رنگ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ غرض کہ متذکرہ صدر شعراء ایک بالکل جداگانہ دور کے شعراء تھے اور ہمارا دور کچھ اور ہی دور ہے۔ یہی باعث ہے کہ ان کا کلام گو بڑی حد تک لائق احترام ہے۔ لیکن ہماری روحوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتا ہے۔ ان کا کلام پڑھتے وقت اکثر اوقات ہمارا دل چیخ اٹھتا ہے کہ انھوں نے زندگی اور اس کے تلخ حقائق کو اس طرح محسوس نہیں کیا تھا جس طرح آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اقبال کے ہاں یہ کمی نہیں ہے۔ وہ کامل اور مکمل طور پر ہمارے دور کا اور ہمارا شاعر ہے۔ اس نے ہر چیز کو اسی طرح محسوس کیا ہے جس طرح ہم محسوس کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا ہے ہماری روحوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہمارے بے پایاں درد و غم میں ہمارے ساتھ آنسو بہاتا ہے۔ وہ ہمارے شکوک و شبہات کو اچھی طرح سمجھتا ہے کیونکہ اسے اس جہنمی آگ کے خوب تجربے ہیں۔ وہ ہمارے مصائب و آلام سے ہم سے زیادہ واقف ہے اور ہم کو ان سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں یقین کی حرارت اور ایمان کا نور ہے۔ وہ ناامید ہونا نہیں جانتا۔ ناامیدی اس کے نزدیک کفر سے کچھ کم نہیں۔ وہ حیات تازہ کا پیامبر اور نغمۂ عمل کا مطرب آتش نفس ہے۔ وہ ایک سپہ سالار کی طرح اپنی شاعری کا علم بلند کرتا ہے اور اپنے مخصوص لہجے میں جو دلوں کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے بہ آواز بلند ارشاد کرتا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

اس آواز کو سنتے ہی ہماری روحیں تڑپ اٹھتی ہیں اور ہمارے دلوں میں عمل کا قیامت خیز طوفان پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں کیونکہ ہمیں ہر طرف امید کی کرنیں جگمگاتی نظر آنے لگتی ہیں۔ اقبال کی بے مثال عظمت کا یہی سب سے بڑا راز ہے۔

اقبال کی ایک اور خصوصیت جو اس کے شاعرانہ کمال پر دلالت کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نے اردو شاعری بلکہ مشرقی شاعری کو بے حد وسیع اور بے پایاں بنا دیا۔ اس کے پہلے شاعری صرف گل و بلبل کی حکایات، حسن و عشق کی داستانیں، مدح اور ہجو کے طومار، نعت اور منقبت کے کارنامے ہوتے تھے یا اس سے کچھ ترقی ہوئی تو قوم پر نوحہ خوانی۔ لیکن اقبال نے اس میدان کو بہت وسیع کیا۔ اس نے اپنے زور قلم اور بلندی تخیل سے یہ محسوس کرایا کہ ہر وہ بات جو انسان کے قلب کو متاثر کرے شاعری کی قلمرو میں داخل ہے۔ یہ کہنا بالکل مبالغہ نہ ہوگا کہ اقبال نے ہماری شاعری کی آب جو کو دریائے ذخار اور اس کے محدود گلستاں کو لامحدود دشت پر بہار بنا دیا اور شاعری کی دنیا دل کی دنیا کے ہم آہنگ بنانے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی چند ایک خصوصیات کو بے نقاب کرتے میں میں نے تھوڑی بہت کامیابی حاصل کر لی ہے۔

اب اس مضمون کو طول دینا مجھے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ میرا ایقان ہے کہ اقبال کی در متعدد خصوصیات ایسی ہیں جن کا ذکر لازمی ہے لیکن میں یہاں صرف اپنے ذاتی تاثرات کو پیش کر رہا ہوں اقبال کی شاعری کی نسبت کوئی عالمانہ مقالہ سپردِ قلم نہیں کر رہا ہوں۔ اس لئے ان کا ذکر کچھ ایسا ضروری نہیں ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اقبال کی شاعری نے مجھے جس حد تک اور جس قوت کے ساتھ متاثر کیا ہے اس کا اظہار زبان قلم سے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر اقبال اس عالم فانی میں پیدا نہ ہوا ہوتا اور اس نے اپنے غیر فانی نغموں سے دنیا کو متلاطم نہ کیا ہوتا تو میرے تخیل کی دنیا اس سے بہت مختلف ہوتی جو آج ہے۔ غالباً میں اس صورت میں کوئی اور ہی قسم کا آدمی ہوتا۔ ایک فاضل مورخ کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ اگر کلیو پیٹرا کی ناک ذرا چھوٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ یہی کیفیت میرے دل کی دنیا کی بھی ہے۔ اگر اقبال کی شاعری اس سے ذرا مختلف ہوتی جو آج ہے تو یقیناً میرے دل کی دنیا بھی کچھ اور ہی ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ٹھیک اس قسم کا احساس مجھ جیسے اور ہزارہا لوگوں کا بھی ہوگا اور ہزارہا لوگ ایسے بھی موجود ہوں گے جو صاف الفاظ میں اس احساس کا اظہار نہ کر سکتے ہوں گے مگر در اصل اقبال کی شاعری نے ان کے اندر بھی وہی انقلاب پیدا کیا ہوگا جو میرے دل میں کیا ہے۔

اب میں اس مضمون کو اقبال کے حسب ذیل شعر پر ختم کرتا ہوں جو اس شہنشاہِ اقلیم معانی کے رو گرائے عالم جاودانی ہونے کے بعد سے میری زبان پر خود بخود جاری ہو گیا ہے اور جس سے آج کل مجھے بے انتہا تسکین حاصل ہو رہی ہے:

کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحبِ ہوش
اک جہاں اور بھی ہے جس کا نہ فردا ہے نہ دوش

اشک

[illegible]

"مضطربِ آتش نفس"

اقبال کی آواز میں جبریل نغمہ بار تھا
ویرانۂ اسلام پھر صدر وشِ گلزار تھا

نغمہ نہ تھا اقبال کا احساس کی قندیل تھا
یا لحن تھا داؤد کا یا صورِ اسرافیل تھا

دیتا تھا درسِ بے خودی قرآن کے انداز میں
پنہاں تھے اسرارِ خودی علم و عمل کے ساز میں

دینار ہا، دیتا گیا سب کو اخوت کا سبق
اسلامیوں کو دے گیا صدق و محبت کا سبق

سینے میں قلبِ مضطرب فطرت نے بخشا تھا اسے
"تعمیرِ ملت" کے لئے قدرت نے بھیجا تھا اسے

وہ "مضطربِ آتش نفس" فرض اپنا پورا کر گیا
اور سرمدی نغمات سے مسلم کا دامن بھر گیا

سید عبداللہ جعفری صفیر

اقبال تاریخِ وطن کے آئینہ میں

تاریخِ وطن ہمیشہ اپنے فرزندوں سے یہی مطالبہ کرتی ہے کہ "خونِ جگر مرداں سامانِ بہارِ من"۔ نہ صرف مطالبہ بلکہ ایسے سپوتوں کو پیدا کرنا بھی اس کا کام ہے اقبال نے "مرداں" کہہ کر ان کی کاوشوں کو "خونِ جگر مرداں" سے تشبیہ دی ہے۔ تاریخ کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ وہ اقوام کو باوقار زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے ان میں جذبۂ حمیت کو زندہ رکھتی ہے ان کی رگِ غیرت کو متحرک کرتی ہے۔ تاریخِ ہند نے قرن ہا قرن آریائی سیلابوں کی تیز و تند انقلابوں اور خاص کر "ہنگامۂ افرنگ" سے سینہ سپر ہو کر ایک ایسا سپوت پیدا کیا جس کو دنیا مجاہدِ اعظم کے نام سے یاد کرے گی۔ اقبال اپنی تمام زندگی میں وطن کے لئے آخر دم تک باطل سے جہاد کرتا ہوا جاں بحق ہوا۔ اس کی تاریخ راست گوئی نے ایسی ہستیاں پیدا کیں جو اپنے خون سے سرزمینِ ہند کو سینچیں گی۔ اور اس وقت مادرِ ہند کا اپنے سپوتوں سے یہی مطالبہ ہے۔ کہ "خونِ جگر مرداں سامانِ بہارِ من" اقبال نے اپنی ایک فارسی نظم "نوائے وقت" میں زمانہ کی اس طرح توضیح کی ہے۔ ع "پنہاں بہ ضمیرِ من صد عالمِ رعنا بین" لیکن یہ مصرع دراصل اقبال کی شخصیت کا آئینہ دار ہے اقبال نہ صرف شاعر و فلسفی بلکہ تاریخ کا زبردست ماہر بھی تھا۔ اس نے تاریخِ ہند کو نقطۂ نظر سے تاریخ کے وہ ورق نکالے کہ ساری دنیا متحیر ہے۔ لکھنے والوں نے ان پر خوب لکھا عالمانہ انداز میں لکھا مگر تاریخی نے ان کا دامن نہ چھوڑا۔ اقبال نے جب کبھی کسی تاریخی شخصیت پر توجہ کی تو اس انداز میں کہ چار دانگ عالم میں اس کی شہرت ہو گئی۔ پڑھنے والوں نے گر دیکھ کر اس شخصیت کو ظلمت سے نور کی طرف لا دیا۔ اقبال نے ان کی اہمیت کو اس انداز میں جتایا کہ ان کی حقیقی عظمت آنکھوں میں پھر گئی۔ یہی وہ چیز ہے جو اس کی شاعری میں نمایاں ہے۔ یوں تو شاعر ہر دور میں پیدا ہوتے۔ لیکن ان شاعروں اور اقبال میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ "ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما" کھلی دلیل ہے۔ خود بھی ہمیشہ کے لئے زندہ رہا اور دوسروں کو بھی حیاتِ جاوید دیا گیا۔ اور ہندوستان کی شہرت پر مہرِ دوام ثبت کر گیا۔ یہ اندازہ امکان نہیں کہ ایک ہستی بجائے خود ایک عالم ہو لیکن اقبال کی ذہنی کائنات کے گوناگوں عوالم کا ایک مرقع تھی۔ اور اس کا ضمیر کائنات کے سیکڑوں عوالم کے لئے اپنے اندر وسعت رکھتا تھا۔ اسی لئے کہیں تو وہ خدا سے مکالمہ کرتا ہے کبھی تو آسمانوں پر اڑتا ہے کبھی کائنات کی سیر کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسا بلند پرواز شاعر اگر عالمِ موجودات کے متعلق مضمون پر خیال آرائیاں کرے، کبھی مسولینی کی تعریف کرے، کبھی مصطفیٰ کمال کی خوبیاں بیان کرے، کبھی اندلس کی طرف متوجہ ہو اور کبھی ہندوستان پر نوحہ کرے تو شور مچایا کہ اقبال محبِ وطن نہیں ہے "تنگ نظری ہے۔ اقبال کے ترانے دراصل حب الوطنی پر مبنی نہیں ہیں۔ خود اقبال کی زبانی سن لیجئے کہ وطن کی محبت میں کس طرح "تصویرِ درد" کھینچی ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا ۔۔۔ لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں ۔۔۔ تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے ۔۔۔ عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سن اے غافل صدا میری یہ ایسی چیز ہے جس کو ۔۔۔ وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر — زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے یہی اسلوبِ فطرت ہے — جو ہے راہِ عمل میں گامزن محبوبِ فطرت ہے

پہلے دو شعروں میں شاعر نے اپنی حب الوطنی کا بین ثبوت پیش کیا ہے اور خود کو "اہلی نوحہ خواں" کہتا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات کا نقشہ کھینچا ہے اور نہایت ہی موثر طریقہ سے آخری دو شعروں میں اہل وطن کو متنبہ کرتا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے پندرھویں سالانہ جلسے میں ایک طویل نظم "نالۂ یتیم" سنائی اس کے بعد ہر سال ایک نئی نظم سنایا کرتے تھے ۱۸۹۹ء میں لارڈ کرزن وائسرائے ہندوستان آیا اور ان کے زمانے میں مختلف سیاسی مسائل، بالخصوص تقسیم بنگال کی وجہ سے سارے ہندوستان میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کانگریس کے احتجاج کی وجہ پورے ہندوستان میں ہیجان پھیلا ہوا تھا۔ ان ہی سیاسی حالات کو اقبال نے تصویرِ درد میں پیش کیا ہے اور ہندوستانیوں پر اشعار کی صورت میں بیداری کے تازیانے برسائے ہیں خاص کر یہ شعر قابل غور ہیں۔

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے — دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہ ہے اقبال کی حب الوطنی اور یہ ہے اقبال کا نظریۂ وطنیت، اقبال آغاز ہی سے محب وطن تھا اور تا دمِ آخر تک رہا۔ یورپ کے سفر کے بعد حبِ وطن میں نہیں بلکہ نظریۂ وطنیت میں ایک خاص تبدیلی ہوئی۔ جو یورپی اقوام کی بے لگام وطنیت کے خطرناک نتائج کے مشاہدہ سے رونما ہوئی۔ اقبال کا نظریۂ وطنیت اسلامی جذبات سے متاثر تھا۔ اور اسلام نظریۂ وطنیت کا قائل نہیں اور جس کا دل "صد عالم رعنا" کا حامل ہو، وہ کیوں کر کسی جغرافی حدود میں محدود ہو سکتا ہے چنانچہ لکھتا ہے ؎

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی — رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی — دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے — ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

بلا شبہ شاعر اعظم اقبال کی شخصیت قید مقامی سے آزاد تھی، اور تاریخ عالم کو اس مایۂ ناز شاعر پر فخر ہے۔ لیکن ساتھ ہی اقبال نے اپنے ملک کی تاریخ پر جب نظر ڈالی تو دل چیر کر رکھ دیا۔ ترانۂ ہندی کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ کس طرح وہ اپنے ملک کی عظمت کو یاد دلاتا ہے۔

چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

بارھویں صدی عیسوی کو ہند قدیم میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس صدی میں شہاب الدین غوری ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ہندوستان کی سلطنتوں کا شیرازہ بکھر گیا، پھر ایک مرتبہ غزنوی کے حملوں کی یاد تازہ ہو گئی۔ لیکن یہ حملے اس لئے اہم

ہیں کہ اس زمانہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے۔ حملے سے تین دن قبل ہی وہ اجمیر میں تشریف فرما ہو چکے تھے اور انھوں نے اپنی روحانی قوت سے بغیر کسی امداد کے اجمیریوں کے دلوں میں جگہ لے لی۔ اس واقعہ کو اقبال یوں یاد دلاتے ہیں۔ ع "چشتی نے جس زمیں پر پیغامِ حق سنایا"

ہندوستان کے مخلوط تمدن کے سب سے پہلے علمبردار گرو نانک ہیں۔ نانک نے وحدت کی بانسری میں ہندو مسلم محبت کے گن گائے ہیں۔ نانک کی شخصیت اپنے پیغام کی اہمیت کے لحاظ سے تاریخ ہند میں "ناقابل فراموش ہے"۔ اگر ہندوستان کی خوش نصیبی سے نانک کو موقع ملتا اور ان کے بعد ان کا پیغام اصلی حالت میں جاری رہتا تو شاید ہندی سیاسیات کا رخ آج کچھ اور ہی ہوتا۔ نانک کا پیام در اصل پیام محبت ہے اسی لئے اقبال نے کہا ہے۔ ع "نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا" بابر کو ملک ہند سے بڑی شکایت تھی۔ وہ یہاں کے لوگوں کے ذوق سے گھبراتا تھا۔ تزک بابری میں اس نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ یہاں کے لوگ دریاؤں کی طرف پشت کر کے مکان بناتے ہیں۔ ہندوستان کی گرمی سے وہ بہت گھبراتا تھا۔ نہ صرف بابر بلکہ اس کے تمام ساتھیوں کو ہندوستان سے وحشت تھی، لیکن بابر کو کیا خبر تھی کہ اس کا خاندان ہندوستان کا اس قدر گرویدہ ہو جائے گا کہ "ہندوستان جنت نشان" کو اپنا وطن بنائے گا۔ اور تاتار سے ناتا توڑ دے گا اور اقبال کو یہ کہنے کا موقع دے گا۔ کہ "تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا" عربوں کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں یہ صاف ظاہر ہے کہ عرب قدرتاً ہندوستان کی طرف مائل تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے سے عرب ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ ۷۱۲ء میں حجاج بن یوسف کا داماد اور تاریخ عالم کا شہرۂ آفاق سپہ سالار عرب کے آسمانوں سے برق بے تاب بن کر نکلا اور سندھ کی فتح کے بعد سندھی ہو جانا چاہتا تھا۔ اس واقعہ کو اقبال نے یوں بیان کیا۔ ع "جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا"

سکندر اعظم کی وجہ سے یونان میں ایک زبردست انقلاب ہوا۔ تمام شہری مملکتیں غائب ہو گئیں۔ مقدونیہ کا بادشاہ ایک عالمگیر مملکت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگا۔ اس زمانہ کے یونانی مفکرین نے بھی سکندر کا ساتھ دیا۔ سکندر اعظم شاہ ایران کو شکست فاش دے کر سارے ایران پر قابض ہو گیا۔ ایران اور ہندوستان کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی دولت کے متحیر کن قصے سکندر کے کانوں تک پہونچنے لگے اور سنہ ۳۲۶ ق م ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ راجہ پورس کو شکست دے کر دریائے بیاس تک بڑھ آیا۔ ہندوستان کی "فارغ البالی" اور قدرتی عطیات سے سکندر اس قدر متاثر ہوا کہ دریائے بیاس سے آگے بڑھ کر سارے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتا تھا لیکن اس کے سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سکندر بہت ناخوش ہوا۔ بالآخر فوج کے ایک سردار کوئی نوس نے سکندر کو یاد دلایا کہ اس کا یہ غرور خدائے تعالیٰ کو برا معلوم ہوگا۔ مجبوراً سکندر نے افواج کو واپسی کا حکم دیا۔

"یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا"

اقبال کو تاریخی تلمیحات میں خاص کمال تھا۔ چنانچہ بدھ مت کی عظمت کو اس طرح واضح کیا ہے ؎

گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے — عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے
مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے — ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے ارم ہے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

مصلحینِ معاشرت کا خیال ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا اچھوت برہمن ہے۔ جس نے ذات پات کی تفریق پیدا کر کے

مخلوقِ خدا میں نفاق اور منافرت کی دیوار یں حائل کر دیں۔ اور انسان کی قسمت کو پروہتوں کے ہاتھ میں دیدیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام تو درکنار بادشاہ بھی پروہتوں کے ہاتھ میں تھا۔ شادی اور غم دونوں پروہت کے ہاں اور انہیں پر موقوف تھے۔ دوسرے معنوں میں یہاں کے باشندوں کی خانگی زندگی میں اس قدر مداخلت کی کہ نسلِ انسانی کی کوئی عزت و توقیر باقی نہ رہی۔ مخلوقِ خدا کو اس مصیبت سے بچانے کا بیڑا کپل وستو کے شہزادے نے اٹھایا۔ اپنے عیش و آرام کو ٹھکرا دیا اور ہمالیہ کے جنگلوں میں حق کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ بنارس کے قریب قصبہ گیا میں اس پر عرفان کے دروازے کھلے۔ اس کے بعد یہ مصلحِ اعظم مہاتما گوتم بدھ کہلایا اور بدھ مذہب کو ہندوستان، چین، جاپان، لنکا میں سرعت کے ساتھ پھیلا دیا۔ دور دور سے لوگ بدھ مذہب کے جنم بھوم کی زیارت کے لئے ہندوستان آنے لگے چنانچہ تاریخِ ہند کے دو مشہور آفاق سیاح فاہیان چینی اور ہیون سانگ اسی غرض سے ہندوستان آئے تھے چین ہی نہیں بلکہ جاپان بھی ہندوستان کو اپنا حرم سمجھنے لگا۔ اس واقعہ کا اقبال یوں اظہار فرماتے ہیں۔ کہ "گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے"

مدراس میں عیسیٰ علیہ السّلام کے سب سے بڑے حواری سینٹ تھامس کا مزار ہے۔ عیسیٰ علیہ السّلام کے عشاق حرمِ مسیح یروشلم سے سیدھے یہاں آتے ہیں۔ اس لئے اقبال نے فرمایا۔ کہ "عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے"۔ اقبال نے صرف قومی گیت میں ہی ہندوستان کی عظمتِ گم گشتہ پر آنسو نہیں بہائے بلکہ ہر اس نظم میں جس کا ہندوستان سے تھوڑا بہت تعلق ہے۔ ہندوستانیوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ترانۂ ہندی کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔ ؎

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو … اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

گنگا ہندوستان جنت نشان کا مقدس دریا ہے۔ اس ارضی نہرِ فردوس کے کنارے کنارے ہندوستان کے باعظمت شہر آباد ہیں۔ جو ہندو تہذیب و تمدن کے مرکز رہ چکے ہیں۔ شہاب الدین غوری کی فوج جے چند راجہ قنوج سے مقابلہ کے لئے اسی دریا کے کنارے خیمہ زن ہوئی تھی۔ ترکوں کا امڈتا ہوا سیلاب اسی جگہ ۱۱۹۴ء میں گنگا کے تیز و تند دھاروں سے لڑ گیا اور جے چند مارا گیا جے چند کے بعد قطب الدین ایبک کا کوئی دوسرا حریف باقی نہ رہا۔ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں سب سے پہلی دفعہ مجموعی سلطنت کی بنا ڈالی۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ قطب الدین ایبک ترک تھا اور اس کے بعد جتنے سلاطین آئے کم و بیش سب ترکی النسل تھے۔ قطب الدین ایبک دورِ دہلی کی سب سے پہلی باعظمت سلطنت کا بانی ہے اور یہ شاندار حکومت تھوڑے تھوڑے سے وقفہ کے بعد مغلوں تک جاری رہی جس کو اقبال نے یوں یاد فرمایا ہے۔

مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا … ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا

قطب الدین ایبک کے بعد یہ حکومت اسی شان و شوکت کے ساتھ جاری رہی۔ چونکہ یہ لوگ بہت ہی شائستہ تھے۔ اسی لئے وہ خلجیوں کے مقابلہ میں خود کو زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ شمس الدین التمش کو خلیفہ بغداد نے شاہی خلعت عنایت فرمائی تھی۔ غیاث الدین بلبن کر ڈبہ سے وہ منگول جنہوں نے بغداد پر حملہ کر کے شہرِ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی، سمرقند و بخارا کے درسگاہوں اور کتب خانوں میں آگ لگا دی تھی نہ صرف مرعوب تھے بلکہ اس کے نام سے کانپتے تھے۔ اس کے بعد خلجیوں کا دور آیا تو اس میں علاء الدین خلجی جیسا زبردست حکمراں پیدا ہوا جس نے سلطنت کو راس کماری تک وسعت دی، محمد تغلق نے ہندوستان کے باہر حملے شروع کر دیئے۔ فیروز تغلق نے اپنے تعمیری اصلاحات کو سنوارا۔ اور مغلوں کے دور میں تیموری جاہ و جلال سارے ہندوستان پر محیط تھا اور خاندان

جس کی عظمت اس ملک میں مدفون ہے۔ جیسے اقبال اسلام کا حشم کہتا ہے۔ ؎

مدفون جس زمیں میں اسلام کا حشم ہے — ہر پھول جس چمن کا فردوس ہے ارم ہے

تیموری جاہ و جلال کا مرثیہ اقبال نے ان الفاظ میں لکھا جس میں تیموریوں کی حمیت پوشیدہ ہے۔ نہایت ہی درد انگیز الفاظ میں اقبال نے تیمور کے گھرانے کی حمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

گر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر — حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

سنہ ۱۳۹۸ء میں تیمور ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ اور ایک سال بعد واپس ہو گیا۔ خضر خاں نے سنہ ۱۴۱۴ء تک تیمور کے بیٹے شاہ رخ مرزا کی طرف سے حکومت کی ..... ترکستان کا مرکز سمرقند تیمور کا پایۂ تخت تھا۔ یونس خاں اور چنگیز خاں کی طرف سے بابر کا سلسلۂ نسب تیمور سے جاملتا ہے۔ چنگیز خاں کے بعد یہ لوگ ترکستان میں آباد ہو گئے۔ اسی لئے بابر اپنے آپ کو ترک کہتا ہے۔ بابر ترک ہو یا مغل اس کی رگوں میں تیموری خون دوڑ رہا تھا۔ سنہ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی پر فتح پانے کے بعد بابر دہلی پر قابض ہو گیا تھا۔ لیکن پانی پت کے میدان سے بھاگے ہوئے پٹھان رانا سانگا کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے اور راجپوت و پٹھان دونوں قومیں مغلوں کے مقابلہ کے لئے متحد ہو گئیں۔ سنہ ۱۵۲۷ء میں بیانہ کے قریب یہ معرکہ آرا جنگ ہوئی جس کو تاریخ ہند میں جنگ سیکری کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی کامیابی تمام تر تیموری کے خاندانی حمیت پر منحصر تھی۔ بابر سمرقند سے مایوس ہو چکا تھا۔ اور اب ہندوستان میں پٹھانوں اور راجپوتوں کی متحدہ طاقت کا مقابلہ کرنا بڑے دل و جگر کی بات تھی۔ مغلوں کی فوج پر مایوسی مسلط تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی مایوسی کی وجہ بابر کے تیموری خون میں جوش آیا۔ اس نے اس موقع پر جو تقریر کی اس کے پس پردہ تیموری حمیت جوش زن ہے۔ بابر نے یاد دلایا کہ میدان جنگ سے بھاگ جانا مغلوں کے دستور شجاعت کے خلاف ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں نے مرتے دم تک لڑنے کی قسم کھائی اور بالآخر تیموری شجاعت، راجپوتوں کی سرفروشی سے بازی لے گئی۔

ہمایوں کے انتقال کے بعد سنہ ۱۵۵۶ء میں اکبر کو ایسے ہی نازک مواقع سے دوچار ہونا پڑا۔ کابل پر اکبر کا علاتی بھائی مرزا عبدالحکیم قابض تھا۔ اس لئے باہر سے کسی مدد کی توقع نہ تھی۔ ہندوستانی پٹھانوں کے مقابلہ میں مغلوں کو غیر ملکی سمجھتے تھے۔ شیر شاہی معرکے ابھی ان کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس صورت حال سے مغل بھی گھبرا گئے۔ ترائن کے میدان میں مغل خیمہ زن تھے۔ مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ بعض مغل سرداروں نے کہا کہ اس وقت مقابلہ خلاف مصلحت ہے۔ کابل واپس جانا چاہئے۔ اکبر کی عمر اس وقت چودہ سال تھی۔ وہ وہاں موجود تھا۔ اور خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔ جب دیکھا کہ مایوسی کا پلہ گراں ہو رہا ہے تو تلوار سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا "تخت یا تختہ" کمسن شہنشاہ کے ان الفاظ نے مغلوں کے دلوں میں نشتر کا کام کیا اور تیموریوں نے آن سے جان کی بازی جیت لی۔

شاہجہاں بھی اس خصوص میں اپنے پیش روؤں سے پیچھے نہ تھا۔ ملک عنبر کا دکن میں مقابلہ کرنا بڑے دل و جگر کا کام تھا۔ جب دکن میں اس کا علم ہوا کہ شہزادہ خرم کی زیر کمان افواج آ رہی ہیں۔ سارے دکن میں سنسنی پھیل گئی۔ شہزادہ خرم جب دریائے تاپتی کے کنارے آیا تو سارے دکن پر اوس پڑ گئی۔ شاہجہاں کی حمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ حق تلفی کے خلاف اس نے شہنشاہی طاقت کے مقابلہ میں سرکشی کی۔ گو کامیاب نہ ہوا۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کامیاب نہ ہو گا۔ لیکن نورجہاں کی خود غرضی، اور حق تلفی و ناانصافی کے خلاف تلوار اٹھانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔

اورنگ زیب نے تمام معرکہ آرائیوں میں خود حصہ لیا۔ عبدالعزیز شاہ بخارا کے مقابلہ میں عین لڑائی میں ظہر کی نماز کے لیے شہنشاہ اور افواج صف بستہ ہو گئیں، ایک طرف سے گولوں کی بارش ہو رہی تھی، دوسری طرف نماز کس قدر رقت انگیز منظر تھا، اور یہی واقعہ اورنگ زیب کو گولکنڈہ میں بھی پیش آیا۔ اورنگ زیب کی اس جرأت سے عبدالعزیز شاہ بخارا، ابوالحسن قطب شاہ دونوں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شہزادہ دارا شکوہ کو گرفتار کیا گیا تو بغیر نہ لڑے گرفتار ہو جانا۔ اس کو گوارہ نہ ہوا۔ ہتھیار تو تھے نہیں، ایک چھری سے مقابلہ کیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد اورنگ زیب کے بڑے بیٹے شاہ عالم بہادر شاہ نے کام بخش کو لکھا کہ اطاعت قبول کرے اور حسب سابق دکن کا صوبہ دار رہے۔ کام بخش نے جواب دیا کہ بغیر لڑے اطاعت قبول کرنا مغلوں کی روایت کے خلاف ہے۔ آخر جنگ ہوئی اور کام بخش زخمی ہوا۔ شہنشاہ نے ان الفاظ میں اظہار افسوس کیا تھا "من نمی خواستم کہ ترا دریں حالت ببینم اما مقدر چنیں بود"

شاہ عالم کے بعد معز الدین جہاندار شاہ بادشاہ ہوا۔ اس کے بعد خانہ جنگی شروع ہوئی۔ عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے سیدوں کی مدد سے تخت حاصل کیا۔ ایک بڑی فوج جہاندار شاہ کے بیٹے عز الدین سے مقابلہ کے لیے آئی اور عز الدین بغیر لڑے میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ یہ تیموری خاندان کا سب سے پہلا شہزادہ تھا جو بغیر لڑے میدان جنگ سے بھاگا۔ اور اسی دن سے مشہور ہو گیا کہ تیموریوں کا آفتاب اقبال ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اس کا ماتم اقبال نے یوں کیا ہے۔ ع

"حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے"

مؤرخین کا خیال ہے کہ شمالی ہند کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے پہلے جنوبی ہند کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ بالخصوص دور مغلیہ کی تاریخ کا دکن سے گہرا تعلق رہا ہے۔ دکن تیموری شاہزادوں کی تربیت گاہ کہلاتا ہے۔ اکبر اعظم کے زمانہ سے مغلیہ حکومت دکنی سلطنتوں کے جاہ و جلال کو دیدۂ حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ بالآخر اورنگ زیب کے عہد میں تیموری سیلاب دکنی حکومتوں کو کچھ اس طرح بہا لے گیا کہ صرف آثار ہی باقی رہ گئے۔ ہندوستان کی عظمت کا ازلی نوحہ خواں جو وطن کے ایک ایک ذرہ کو دیوتا سمجھتا ہو۔ تاریخ ہند کے ایک اہم بالشان باب کو کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے۔ گولکنڈہ کی عظمت کا یوں نقشہ کھینچا ہے ؎

آہ! جولانگاہ عالمگیر یعنی وہ حصار
دوش پر اپنے اٹھائے سیکڑوں صدیوں کا بار
زندگی سے تھا کبھی معمور اب سنسان ہے
یہ خموشی اس کے ہنگاموں کا گورستان ہے
اپنے سکان کہن کی خاک کا دلدادہ ہے
کوہ کے سر پر مثال پاسباں استادہ ہے

پھر قطب شاہوں کا ماتم ان الفاظ میں کرتا ہے ؎

خواب گہ شاہوں کی ہے یہ منزل حسرت فزا
دیدۂ عبرت خراج اشک گلگوں کر ادا
ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے
مقبروں کی شان حیرت آفریں ہے اس قدر
جنبش مژگاں سے ہے چشم تماشا کو حذر
کیفیت ایسی ہے ناکامی کی اس تصویر میں
جو اتر سکتی نہیں آئینۂ تحریر میں

قطب شاہی عظمت کا سب سے پہلا علمبردار سلطان قلی قطب شاہ ہے جو اپنے پورے خاندان کے ساتھ قلعہ گولکنڈہ کے قریب آرام کر رہا ہے۔ آخری تاجدار ابوالحسن قطب شاہ کے سوا تمام انہی قطب شاہی گنبدوں میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور یہ گنبد زبان حال سے قطب شاہی عظمت کے مرثیہ خواں ہیں۔ ۱۶۸۷ء میں ابوالحسن قطب شاہ کے زمانے میں سلطنت گولکنڈہ کا خاتمہ ہوا۔ [illegible] سے یہ سلطنت تہذیب و تمدن میں مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ قطب شاہیوں کے برگشتہ مقدر نے اس سلطنت کا شیرازہ ۱۶۸۷ء میں بکھیر جرمنی گوئٹے، انگلستان شکسپیر و ملٹن، امریکہ لانگ فیلو پر فخر کرتا ہے تو ہندوستان اپنے اقبال پر جو سیالکوٹ کی سرزمین سے اٹھ کر گھنگھور گھٹا کی طرح فضائے ہند سے تمام عالم پر چھا گیا۔ مدت سے ہندوستانیوں کے دل سرد ہو چکے، ان کی محفلیں مردہ ہو چکی تھیں، ان کی ہمتیں جواب دے چکی تھیں ان کا یہ یاس قدرت کو گراں گذرا اور اقبال سرزمین ہند پر رحمت الٰہی بن کر نازل ہوا سوتوں کو جگایا دردمندوں کو رلایا، خاموش آیا اور ہنگامہ محشر کے ساتھ چل بسا، اقبال حیات قومی کی تخلیق پر مسیحا کا حکم رکھتا تھا یہ اس کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

مولانا ظفر علی خاں نے لکھا ہے کہ جنگ طرابلس کے زمانے میں اقبال کا کلام مسلمانان عالم پر عربوں کی رجز خوانی کا اثر رکھتا تھا۔ ہندوستان افلاس کی وجہ توپ و تفنگ اور سامان حرب نہیں رکھتا لیکن اقبال کا کلام رکھتا ہے۔

محمود مجاہد

یادِ اقبال

حریفِ نورِ سحر ہو سکی نہ ظلمتِ شب — جو غم کے ذکر سے مٹ جائے وہ خوشی کیا ہے
نگاہِ شوق میں جنبش، زبانِ شوق خموش — اک انتظارِ اجل ہے یہ زندگی کیا ہے
نہ اپنا دل ہے نہ اپنی زباں، نہ اپنی نظر — اسی کا نام خودی ہے تو بے خودی کیا ہے
اگرچہ عام نہیں ذوقِ خود فراموشی — مگر یہ کوئی نہ سمجھا، خودآگہی کیا ہے
فسونِ عقل کو لازم نہیں بنائے فساد — جنونِ عشق پہ یہ تیرا افگنی کیا ہے
خبر نہیں یہ خلاکت زدہ دماغوں کو — کلاہِ قیصری و تاجِ خسروی کیا ہے
ادھر گمان "مصر دعوئ خدائی پر — ادھر یقین کو حیرت کہ بندگی کیا ہے
غرض کہ علم بھی عاجز ہے ان مسائل سے — دماغ چھین لیا کس نے اہلِ محفل سے
مگر بہ این ہمہ نیرنگئ جنون و خرد — بتا دیئے ہیں آدابِ بندگی تو نے
خودی کے نور سے ہر سمت اک چراغاں ہے — شبِ سیاہ کو بخشی ہے روشنی تو نے
وہاں سے اڑ نہ سکے طائرانِ بامِ حرم — بچھا دیا تھا جہاں دامِ آگہی تو نے
جہاں کئے تنگ نظر فلسفہ پرستوں کو — بنا دیا ادب آموزِ شاعری تو نے
جنھی سے گوشِ بر آواز ہیں فلک والے — کبھی تھی شعر میں رودادِ بندگی تو نے
وہ جسمِ قوم کہ آسودۂ فنا بھی نہ تھا — اسی میں از سرِ نو جان ڈال دی تو نے
حیاتِ شعر کی تجدید کا ارادہ تھا — خدا سے مانگ لیا ذہنِ فلسفی تو نے
تری تلاش تھی [illegible]

اقبال کی شاعری کا آخری دور

دنیا کے اس شاعرِ اعظم کی زندگی ہی میں، اس کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اور اس کی فکر اور صناعی کے کئی پہلو ایک زیادہ مرتبہ معرضِ بحث میں آ چکے ہیں۔ ان سب کے باوجود، اس وقت اس کے انتقال کے بعد جب ہم غور کرتے ہیں تو اب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عظیم الشان شاعری کے متعلق اب بھی سب کچھ نہیں کہا جا سکا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہیں کہا جا سکے گا۔ اس کی شاعری کی طرح اس کی شاعری کی تنقید کی تشنگی بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور یہ اقبال کی عظمت کی دلیل ہے۔ دنیا کے غیر فانی شاعروں اور خاص کر مفکر شاعروں کے متعلق جس قدر بھی لکھا اور کہا جا سکتا ہے، اس سب کے باوجود ان کے خیال، صناعی اور حسنِ کلام کے متعلق بہت کچھ ناگفتہ رہ جاتا ہے۔

اس طرح یہ کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ عین مطابقِ فطرت ہے کہ اقبال کے کلام کی دلچسپی کی مناسبت سے ان کے کلام کی تنقید کی دلچسپی بھی لازوال ہو۔ اس شاعر نے غور و فکر کے لئے اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ نئے نئے نقاطِ نظر سے اس کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا رہے گا بہت سے گوشے ابھی ٹٹولنے ہیں اور بہت کچھ سعی اس کے قلب کی گہرائیوں تک نہیں تو ان کے قریب پہنچنے کے لئے کی جاتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو ان تمام مساعی کا حقیقی مقصد اس برگزیدہ ہستی کی یاد اپنے دلوں میں تازہ رکھنے کی آرزو ہے۔ فہم و بساط کے مختلف مدارج اسی طرح اس ہمدردِ نوعِ انسان کی جناب میں اپنا اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔

یہ بات اب ہر وقت سے زیادہ واضح ہو گئی ہے کہ فارسی زبان کی حد تک جو انتہائی تعریف مثنوی معنوی کی گئی ہے وہ اردو میں پیرو رومی کے اس پرستار کے کلام پر پوری پوری صادق آتی ہے۔ "ہست قرآں در زبانِ ہندوی"۔ اس فکر شعری کے آخری مدارجِ ارتقا کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم اس کے ابتدائی مراحل پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس عروج کے دور زینے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس روشنی میں جاری اگلی کوشش، جو ان ادوار کے کلام کی چھان بین سے متعلق کی گئی ہیں۔ ادھوری، نامکمل اور قطعی ناقص معلوم ہو رہی ہیں۔

اقبال کے آخری عمر کا کلام ایک عظیم الشان چیز، ایک سرمایۂ حیات اور ایک سرچشمۂ زندگی ہے۔ اس میں ایک حقیقی مفکر کی پختگی فکر اور ایک حساس صناع کے مو قلم کی سحر کاری موجود ہے۔ قوتِ گویائی کے رعب داب میں طمطراق اور پیغمبرانہ شان پیدا ہو گئی ہے رفعتِ فکر اور بلندیٔ خیال میں صوفی صافی کی روحانی سیر کے انداز نظر آتے ہیں۔ یہی درحقیقت شاعر کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر کائنات اپنے تمام سوز کے ساتھ شاعر کی ہتھیلی میں ایک رائی کا دانہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بلندیٔ پرواز قوتِ فکر اسے نصیب ہو گئی ہے۔

اقبال نے اردو اساتذہ کی اصطلاحی شاعری میں پہلا قدم رکھا تھا۔ اسی میدان میں جب ان کی فکر انفرادیت کی طرف رجوع ہوئی تو وہ اصطلاحی شاعری سے ہٹ کر اپنے اطراف کی اشیا اور مسائل پر عمومی خیالات کا اظہار کرتے رہے کبھی کسی کی ترجمانی کی کبھی کسی کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنایا۔ اور کسی وقت وطن اور قوم کے مسائل میں ان کی توجہ الجھی گو اندازِ بیان ان کا اپنا تھا لیکن خیالات عموماً وہی تھے جو ان کے اطراف عام طور پر رائج تھے۔

یورپ کی سرزمین کے قیام نے دراصل شاعر کی آنکھیں کھول دیں۔ بہت سے مسائل میں اس کی فریب خوردگیاں بے نقاب ہو گئیں اسے نظر آ گیا کہ جن چیزوں کو اس کی قوم پائیدار سمجھ کر ان کے پیچھے عمر گنوا رہی تھی وہ دراصل دھوکا، اور حاکم قوموں کی شعبدہ بازی تھی جن بے شمار مسائل نے شاعر کو متاثر کیا اس کا خاکہ اس زمانے کے کلام میں پورا موجود ہے۔ اسی دور میں اقبال کی بہی عظیم الشان

نظم "شکوہ" لکھی گئی۔ یہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔

جب شاعر کی غریب خوردگی اس پر عیاں ہو گئی تو نظر تا اُسے ایک پائدار چیز کی تلاش ہوئی جس کے لئے حیات انسانی وقف کی جا سکتی ہے۔ اس تلاش میں اس کی طبیعت اسلامی فلسفۂ حیات اور معاشرت کی طرف رجوع ہوئی اور یہاں اس کو وہ چیز مل گئی جو اس کے لئے حیات کائنات کا حاصل تھا۔ خیالات کا اس طوفان کو لے کر وہ زور و شور سے اٹھا اور ایک پیغمبر کی طرح دنیا کو اپنا پیغام سنانے لگا۔

اب اقبال ایک انقلاب پسند شاعر اور ایک حقیقی صوفی ہو گئے تھے۔ ان کا مذہب عشق اور ان کا فلسفۂ خودی معین ہو گیا تھا۔ اور ہر عقدہ کا حل ان کو انہیں چیزوں میں مل گیا جیسا کہ وہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ — خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا — فریبِ سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری — نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الٰہ الا اللہ

عشق ان کے لئے مذہب اور عشق ہی ایمان تھا۔ "علم و عشق" کے عنوان کی نظم میں وہ کہتے ہیں۔

عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن — علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
بندۂ تخمین و ظن، کرمِ کتابی نہ بن — عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات — علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات — علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں — عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں — عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتحِ باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام — شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام — علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

خودی اقبال کی نظر میں رازِ حیات ہے۔ اور اس کی تفہیم اور تشریحات میں اقبال نے جس نکتہ رسی سے کام لیا ہے شاید ہی کسی اور نے کبھی اس کا عشر عشیر بھی سمجھا یا سمجھایا ہو۔ "خودی کی زندگی" میں وہ فرماتے ہیں۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بے کراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد — نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

افراد کو منظم کرنے والا ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی جذبہ رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ جذبہ مذہب تھا اور موجودہ زمانے میں وطنیت اور قومیت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ لیکن امن عالم کے لئے یہ جذبہ مذہب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہو چکا ہے۔ قومیت کے شدید جذبے کی برائیاں اب پوشیدہ نہیں رہی ہیں۔ ہر قومی جذبہ میں دوسری قوموں سے منافرت، بغض اور دشمنی کا موجود ہونا لازمی سا ہو گیا ہے۔ اس کو دنیا کے بعض

اور صاحبانِ فکر نے بھی محسوس کیا، اور اس کو کسی قدر قابو رکھنے کے لئے حربے کے طور پر ایک بین قومی احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مجلس بین الاقوام اسی کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ ترکیب بھی جس قدر کارگر ہوئی پچھلے چند سال کے واقعات سے ظاہر ہے۔ اقبال نے مجلس بین الاقوام کی ناکامیوں کا جو خاکہ اڑایا ہے وہ زبان زد ہو گیا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں اس عنوان کی نظم میں بھی یوں اظہار خیال کیا ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن
پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اقبال کے وسیع تر انسانی جذبات نے انتقش بین قومیت کے مقابلے میں ایک بین انسانیت کا احساس پیدا کرنے پر ابھارا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ احساس انھوں نے کہاں سے اخذ کیا۔ "مکہ اور جنیوا" کے عنوان کی نظم میں اس احساس کو انھوں نے صاف صاف ظاہر کر دیا۔

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

اقبال کے خیال میں، دنیا کی موجودہ ابتری اور پریشانی کا علاج اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ بجائے قومیت کی تفرقہ پردازی کے "انسانیت کے اتحاد" کا احساس دنیا کی ساری قوموں کے افراد میں پیدا کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ اقبال کی فکر کا ایک نہایت قابل قدر پہلو ہے۔ اور دنیا کی موجودہ حالت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس اتحاد اور وحدتِ انسانی کا دنیا میں قائم ہونا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال اس کو حاصل کرنے کے لئے اس کی تمام مزاحم قوتوں سے جنگ کی تلقین کرتے ہیں، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے جنگ کو ختم کرنے کے لئے بھی جنگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال اس امن خیز فضا کے پیدا کرنے کے لئے افراد کو ایک آخری جنگ کرنے پر بھی ابھارتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال کا پیغام دنیا کے لئے ایک عالمگیر امن کا پیغام ہے، لیکن یہ احساسِ امن نہ بزدلی کا پیدا کردہ ہے اور نہ اس کا نتیجہ بزدلی ہے۔ اس دور کے کلام میں جو جوش اور صدق طلب ہے اس کی مثال شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی۔ یہ طلب اور بہتری کی خواہش ذات کی حد تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں وہ تمام عظیم الشان انسانی گروہ شامل ہیں، جو کبھی زندگیاں کبھی دنیا کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہو چکی تھیں۔ مثلاً "بالِ جبریل" میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں۔

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا
کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اسی مجموعے میں ایک نظم کا آخری شعر ہے۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

یہاں شاعر کائنات کے اصلی منشائے تخلیق اور اس کے راز پر پوری طرح حاوی ہو گیا ہے۔ اور جو چیز وہ کھتا ہے اس میں پورا ایقان موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی شاعری کے اثر میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ اسی دور کی شاعری میں ایک شدید احساس انتقام اور ایک احساس تلافی بھی

پیدا نظر آتا ہے۔ انتقام ہر اس چیز کے ساتھ جو اس کے اصلی منشائے حیات کے حصول میں سدِ راہ ہو اور تلافی کی خواہش ان تمام امور کے متعلق جو اس کی دسترس سے باہر ہوں، لیکن ان کے مواخذہ میں وہ گرفتار ہو۔ وہ چیز خواہ اس عالم آب و گل سے تعلق رکھتی ہو یا عالمِ معنی سے۔ ذیل کے اشعار میں شاعر کا انداز کس قدر غیر معمولی ہو گیا ہے۔

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد / نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
یہ مشتِ خاک یہ صرصر یہ وسعتِ افلاک / کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد
قصور وار غریب الدیار ہوں، لیکن / ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

ایک اور نظم میں فرماتے ہیں۔

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے / دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

یہ احساس، اقبال کی آخری نظموں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ انداز گویائی کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں تھی۔ قوموں کے عروج و زوال کے پوشیدہ رازوں کو بھی اقبال نے صاف یا استعارے کے پیرایہ میں جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ ذیل میں ایسے چند شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں / وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں / کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی
حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز / زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں / اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں / زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
ضمیر پاک و نگاہ بلند و مستیٔ شوق / نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفٰیؐ سے مجھے / کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے؟ / شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر
ناصبوری ہے زندگی دل کی / آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے / زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

غرض موجودہ زندگی کے بہت کم مسائل ہوں گے جن پر اقبال نے اس زمانے میں روشنی نہ ڈالی ہو یا تنقید نہ کی ہو۔ اگر کوئی قوم جو حالتِ پستی میں ہو اقبال کے صرف آخری زمانے کے کلام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے تو یقین ہے کہ اس میں حیات کی ایک تازہ لہر پیدا ہو جائے گی۔

عبد القادر سروری

اقبال

بزمِ مشرق تھی فسردہ چپ تھا ہر تارِ رباب
قصرِ بیداری پہ تھی چھائی ہوئی تنویرِ خواب

تھے بھیانک خاک کی دھندلی جبیں کے خدوخال
ڈھل رہی تھی رات کے سانچے میں صہبائے جمال

تیرگی ہی تیرگی تھی شمعِ رخشاں تھی اداس
حسن کا رنگیں تبسم ہو چکا تھا نذرِ یاس

مضطرب تھی سینۂ گیتی کی روحِ تابناک
سربسر معمورۂ تاریک تھی تعمیرِ خاک

عشق کے مفہوم سے واقف نہ تھی یہ کائنات
مہر و مہ کی شب فروزی میں نہ تھی پہلی سی بات

سو رہی تھی قلزمِ ہستی میں موجِ ارجمند
رازِ انوارِ خودی سے بے خبر سیلِ بلند

گرچہ تھیں اک نالۂ توفیق کی انگڑائیاں
آہ تھیں وہ بھی مگر محوِ فلک پیمائیاں

اس فضائے درد میں آئی وہ آوازِ گداز
لوحِ مشرق مسکرائی" جاگ اٹھے خاک باز

نزہت و انوار کی زلفیں بھی لہرانے لگیں
بدلیاں، رقصِ خودی کی دہر پر چھانے لگیں

عشق کے ماتھے پہ نورانی پسینہ آ گیا
حسن ساحل کے قریں دل کا سفینہ آ گیا

لے خودی کی چاندنی میں مسکراتا تھا جلال
چہرۂ ہر مردِ مومن پر تھا احساسِ جمال

ناشناسی کی شعاعیں منتشر ہونے لگیں
جہل کی کافر ہوائیں منتشر ہونے لگیں

زندگی کی نبض میں رقصاں ہوا خونِ بہار
جی اٹھا ہر صرفِ رنگ و بو برنگِ برق کار

آسماں والوں میں بھی ہونے لگی کچھ قیل و قال
عرش بھی ہلنے لگا تھرا گئی ارضِ جمال

ایک دنیا نے کہا آوازۂ یزداں شکار
ایک دنیا نے کہا فطرت کے باغی کی پکار

کوئی بولا سچ تو یہ ہے نغمۂ جبریل ہے
نغمۂ جبریل کیا ہے؟ صورِ اسرافیل ہے

درحقیقت وہ ہے اک ٹوٹے ہوئے دل کا سرود
سوز میں ڈوبے ہوئے الہام کا حسنِ صعود

اقبال کا شاعرانہ فلسفہ

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی | برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اقبال نے شعر کو فلسفہ اور فلسفے کو شعر بنا دیا۔ اسی میں اس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ فلسفے اور شعر کا جہاں خوشگوار امتزاج ہو، شعر جادو بن جاتا ہے۔ اقبال سے پہلے یہ سعادت مرزا غالب کو حاصل تھی جو اپنی اس انوکھی شانِ کج کلاہی کی بدولت اپنے ہم عصروں میں ممتاز رہے۔ غالب کی شعریت فلسفے پر سدا غالب رہی، لیکن اقبال کی فلسفیت بسا اوقات شعریت پر غالب ہو جاتی ہے اور بحیثیت شاعر یہی اس کی کمزوری ہے۔ جب تک وہ (اقبال) اپنی انوکھی مذہبیت اور ”ہمہ اسلامیت“ کا دلدادہ نہ ہوا تھا اس کا کلام مقبولِ خاص و عام تھا۔

گو ابتدا میں اقبال نے داغ سے رشتۂ شاگردی جوڑا تھا، لیکن ذہنی اور روحانی حیثیت سے وہ غالب کا پرستار اور غالب کے کلام کا خوشہ چیں تھا۔ غالب کا اثر (چند غزلوں کو چھوڑ کر جو داغ کے رنگ میں ہیں) اس کی ابتدائی کوششوں میں صاف جھلکتا ہے۔ میں شاعر کی ایک نظم کے چند اشعار پیش کروں گا جو کسی مصلحت کے تحت ”بانگ درا“ میں شامل نہیں کی گئی۔ نظم کا عنوان ہے ”نالۂ یتیم“ جو ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ الفاظ، بندشیں، ترکیبیں، اضافتیں سب پر غالب کا اور خصوصاً غالب کے کلام کا ابتدائی رنگ صاف طور پر نمایاں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

آمدِ بوئے نسیمِ گلشنِ رشکِ ارم | ہو نہ مرہونِ سماعت جس کی آوازِ قدم
لذتِ رقصِ شعاعِ آفتابِ صبح دم | یا صدائے نغمۂ مرغِ سحر کی زیر و بم
رنگ کچھ شہرِ خموشاں پر جما سکتی نہیں
خفتگانِ کنجِ مرقد کو جگا سکتی نہیں

اسی نظم کا آخری بند سلاستِ زبان اور خاطر نشیں اندازِ بیان کا تنہا نمونہ ہے۔ جس سے امید بندھتی ہے کہ شاعر عجب نہیں کہ اپنے روحانی استاد کی طرح آگے چل کر سلاست اور نغمے کے دریا بہا دے۔ اس کے علاوہ اس نظم کے آخری بند کے اشعار اس امر کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ یہ کاشمیری الاصل برہمن زادہ، ممکن ہے کہ ہندی قومیت اور ہمالہ کی عظمت کے ترانے اور نئے شوالے کی من موہنی فضا کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں ”حجازی لے“ کا دلدادہ نہ ہو جائے۔ یہ ہو کر رہا اور اسی بنا پر بعض قوم پرست ہندیوں اور اردو ادب کے پرستاروں کو اقبال سے اس کے جیتے جی دو بڑی شکایتیں رہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے اپنا قدیم ہندی مسلک (ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا) کیوں چھوڑ دیا اور پھر یہ کہ اردو کو تج کر ایران کی جانب انتقالِ ذہنی کیوں کیا؟ دوسرا سوال میرے نزدیک خارج از بحث ہے۔ البتہ پہلا سوال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے اور اس کا اجمالی جواب اس مختصر مضمون کا موضوعِ بحث ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں تمام ہندوستان ”قومیت“ اور ”ہوم رول“ کے فلک شگاف نعروں سے گونج رہا تھا۔ اسی زمانے اور اسی فضا میں اقبال نے اپنی شعری استعداد اور اپنی خداداد ذہانت کا پورے طور پر احساس کیا۔ کوئی شاعر اپنے ماحول اور گرد و پیش کے واقعات سے الگ تھلگ اور بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ وہ اپنے آس پاس دیکھتا ہے اسے اپنی سرشت کے

حساس سانچے میں ڈھال کر ایک حسین اور دلکش انداز میں بیان کرتا ہے۔ اقبال کا ہندی ترانہ 'میرا وطن وہی ہے' 'نیا شوالہ' اور 'تصویر درد' انھیں اثرات کا نتیجہ ہیں۔ ان نظموں کے بیشتر اشعار اس قدر زبان زد خاص و عام ہیں کہ ان کو یہاں دہرانا کوئی جگہ نہیں رکھتا۔ غرض کہ تمام ہندوستان اقبال کی والہانہ تان اور ترانے سے گونج اٹھا اور اہل ملک نے بلا امتیاز مذہب و ملت، اس نوجوان قومی شاعر کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

اپنی شہرت کا سکہ بٹھا کر سنہ ۱۹۰۵ء میں اقبال نے دیار مغرب کا رخ کیا۔ اپنے تین سالہ قیام کے زمانے میں انھوں نے فارسی ادبیات، اسلامیات، فلسفے، اور خصوصاً فلسفۂ قدیم کا گہرا مطالعہ کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تمدن اور وضع معاشرت سے انھیں ایک بدظنی اور نفرت ہوگئی۔ چنانچہ قیام انگلستان کے دوران میں جو اشعار اقبال نے اپنے دوست (سر) عبدالقادر کے رسالے کے لئے بھیجے تھے ان سے شاعر کے اس بدلتے ہوئے رجحان کا پتہ لگتا ہے۔

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

جیسے جیسے اس تنفر میں اضافہ ہوتا گیا وہ رسول عربی کی سیدھی اور پرجوش تعلیم کے گرویدہ ہوتے گئے۔ اور بہ حیثیت فلسفی انھوں نے اسلام کے اصول کو نظر کے سامنے رکھکر ایک عالمگیر اخوت اور تکمیل فرد کا خاکہ ڈالا جس کو نہ تو نطشے اور نہ برگساں کے فلسفے سے کوئی تعلق ہے جیسا کہ اقبال کے بعض مغربی ناقدوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ "اسرار خودی" کے انگریزی اڈیشن کی اشاعت کے بعد ایک انگریز معترض کے جواب میں خود اقبال نے ڈاکٹر نکلسن کو ایک خط لکھا تھا جس میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے اپنا پہلو واضح کیا ہے۔ علاوہ اس خط کے شاعر کی فارسی اور اردو تصانیف میں بھی جا بجا فلاسفۂ مغرب کی تعلیمات سے بیزاری اور کم اعتقادی کا ثبوت ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ چند اشعار جو "ضرب کلیم" سے لئے گئے ہیں۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
محکم کیسے ہو زندگانی؟
کس طرح خودی ہو لازمانی
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

ایک نظم (علم و عشق) کے دو بند اور دیکھئے:-

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

بہرحال یہ خیالات اور احساسات لیکر سنہ ۱۹۰۸ء میں اقبال ہندوستان آئے۔ اہل ملک کی آس بندھی کہ اقبال کے منھ سے وہی اگلی تان (ہندوستاں ہمارا) نکلے گی۔ لیکن یہاں مضمون ہی کچھ اور تھا۔ بہتوں کو مایوسی ہوئی۔ لیکن اقبال نے پروا نہ کی اور کچھ دنوں "سارا جہاں ہمارا" اور "شکوہ" وغیرہ سنا کر فارسی زبان میں اپنا انوکھا دستور العمل مرتب کرنا شروع کیا۔

یہ محض ایک شاعرانہ خواب تھا جو "اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" کے اوراق میں مستور بھی عریاں بھی ہے۔

یہ دونوں مثنویاں ۱۹۱۵ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان شائع ہوئیں۔ لیکن اردو سے شاعر نے ابھی پورے طور پر عدم تعاون نہیں کیا تھا۔ اور اس کے انوکھے شاعرانہ فلسفیانہ دستورالعمل کے شائع ہونے سے کچھ پہلے اور بعد تک بھی چند اردو نظمیں چھپتی رہیں۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں جنگِ بلقان کے تاثرات اور عالمِ اسلام اور مسلمانوں کے اضطراب اور بے چینی کی جھلک صاف طور پر نمایاں ہے۔ یہ نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کم از کم مسلمانوں نے "ہندی ترانے" سے زیادہ ان نظموں کو سراہا۔ علاوہ اس کے موخوالذکر نظم میں شاعر کے بدلتے ہوئے رجحان اور معتقدات کی جھلک بھی بعض مقامات پر صاف نظر آتی ہے۔

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

قافلہ ہو نہ سکے گا کبھی ویراں تیرا
غیرِ یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا

"پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا" کا نعرہ ایک ایسا دھکا تھا جس کے بعد ہی قوم پرستوں کو اقبال کی جانب سے بالکل مایوسی ہوگئی۔ اور گو بہ حیثیتِ شاعر اقبال کی عظمت کے اس کے کٹر مخالفین بھی معترف رہے لیکن اقبال کی ہمہ اسلامی تحریک ایک مجذوب کی بڑ سمجھی جانے لگی۔ مگر شاعر اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے ۱۹۱۵ء و ۱۹۱۸ء میں (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا) اپنا منظوم دستورالعمل جس کی شیرازہ بندی میں اس کا شاعرانہ دماغ کئی سال سے مصروف تھا۔ آخر کار اہلِ ملک اور ہندوستان کے باہر رہنے والے مسلمانوں کی ہدایت کے لئے پیش کر ہی دیا۔ اور "شمع و شاعر" لکھنے کے بعد کئی سال تک اردو کا رخ نہیں کیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ "شمع و شاعر" اقبال کا بہترین کارنامہ ہے جس میں فلسفہ اور شاعری کو اس طرح سمویا گیا ہے کہ اس کا اگر تمام کلام بھی تلف ہو جائے تو اس کی عظمت کے منوانے کے لئے بس یہ ایک نظم کافی ہے۔ یہ نظم شاعر کی شاعرانہ سحرکاری، فلسفیانہ پرواز نظر، جوشِ عمل اور انوکھی روحانیت کا نچوڑ ہے۔ انتخاب میں وہ بات کہاں پھر بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرارِ حیات
یہ کبھی گوہر، کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا

دہر میں عیشِ دوام آئین کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

وائے ناکامی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو، بحر تو، کشتی بھی تو، ساحل بھی تو

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

دیکھ تو کے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور
خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

برطانوی سامراج کے کارندے آخری دو بندوں کے اشعار کا پورے طور پر مطلب سمجھ لیتے تو نہ جانے کیا غضب ڈھاتے۔

"اسرار" اور "رموز" اور "شمع و شاعر" کی اشاعت کے بعد ایک زمانے تک اقبال نے اور کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خاموشی بے سبب نہ تھی اس لئے کہ جنگِ عظیم نے اقوامِ عالم کو پریشان اور بدحواس کر دیا۔ علاوہ اقبال کے تصورات کی بنیادیں ہلادی تھیں "اتحادیوں" کے ہاتھ میں "ٹرکی" کی جان کھلائے پڑے تھے اور شاعر کا ہمہ اسلامی خواب یک لخت زائل ہوتا نظر آتا تھا لیکن اقبال شاعر تھا اور کسی نہ کسی طرح اسے اپنے شاعرانہ وجود سے اوروں کو محظوظ کرنا اور اپنے وجود کا ثبوت دینا لازم تھا۔ لہٰذا اب اس نے عالمگیر اخوت اور خلافت کی بجائے تصوف اور تغزل میں پناہ لی چنانچہ "پیامِ مشرق" اور دیگر فارسی نظمیں اسی گریز کا نتیجہ ہیں۔ جہاں شعر و نغمہ اور محض فلسفیانہ پرواز نظر کے سوا کوئی تعمیری یا کام کا فلسفہ نظر نہیں آتا۔ جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد عالمی کساد بازاری "تجارتی پستی" اور بے روزگاری کے مسئلے نے اہلِ بصیرت کی توجہ کو شدت کے ساتھ اشتراکی زاویۂ نگاہ کی طرف کھینچا۔ ہمارے شاعر نے بھی ان مسائل پر ہندوستان کے خاص حالات کے تحت غور کیا اور اس ضمن میں پھر مغربی تہذیب کی غارت گری پر حملے کئے ہیں۔ کہیں کہیں حقیقی شعریت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ لیکن "اسرار" و "رموز" کا وہ جوش اور تعمیری جذبہ کہیں نظر نہیں آتا:

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ اِنَّ المُلوک
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اک جادوگری

دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

یہ اشعار شاعر کی مشہور نظم "خضرِ راہ" کے ایک بند سے لئے گئے ہیں۔ پوری نظم پر تفکر اور مایوسی کی ایک ہلکی سی چادر پڑی ہے۔ ادھر ادھر حسبِ عادت مغربی تہذیب اور ناخدایانِ مغرب کی عیاری پر لعن طعن ہے۔ لیکن وہ جذبۂ بے اختیار اور "ہمہ اسلامیت" کا خواب شاعر کی نگاہوں سے اوجھل نظر آتا ہے۔

اس نظم کی اشاعت کے دو تین سال بعد مصطفیٰ کمال نے ٹرکی کو ساحرانِ فرنگ کے پنجے سے نجات دلائی۔ دنیائے اسلام کی نظریں مصطفیٰ کمال کی طرف پڑنے لگیں۔ اقبال کے دل میں بھی امید اور شعر و نغمے کی لہریں بلند ہوئیں "اور طلوعِ اسلام" کے عنوان سے ایک نظم شاعر نے پیش کی۔ یہاں اقبال کی اُن میں پھر وہ آگ سی تڑپ صاف طور پر نمایاں ہے۔ لیکن یہ خوشی تا دیر رہنے والی نہ تھی اس لئے کہ مصطفیٰ کمال نے بعد میں جو کچھ کیا اس سے نہ صرف اقبال بلکہ تمام سادہ دل مسلمانوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ بہرحال اس نظم کے چند اشعار دیکھئے۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(جاری)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے / بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کے بعد سے اقبال نے پھر اس سراب رنگ و بو کا رخ نہیں کیا، اور نہ صرف اس میدان ہی سے منہ موڑا بلکہ ایک عرصے تک "گیسوئے اردو" کی شانہ گری بھی چھوڑ دی اور مولانا روم اور شمس تبریز کی دنیائے تصوف میں پناہ لی۔ یا اپنی اُس سلطنت دنیا میں جس کے نقوش "ملٹن" کی "گمشدہ فردوس" اور "معاودت" کے آسمانی طریقے سے آنکھیں ملاتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ تک اقبال پر اپنی من بھاتی امیدوں کے خاک و خون میں مل جانے کا اثر ضرور رہا ہوگا۔ مخالفوں کی جلی کٹی باتیں زخم پر نمک کا کام کرتی ہوں گی۔ یہ اور بات ہے کہ "میخانہ" "لا تقنطوا" کا یہ پرانا دردی کش "تا دیر" اثر نہ لے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی "ہمہ اسلامیت" "ہمہ مجذوبیت" کی مترادف قرار دی جائے اور اس کا دل بے چین نہ ہو؟ جب اس کا تصور کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے بے اختیار وہ سماں بندھ جاتا ہے جب کہ انگلستان کا برگزیدہ نابینا شاعر (جان ملٹن) اپنی پر زور تحریک کی شکست کے بعد اپنے امرت بھرے قلم سے وہ لازوال نقوش تیار کر رہا تھا جن میں جا بجا عبرانی رسولوں کے غضب کی شان دمکتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں بھی بعض مقامات پر وہی دلکش شانِ غضب ہے۔ "جاوید نامے" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو اُس حصے سے ماخوذ ہیں جہاں شاعر "فلک زہرہ" پر خدایانِ کہن کو شاداں دیکھتا ہے جو محفلِ تعطیل سجا رہا ہے کہ حق اور دینِ برحق کی کیسی خواری ہوئی اور کس طرح دنیا از سرِ نو بت پرستی اور حیلہ جوئی کی طرف عود کر رہی ہے۔

آدم، این نیلی تتق را، بر درید / آن سوئے گردوں، خدائے را ندید
جانش از محدود، می گردد قرار / بوکہ عہدِ رفتہ، باز آید پدید
زندہ باد افرنگیِ مشرق شناس / آنکہ ما را از لحد بیروں کشید
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در جہاں، حلقۂ وحدت شکست! / آلِ ابراہیم بے ذوقِ الست!
صحبتش پاشیدہ، جامش ریز ریز / آنکہ بود از بادۂ جبریل مست!
خونِ او سرد، از شکوہِ دیریاں / لاجرم پیرِ حرم، زنار بست!
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در جہاں باز آمد ایامِ طرب / دین ہزیمت خوردہ از ملک و نسب!
از چراغِ مصطفیٰ اندیشہ چیست؟ / زانکہ او را پف زند صد بولہب!
اہرمن را زندہ کرد افسونِ غرب / روزِ یزداں زرد رو از بیمِ شب! (نغمۂ بعل۔ جاوید نامہ)

"جاوید نامہ" واقعی جاوید نامہ ہے۔ لیکن اس لازوال کتاب اور اس "قرآنِ ثانی" پر جو مولانا روم کی مثنوی کی طرح پہلوی زبان میں ہے تفصیلی نقد و تبصرے کا موقع نہیں۔ اقبال کی فارسی شاعری کے سلسلہ میں اگر موقع ملا تو اس پر تفصیلی تنقید کروں گا۔

بہرحال اقبال کا فلسفیانہ خواب "ناکام ہوا" اور ناکام ہونا اس کی تقدیر میں تھا۔ لیکن بہ حیثیت شاعر اُس نے اپنی شاعری پر تغزل اور نغمہ و رنگ کے ایسے لطیف پردے ڈالے ہیں کہ پڑھنے والا اس بھول بھلیاں کی ہنسی خوشی سے سیر کرتا ہے۔ "زبورِ عجم" "جاوید نامہ" "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" اسی قبیل کی چیزیں ہیں جہاں شاعر کے طلسم میں پھنس کر انسان یہ محسوس تک نہیں کرتا کہ یہ وہی شاعر ہے جس نے کبھی "نیا شوالہ" تعمیر کیا تھا، یا وہ شاعر جو "طلوعِ اسلام" میں اپنے انوکھے خواب کو پورا ہوتا دیکھتا تھا۔

لیکن اقبال کے فلسفیانہ خواب کا طلسم ٹوٹنے کے بعد بھی اس کی شاعری کا طلسم برقرار ہے۔ یہ ہے شاعرانہ ساحری اور یہی حقیقی اقبال کہ وہ شاعر پیدا ہوا، شاعر رہا، شاعر مرا۔ فلسفہ اس کے لئے ایک کتابی چیز تھی۔ فلسفے کی رو میں وہ کچھ دنوں ادھر ادھر بہتا رہا۔ لیکن شعر و شاعری اس کا دامن تھامے جاتی تھی۔ اسی میں اس نے سکون پایا۔ اور اسی کے ذریعہ اس نے اوروں کو سکون بخشا۔

ہو سکتا ہے (بلکہ یقین کے ساتھ کہا جائے گا) کہ اسے اسلام اور رسولِ عربیؐ سے عشق تھا۔ لیکن آج کل کے بعض قومی رہنماؤں کی طرح عملی سیاسیات اور دھوم بکھیڑوں میں پھنس کر پرچاری اور اچھوت بننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ عمر بھر اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں بیٹھ کر درویشانہ زندگی بسر کرتا رہا۔ اور اس رنگ کو مرتے دم تک نباہا ہے

سر آمد روزگارِ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

ابوظفر عبدالواحد

آہ اقبال

مل گیا خاک میں اب علم و عمل کا رہبر
اٹھ گیا دہر سے اسلام کا بیدار نظر

اس کی آواز میں اک درد بھرا رہتا تھا
زخمِ دل اس کی صداؤں سے ہرا رہتا تھا

آج قدرت کے ارادوں کا مفسر نہ رہا
جس کی مٹھی میں دل و جاں تھے وہ ساحر نہ رہا

اب نظر آئے گا ہم کو نہ جمالِ نغمہ
مٹ گیا عالمِ فانی سے کمالِ نغمہ

چشمِ انجم کے اشارے کوئی دیکھے تو سہی
حسنِ مطلق کے شرارے کوئی دیکھے تو سہی

آسماں شوخیٔ بے باک سے محروم ہوا
اور جہاں نغمۂ افلاک سے محروم ہوا

اس کے افکار میں گہرائی سمٰوات کی تھی
اس کی آہوں میں چمک تلخیٔ آفات کی تھی

شعر سے تازگیٔ قطرۂ شبنم پیدا
اس کی ٹھنڈک سے تصور میں تھا اک نغمہ پیدا

محفلِ علم میں اب شعر کا اعجاز کہاں
نغمۂ انجمِ تاباں کا نواساز کہاں؟

آہ اسلام کی دولت کے لٹانے والے
آہ ظلمت میں نئی راہ دکھانے والے

آہ وہ شمع کہ جو عشق کی محفل میں نہیں
آہ وہ موج کہ جو حسن کے ساحل میں نہیں

جب عرب اور عجم پر تو عیاں ہوتا تھا
تجھ پہ اک برقِ تجلی کا گماں ہوتا تھا

میں نے تجھے خاک کی آغوش میں پایا ہی نہیں
میں نے تجھے تنگ فضاؤں میں گنوایا ہی نہیں

تو ہے اس وسعتِ جاوید میں سرگرمِ سفر
جو شب و روز تری فکر کے تھی پیشِ نظر

انجم و خاور و مہتاب ہے منزل تیری
روحِ حالیؔ ہے فرشتوں کے مقابل تیری

تیغِ فاروقؓ کے انوار دکھانے والے
فقرِ حیدرؓ کو دل و جاں میں بسانے والے

پیرِ رومیؒ تجھے دامن میں چھپا لیتے ہیں
عرش والے تجھے سینے سے لگا لیتے ہیں

باقی

اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر

اقبال اپنے وقت کا بڑا شاعر تھا۔ دنیا کی نظر میں "بڑے شاعر" کا مفہوم جو بھی ہو میرے خیال میں بڑا شاعر وہ ہے جس کا کلام آئینہ ہو اس کی سیرت، فکر و بصیرت کا۔

وہ شاعر جو مفکر نہ ہو جو زندگی کو کسی زاویۂ نگاہ سے نہ دیکھتا ہو جس کا کوئی خاص نصب العین نہ ہو، اور جو اپنے کلام میں اپنے معاصرین اور آنے والی نسلوں کے لئے کوئی پیام نہ رکھتا ہو ایک معمولی قسم کا نظم گو ہے۔ چاہے اس کا انداز بیان کتنا ہی پرشکوہ کیوں نہ ہو اور کلام کیسا ہی موثر۔ وہ دنیائے تغزل اور عالم رنگ و بو کے چار عناصر سے باہر نہیں جا سکتا۔

اقبال شاعر بھی ہے اور مفکر بھی۔ وہ مصلح بھی ہے اور پیامبر بھی۔ اس کی دنیائے شاعری امید اور نوید سے بھرپور ہے۔ اس کے کلام میں یاس و حرماں کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ اس کا دل آماجگاہ ہے امیدوں کا۔ اس کی ذہنیت مرکب ہے توقعات سے اور اس کی روح متمسک ہے آیۂ ربانی لا تقنطوا من رحمتی سے۔

چونکہ اقبال بڑا شاعر ہے اس کے ہر لفظ سے اس کے جذبات ٹپکتے پڑتے ہیں اور اس کے کلام میں اس کے افکار جھلکتے ہیں۔ جو بات دل سے نکلتی ہے دلوں کو گرما جاتی ہے۔ اس لئے اس کا کلام پرزور اور بلند آہنگ ہونے کے علاوہ پرتاثیر بھی ہے۔ اس کے کلام میں رجائیت کا عنصر بہت زیادہ ہے جس کے اسباب کو دریافت کرنے کے لئے شاعر کے خیال، پیام اور فلسفہ پر بھی ایک نظر ڈالنی پڑے گی۔ اقبال ایک بلند نصب العین رکھنے کے علاوہ ایک منظم فکر اور خاص مسلک خیال کا حامل ہے۔ وہ اپنے خیال کے اظہار کے لئے ایک ایسا رنگ اختیار کرتا ہے جو اس کے باطنی اضطراب اور شدید جذبات کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ اس تڑپ کے اظہار کو بھی جو ملت بیضا کے لئے اس کے دل میں ہے اپنا فرض منصبی خیال کرتا ہے۔ شکوہ، جواب شکوہ، فریاد امت وغیرہ اقبال کی وہ نظمیں ہیں جن کا مقصد ملت کے مضمحل قویٰ اور نیم مردہ جسم میں زندگی کی روح اور قومی اخلاق و ادبیات میں نشاۃ جدیدہ کا پیدا کرنا ہے۔ وہ حیات کو مغربی رنگ کی کورانہ تقلید سے الگ رکھنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مشاہیر اسلام اور اسلاف کا بار بار ذکر کرتا اور اپنے مسلک خیال کو اپنے ہی الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

"میری نظموں کے متعلق بعض ناخدا ترس لوگوں نے غلط باتیں مشہور کر رکھی ہیں۔ اور مجھ کو پان اسلامزم کی تحریک پھیلانے والا بتلایا جاتا ہے۔ مجھ کو پان اسلامسٹ ہونے کا اقرار ہے اور میرا یہ اعتقاد ہے کہ ہماری قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور جو مشن اسلام کا اور ہماری قوم کا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ شرک اور باطل پرستی دنیا سے ضرور رخصت ہو کر رہے گی۔ اور اسلامی روح آخر کار غالب آئے گی۔ اس مشن کے متعلق جو جوش اور خیال میرے دل میں ہے اپنی نظموں کے ذریعے سے تمام قوم تک پہنچانا چاہتا ہوں اور اس اسپرٹ کے پیدا ہونے کا خواہش مند ہوں جو ہمارے اسلاف میں تھی کہ باوجود دولت و امارت کے وہ اس دار فانی کی کوئی حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ میں جب کبھی دہلی آتا ہوں میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہمیشہ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی کے مزار پر جایا کرتا ہوں اور وہاں کے دیگر مزارات وغیرہ پر بھی ہمیشہ حاضر ہوا کرتا ہوں۔ میں نے ابھی ایک شاہی قبرستان میں ایک قبر پر الملک للہ کا کتابہ لکھا ہوا دیکھا۔ اس سے اس اسلامی جوش کا اظہار ہوتا ہے جو دولت اور حکومت کے زمانے میں

مسلمانوں میں تھی۔ جس قوم اور جس مذہب کا یہ اصول ہو اس کے مستقبل سے نا امیدی نہیں ہو سکتی۔ اور یہی وہ پان اسلامزم ہے جس کا شائع کرنا ہمارا فرض ہے اور اس قسم کے خیالات کو میں اپنی نظموں میں ظاہر کرتا ہوں"۔

قلب شاعر کے یہی وہ محرکات ہیں جو اس کو کبھی مایوس ہونے نہیں دیتے۔ اقبال کی نظر میں اسلام اور مسلمان کا مفہوم بہت وسیع تر۔ اس کا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہی کیا جس میں فقرِ حیدری سیاستِ فاروقی، رومی کی بصیرت اور شاہین کی بصارت نہ ہو۔ مومن فخرِ موجودات اور صاحبِ ممکنات ہے ؎

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں — مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی
کافر ہے مسلماں تو نہ شاہی نہ فقیری — مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی
کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ — مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی
عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث — مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

مومن کی شانِ استغنا بھی ملاحظہ ہو۔

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔ خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

اقبال اپنی وسعتِ نظر، علوِ خیال اور بلند حوصلگی میں مثل ایک شاہین کے ہے جو آسمانِ فکر و تخیل کی نیلی فضاء میں مصروفِ پرواز ہو۔ جس طرح شاہین کی آنکھیں دور بین ہوتی ہیں۔ اقبال کی بصیرت دورِ حاضر کی مادی دنیا کے کوینی اور تخریبی حالات کو سر افلاک بلندیوں سے دیکھتی ہے اور اس طرح حکم لگاتی ہے۔

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ — سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے
خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے — فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے
الٹ جائیں گی تدبیریں بدل جائیں گی تقدیریں — حقیقت ہے نہیں میرے تخیل کی یہ خلاقی

یہی وہ رجائیت ہے جس نے شاعر کے کلام میں جان ڈال دی ہے۔

اقبال کا پیام پیامِ عمل ہے۔ پیام جد و جہد ہے۔ اس کی شاعری میں "بڑھے چلو" اور "چلے چلو" کی صدا گونجتی نظر آتی ہے۔ وہ ابراہیم ادہم کی طرح ترک ماسوا اللہ کرنے کا قائل نہیں بلکہ اس کا اعتقاد ہے کہ "ز منزل جادۂ پیچیدہ خوش تر"۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر — چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو — کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو
تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں — وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

فضا تری مہ و پروین سے ہے ذرا آگے ۔۔۔ قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

مختصر مضمون میں مثالیں پیش کرنے کی کم گنجائش ہے۔ اقبال کی رو سے حقیقت کی منزلِ مقصود تک ایک جہدِ مسلسل کی بدولت رسائی حاصل ہوتی ہے۔ جو کچھ ہے عمل ہے اور وہ عمل اسلامی تعلیمات کی حقیقی پیروی ہے۔ اس کا ایقان ہے کہ انسان نائب خدا اور حاملِ اسرارِ خداوندی ہے۔ وہ اپنے فرضِ منصبی کو اس وقت پورا کر سکتا ہے جب وہ دنیا کو ترک نہ کرے بلکہ دنیا پر حکومت کرے۔ نفس امارہ کا غلام نہ بنے بلکہ اس کو اپنا غلام بنائے۔ ظالم کے ظلم کا شکار نہ ہو جائے بلکہ اپنے جائز حقوق کی آخر دم تک محافظت کرے۔ قوانینِ قدرت سے آگاہی حاصل کرے اور ان پر عمل کے ساتھ تصرف حاصل کرے۔

رگوں میں گردشِ خوں ہے اگر تو کیا حاصل ۔۔۔ حیات سوزِ جگر کے سوا کچھ اور نہیں

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی ۔۔۔ جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر ۔۔۔ کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی

رائی زورِ خودی سے پربت ۔۔۔ پربت ضعفِ خودی سے رائی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے ۔۔۔ خدا بندے سے خود پوچھے "بتا! تیری رضا کیا ہے"

اقبال کا "پیام مشرق" المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے۔ گوئٹے کے مغربی دیوان کے ٹھیک سو سال بعد پیام مشرق دنیا رونشاس ہوتی ہے۔ گوئٹے کے مغربی دیوان کی اشاعت کا زمانہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فرانس دورِ انقلاب سے گزر رہا تھا۔ جرمن قوم کا زوال ہر پہلو سے نمایاں تھا۔ جرمنی کے مشاہیر شعرا، ادیب اور مفکر خارجی دنیا کی کشمکش اور ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر فطرت انسانی کی کھوج میں لگتے ہیں۔ اور کائنات کی گہرائیوں میں اپنے افکار کو لے جاتے ہیں۔ شعراء اور ادیب کبھی تو حافظ کے رنگ کو پسند کرتے ہیں (جیسے فان ہیمر اور گوئٹے) اور کبھی سعدی کو سراہتے ہیں۔ کوئی نظامی کا دل دادہ ہوتا ہے (جیسے شلر) تو کوئی رومی کا (جیسے رد کرٹ)۔ غرض یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن مفکر، شاعر اور ادیب کا طائرِ خیال تیرہ ماحول سے تنگ آکر اس نشیمن کا متلاشی تھا جو عالم کون و فساد سے بہت بلند ہے۔

پورے سو سال بعد مشرق کے مایۂ ناز شاعر نے پیام مشرق کو پیش کیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اسلامی ممالک سیاسی انحطاط کے پست ترین منازل سے گزرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جمود و سکون کا تسلط ہر طرف نظر آتا ہے۔ اس نازک وقت میں ایک عالی ہمت ہستی اپنا ولولہ خیز جان آفریں پیام سنا کر موت کے سناٹے میں زندگی کی گونج پیدا کر دیتی ہے۔ آہ! غریق رحمت کرے خدا اس محسن قوم کو جس نے مرتے دم تک قوم کی خدمت کی۔ اس کی شاعری صور اسرافیل سے کم نہ تھی جس نے سوتوں کو جگایا اور جاگتوں کو حیاتِ تازہ بخشی۔ کیسی مبارک ذات تھی اقبال کی جس نے عین وقت پر قوم کے درد کو سمجھا اور ایک ایسا پیام پیش کیا جو عشق کے سوز و گداز کو ظاہر کرتے ہوئے فطرت کے اسرار، انسانی ہستی کے رموز اور اس کی لامتناہی وسعتوں کو لئے ہوئے ایک نشاۃِ جدیدہ کو پیش کرتا ہے ؎

تا مرا رمزِ حیات آموختند ۔۔۔ آتشے در پیکرم افروختند

یک نوائے سینہ تاب آوردہ ام ۔۔۔ عشق را عہدِ شباب آوردہ ام

اقبال نے اپنے اور المانوی شاعر گوئٹے کی نسبت کیا اچھا کہا ہے ؎

اوچو بلبل در چمن فردوس گوش	من بہ صحرا چوں جرس گرمِ خروش
ہر دو دانائے ضمیرِ کائنات	ہر دو پیغامِ حیات اندر ممات

شاعر کا حساس دل زمانہ کے حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس جمود و سکون کا وہ متحمل نہیں ہوتا جو اس کے ماحول میں موجود ہے اس کو مٹانے کے لئے وہ انقلاب کا خواہاں ہے جو ایک ولولۂ حیات کوششِ پیہم اور آزادیٔ ضمیر کا حامل ہو۔ وہ جمود قوم سے رنجور ہے اس کا دردِ دل اس کے ہر لفظ سے ٹپکتا ہے خصوصاً وہ اشعار جو شاعرِ مشرق نے حکیم سنائی کے مزار پر ایک خاص حالت میں لکھے اس کے جذبات کا آئینہ ہیں۔ یہ اشعار حکیم سنائی کے اس مشہور قصیدے کی بحر میں موزوں ہوئے ہیں جس کا مطلع ہے۔ ؎

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں والا	قدم زیں ہر دو بیروں نہ نہ اینجا باش و نے آں جا

حکیم نے اپنے اشعار میں عارفانہ حقائق کے موتی رولے ہیں مگر اقبال کے اشعار ایک خاص کیفیت شدید جوش اور قومی درد میں ڈوبے ہوئے ہیں ؎

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی	یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے	گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا
لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے لا سے	مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا
اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موجِ تند جولاں بھی	نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ و بالا

لیکن باوجود قوم کی سیاسی معاشرتی اور اقتصادی پستیوں سے اس قدر متاثر ہونے کے وہ مایوس نہیں ہوتا۔ اس نے کبھی اپنی قوم کو یہ کہہ کر پست ہمت نہیں کیا۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر	مجھے تو اُن کی خوش حالی سے ہے یاس

بلکہ اس کے وجدان میں امیدوں کی بستی آباد ہے۔ ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ	کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

اقبال ایک سچا مسلمان ہے۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا نہیں جانتا۔ کوشش کرنا اور کامیابی کی دعا کے اثرات پر یقین رکھنا اس کا ایمان ہے۔ ایک فلسفی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال عالم و مافی العالم کو ایک خاص زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کے شاعرانہ وجدان کی مثال ایک ایسے سمندر کی ہے جس کی پرجوش اور طوفان خیز موجوں میں تلاطمِ خیال اور پیامِ عمل ہے اور جس کی گہرائیوں میں زندگی کے ارتقا اور تعلیمِ روحانی کے بیش بہا گوہر ہیں۔

وہ خود ایک فلسفی ہے اور تاریخِ فلسفہ کا مبصر بھی۔ ارسطو و افلاطون، سینا و فارابی سے لے کر ہیگل، نطشے، فشیلر، کارل مارکس، برگساں اور آئنسٹائن کے نظریوں پر عالمانہ و ناقدانہ عبور رکھتا ہے۔

چونکہ وہ خود ایک منظم فکر کا حامل ہے اس لئے ان شعرا سے کچھ نسبت ہی نہیں رکھتا جو صرف تغزل کی زمینوں کو محدود سمجھ کر تصوف اور فلسفہ کے عارضی زور میں ایک جدید عالمِ رنگ و بو پیدا کر جاتے ہیں لیکن چونکہ ان کے دل و دماغ کسی محکم خیال و فلسفۂ حیات سے خالی ہوتے ہیں ان کی شاعری روایتی تصوف اور عارضی فلسفہ نگاری کے جھونکوں میں جھول جھول کر رہ جاتی ہے۔ برخلاف اس کے اقبال کے جذبات مثل ایک ابلتے چشمے کے ہیں جس کے سوتے خاکدانِ حیات سے ابلنا چاہتے ہیں۔ اور شکوہِ خیال اور حوصلہ کی بلندی میں

سب اس
اپنی آپ نظیر ہیں ؎

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے — یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

اقبال کا فلسفہ مغرب و مشرق کے افکار کا خوش گوار امتزاج ہے۔ اقبال اسلامی تعلیم، اسلامی اخلاق اور اسلامی اشراق کا پیامبر ہے مگر اس کا پیام تعلیم جدید رنگ کا ہے۔ اس کا فلسفۂ حیات مغربی و مشرقی حکمت کا ایک مفید مرکب ہے۔ وہ اجتناب کرتا ہے اس مادی فلسفے کی جو مغربی حکمت کا ماحصل ہے اس مادی مفاد اور فانی مسرتوں سے جو مغربی ترقی کا حاصل سمجھی جاتی ہیں۔ روحانیت کا فقدان اس کے لئے ناقابل برداشت اور قابل ملامت ہے ؎

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن — پرکار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے
یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب — بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب
نگاہِ فرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے — کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
گرچہ ہے دلکشا بہت حسنِ فرنگ کی بہار — طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر

وہ اس حد تک مشرقی اشراقیین کا ہم نوا ہے۔ جذب و عشقِ حقیقی کے بغیر معرفت ناممکن الحصول ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی — نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق
حدِ ادراک سے باہر ہیں باتیں عشق و مستی کی — سمجھ میں اس قدر آیا کہ دل کی موت ہے دوری

اقبال بصارت اور بصیرت میں اسی طرح فرق کرتا ہے جس طرح دوسرے اسلامی عرفا کرتے ہیں۔ ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب — آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی — کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

اگرچہ اس معاملہ میں وہ مشرقی اشراقیین کا ہم نوا ہے تاہم اس کا فلسفۂ اشراق عام اشراقیین سے ایک لحاظ سے جدا ہے۔
تمام اشراقیین عالم چاہے وہ کسی ملک، مذہب و ملت کے ہوں اس عقیدے میں متفق ہیں کہ (۱) ادراکِ حقیقت ممکن الحصول ہے۔ (۲) اس ادراک کا ذریعۂ حصول جذبِ باطنی ہے یعنی وہ ایک حال کا عالم ہے جس کے لئے قیل و قال کا ظرف موزوں نہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو بیان میں نہیں آ سکتی اور اس کا تجزیہ و ترکیب ممکن نہیں۔ (۳) روحانی شعور کے روشن ہونے سے ادراکِ حقیقت یا شہود حاصل ہوتا ہے۔ جس کا مقصد سکونِ ابدی حاصل کرنا ہے۔ سکون اس عالم کو کہتے ہیں جس میں طالبِ حقیقت کو انتہائی مسرت اور انتہائی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ وہ عالم ہے جس میں داخل ہو کر طالب و مطلوب ایک ہو جاتے ہیں اور ایک سرمدی شعور حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی متصوفین کا بھی کم و بیش یہی عقیدہ ہے۔ جیسا ان کے مکتوبات اور ملفوظات سے ظاہر ہے۔
اس کے علاوہ اقبال فلسفۂ تصوریت کا قائل ہے اور اس معاملہ میں غالب کا ہم نوا ہے۔

غالب — ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
اقبال — نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین — اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

اس کے سوا اقبال کا فلسفۂ حیات برگساں کے فلسفہ سے ماخوذ نہیں تو مماثل ضرور ہے۔ برگساں کے فلسفہ کے لحاظ سے عالم تغیر کو کون و فساد کا

مرکز خود متحرک ہے یعنی حقیقت خود متغیر بھی ہے اور باعث تغیر بھی اور اس کا یہ تغیر دوامی اور مسلسل ہے۔ ؎

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

برخلاف اس کے افلاطون کے خیال سے عالم کا ظہور تصورات مجردہ سے ہوتا ہے جو تغیر اور کون و فساد سے ماوراء ہیں۔ ارسطو کے نزدیک حقیقت محرک عالم ہے مگر خود غیر متحرک۔ صوفیائے کرام کہتے ہیں (جس کی سند کلام پاک سے مل جاتی ہے) عالم خلق کا دارومدار عالم امر اور اعیان ثابتہ پر ہے اور یہ عالم بھی متغیر نہیں ہو سکتا۔ ہاں تغیر پیدا کر سکتا ہے۔ برگساں کے خیال کی رو سے حقیقت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اور اس کا مسلسل تغیر ہی زمانی اور مکانی تعینات کا باعث ہوتا ہے جو اس کے دائمی تغیر کی سطحی حالتیں ہیں جس کا ادراک شعور کی گہرائیوں میں داخل ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ اقبال نے بھی اسی مسلک خیال پر زور دیا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ حقیقت خود متحرک ہے اور تغیر پیہم ہی زندگی ہے اس لئے وہ مخلوق جو جدوجہد متصل اور کوشش پیہم کو اپنا نصب العین بنائے حقیقت کے خلاف ورزی کرتی ہے اور قدرت سے جنگ کرنا اور منشائے حقیقی سے اختلاف کرنا فنا کا پیش خیمہ ہے۔ اسلام بھی کوشش اور عمل کا حکم دیتا ہے۔ ہادئ برحق نے اسی کی تلقین کی اور فرما دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ کوشش کرو اور اس کی رحمت کے امیدوار رہو۔ اقبال کا مسلک خیال بھی یہی ہے کہ خدا اپنا وعدہ پورا کریگا اور ضرور کریگا ؎

نہیں دیر لگتی اسے کرنے بار
نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

کہ ہر مسلماں کا فرض اولین اسلامی تعلیمات کی پیروی ہے۔ اقبال نطشے کے خیال "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا بھی قائل ہے۔ وہ طاقت اور زور کا دلدادہ ہے۔ وہ فوجی قوت کا بھی خواہاں ہے۔ 'مومن' بے خوفی اور حق کے لئے جنگجوئی کا مداح ہے۔ اس حد تک وہ نطشے کا ہم زباں ہے۔ لیکن نطشے جنون کی حد تک زور اور قوت کا قائل ہے۔ اس کے خیال سے سب کچھ زور اور فوجی قوت کا نتیجہ ہے۔ افسوس ہے کہ ہم یہاں نطشے کے خیالات کا ترجمہ نہیں کر سکتے مضمون کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس کے اصلی جذبات عریاں کر دیئے جاتے۔ اقبال باوجود نطشے کا مقلد ہونے کے اس کے ان خیالات سے محترز ہے جن میں دہریت کی بو آتی ہے۔ وہ طاقت چاہتا ہے لیکن صداقت کے ساتھ، قوت اور زور کا قائل ہے لیکن ساتھ ہی مادہ پرستی اور دنیا پرستی سے متنفر۔ وہ دنیا پر تصرف چاہتا ہے لیکن عدل کے ساتھ۔ زور حیدری کے ساتھ سیاست فاروقی بھی چاہتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کا تفکر نطشے سے مختلف ہے۔ نطشے خدا کا قائل نہیں لیکن اقبال سچا موحد ہے۔ ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

یہی ہے وہ اسلامی تعلیم اور قرآنی وعدہ کے ایفاء کا ایقان ہے جس نے اقبال کو ہمیشہ امیدوار فضل و کرم رکھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ایک کامیاب شاعر بنا دیا کیونکہ امید دلا دلا کر آمادہ عمل کرانا نفسیاتی نقطۂ نظر سے عین فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ اقبال کے کلام میں رجائیت کا عنصر اس کے خیال، مسلک اور فلسفہ کا نتیجہ ہے مگر اقبال اسلامی تعلیمات کا اس درجہ پیرو، فریفتہ اور ثناخواں نہ ہوتا۔ اگر اسلام اور اصول اسلام سے اس کو ایسی شدید تسکین اور محبت نہ ہوتی اگر اقبال نے متصوفین اسلام کے مکتوبات کا اتنا گہرا مطالعہ نہ کیا ہوتا اور عرفاء اسلام اور کلام ربانی کے مطالب و فلسفہ پر ایسا عالمانہ اور ناقدانہ غور کیا ہوتا تو ایسا مکمل فلسفۂ حیات، پیام، تعلیم و مسلک خیال مرتب کر سکتا۔ اقبال کا کلام الہام سے کم نہیں اور اس میں رجائیت کا عنصر نفسیاتی نقطۂ نظر سے "قم" کی صدا ہے جو سوتوں کو جگاتی اور مردوں کو اپنے سحر آفریں اثر سے جلا دیتی ہے۔ اقبال کا ہم عصر ٹیگور گیتان جلی میں کم و بیش اقبال ہی کے فلسفۂ خیال کو پیش کرتا ہے۔ اس کے خیال میں حقیقی یوگ بھگتی یوگ ہے۔ عرفان حقیقی کے منازل عمل کے راستے سے طے ہوتے ہیں۔ اور روح نجات ابدی (مکتی) تک عمل ہی کے ذریعے سے پہونچ سکتی ہے۔ اس منزل تک پہونچنے کے لئے ترک دنیا کرنا، خانقاہ نشیں ہونا، ریاضت تسبیح و تہلیل میں وقت بسر کرنا ایک قسم کی روحانی خود غرضی ہے۔

لطیف النساء بیگم

اقبال کی نعتیہ شاعری

انسان کامل سے ان کا قلبی ربط

در جہاں شمع حیات افروختی　　　بندگان را خواجگی آموختی

(کائنات میں آپ ہی نے شمع حیات روشن کی غلاموں کو سرداری سکھائی)

اردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں نعت گوئی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان ہر دو زبانوں میں نعت شریف کا وافر ذخیرہ موجود ہے ہر دور کے چھوٹے بڑے شعرا بقدر ہمت اس سعادت میں شریک ہوتے رہے۔ دور حاضر کے شاعر اعظم علامہ اقبال نے بھی اپنی مخصوص خلوت کے شایان شان پورے جوش اور اخلاص سے اس میں حصہ لیا۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ مشرق کے شاعر اعظم تھے اس اعتبار سے بھی کہ وہ انسانیت کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ ان کا یہ پیام انسانیت ناقص رہ جاتا اگر ان کا تصور انسان کامل تک رسائی حاصل نہ کرتا۔

علامہ اقبال کو ذات رسالتمآب ؐ سے غیر معمولی عشق و محبت تھی۔ ان کے حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ حب نبوی کے بغیر سد علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا مرجع اور مرکز ذات رسالتمآب ؐ ہی تو ہے۔

ایں ہمہ از لطف بے پایان تو　　　فکر ما پروردۂ احسان تو

(سب کچھ آپ کی عنایت بے پایاں ہی سے حاصل ہوا ہماری فکر آپ کی آغوش احسان کی پروردہ ہے)

علامہ اقبال کا یہ حب ان کے ترقی پذیر کلام کے ساتھ ساتھ بتدریج نکھرتا اور ترقی کرتا گیا تا آنکہ جب ان کا کلام انتہائی بلندیوں پر پہنچا تو ان پر مقامات "نبوت کبریٰ" بھی اسی لحاظ سے منکشف اور منقح ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضورؐ کا نام مبارک یا ذکر مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو ان کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو جاتیں۔ ابھی حال کا ذکر ہے کہ یوم اقبال" کے موقع پر مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لئے گئے تھے وہ اپنی اس ملاقات کا ذکر "جامعہ" میں یوں کرتے ہیں "دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے (۹) بجے تھے سلسلہ گفتگو ½ ۱۱ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں کچھ سنایا بھی مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں —

تو باش اینجا و با خاصاں بیامیز　　　کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلو گیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر بالکل آیتہ ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی۔ (بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی ؐ پر درود بھیجتے ہیں) کے استغراق کا پرکیف احساس ہے۔

نعت کے پاکیزہ موضوع پر علامہ اقبال کی مستقل نظمیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف نظموں، رباعیوں اور غزلوں میں کہیں کہیں جستہ جستہ اور کہیں مسلسل شعر بھی پائے جاتے ہیں۔ اسی سرمایۂ نجات و فلاح میں ایسے ایسے در شہوار موجود ہیں کہ آئندہ اہل دل اور اہل نظر کسب ضیا کریں گے۔ ملاحظہ ہو —

"عندلیب باغ حجاز" اپنے سینائے دل کی فضاؤں میں گرم پرواز ہوکر بارگاہ صمدیت میں یوں شرف مخاطبت حاصل کرتا ہے"

سہ۔ شکر شکوے کو کیا حسن ادا سے تو نے — ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

بارگاہ قدس سے اپنے حبیبؐ کی منت و ثنا میں ڈوبی ہوئی ادا آتی ہے۔

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے — نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے
قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے — دہر میں اسم محمدؐ سے اجالا کر دے

ذکر نبی کی ابدیت اور رفعت کی نوید سنائی جاتی ہے

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے — رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

اقبال کوئے حبیب کا سکندر دماغ گدا ہے۔ ماشاءاللہ کیا شان گدائی ہے کہ شوکت سلاطین اس کا طواف کرے۔

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغ سکندری

سبحان اللہ کیا سرفرازی ہے کہ فرشتے بارگاہ رسالت میں لئے جاتے ہیں۔ یہ "عندلیب باغ حجاز" یوں مخاطبت کی عزت حاصل کرتا ہے۔

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز — کلی کلی ہے تری گرمی نوا سے گداز

اقبال کا قلب صافی آٹھوں پہر سرخوش جام ولائے محمدؐ ہے اس کی شکست اور فتادگی غیرت دہ سجدہ ہائے نیاز ہے۔

ہمیشہ سرخوش جام ولا ہے دل تیرا — فتادگی ہے تری غیرت سجود نیاز

حضور رسالتمآب میں آبگینۂ دل نذر میں پیش کرتا ہے۔ جس میں امت کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا خون چھلک رہا ہے۔

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضرت صدیق اکبرؓ جن کا سینہ آتش عشق و محبت کا مجمر تھا، ایک دن سارا سرمایۂ روزگار حضور نبوی میں خدمت اسلام کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ان کے احساس فدائیت کی ترجمانی حضرت اقبال کی زبان سے سنئے۔

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر — اے تیری ذات باعث تکوین کائنات
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس — صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

حضرت بلالؓ جن کی فطرت "نور نبوت" سے "مستنیر" تھی ان کے بیتاب جان و دل کا بیان کیا خوب ہوا۔

نظر تھی صورت سلماں ادا شناس تری — شراب دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری

حضرت بلال کو مثل کلیم نظارے کا سودا تھا۔

تجھے نظارہ کا مثل کلیم سودا تھا — اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا

ادائے دید کے پردہ میں "نیاز و نماز" کی یکجائی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اشتیاقِ دید کی سعادت میں اقبال کا دل کس طرح شریک ہے۔ اس کا اندازہ کیجئے۔

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا | خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اس کا

سیرۃ طیبہ میں معراج ایک مہتم بالشان حقیقت ہے اس کا فیضان بقدر ظرف و ہمت ہر مسلم پر عام ہے۔

رہ اک گام ہے ہمت کیلئے عرش بریں | کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

نکتۂ معراج سرِّ سراپردۂ جاں ہے جس نے اس نکتہ کو سمجھا رفعتِ نظر کی ثریا اس کا ہدف بنی۔

ناوک ہے مسلماں ہدف اس کا ہے ثریا | ہے سرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

جس نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اس کا مد و جزر چاند کا محتاج رہا تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا ہے ترا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج۔

کہیں ملتِ مرحومہ کی تباہ حالی پہ اقبال بارگاہِ روحِ نبوی میں عرض کرتے ہیں۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر | اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ | آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اوپر عرض کیا گیا ہے جوں جوں اقبال کا رابطۂ محبت ذاتِ نبوت سے بڑھتا گیا ان کے قلبِ مجلّیٰ پر مقاماتِ نبوت کا انکشاف ہوتا گیا یہاں تک کہ انا من نور اللہ وکل خلقھم من نوری۔ (میں اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے) کے جاودانی کیف کو اقبال کی بصیرت نے پا لیا اور ان کی یہ بصیرت اس قدر بلند ہوئی کہ لطافت پر چھا گئی۔ اب وہ خودی کی خلوتوں میں کبریائی اور اس کی جلوتوں میں مصطفائی کا تماشا بے حجاب کرنے لگے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی | خودی کی خلوتوں میں کبریائی

ظاہرش این جلوہائے دل فروز | باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

اس موضوع پر نسبتاً علامہ اقبال کی فارسی نظموں میں نہایت لطیف اور نازک مضامین زیادہ آئے ہیں۔ ان سب کا احاطہ اس موقع پر ناممکن ہے۔ اس لئے فارسی کے چند شعر پیش کرکے مضمون ختم کئے دیتے ہیں۔

حضور کا ظہور، زندگی کا شباب ہے آپ کے جلوے کے بغیر زندگی ایک خوابِ بے تعبیر ہے

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی | جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی

حضور کے ظہور نے کائنات کے مدارج بلند و بالا کر دئے۔ آپ کی دولتِ فقر نے کائنات کو ابدی حقائق کا سرمایہ دار بنا دیا۔

فقرِ محمدی کو سرمایۂ کائنات کہنا حقیقت کی کتنی پاکیزہ تعبیر ہے۔

از تو بالا پایۂ این کائنات | فقرِ تو سرمایۂ این کائنات

حقیقی فقر و شاہی اسی ذات کے فیضان سے ہے یہ ساری تجلیاں اسی جلوے کی دریوزہ گری سے مالا مال ہیں:

فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰ | این تجلیہائے ذاتِ مصطفےٰ

عبدیتِ کبریٰ حضور کا مقامِ خصوصی ہے۔ اس مقام تک رسائی انسان کا کمال اور معراج ہے۔ حضور کا آشکارا دیدار اور حضور کی حقیقت کا واضح ادراک ہماری سیر اور معراج کا منتہا ہے اور ہم حضور کے ضمیرِ پاک میں اپنی مسجدِ اقصیٰ (انتہائی مقامِ عبدیت) پا لیتے ہیں۔

آشکارا دیدم نقش اسرائے ما — در ضمیرش مسجد اقصائے ما

قندھار میں حضور کے خرقہ مبارک کی زیارت کے بعد اقبال کے حسیات کا ارتعاش اور جذبات کا تلاطم دیکھیے۔

رقصد اندر سینه ام زور جنوں — تا ز راه دیده می آید برون

بوئے پیراہن پاک سے ان کی مشام جان معطر ہوجاتی ہے تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

آمد از پیراہن او بوئے او — داد مارا نعرهٔ الله ہو

آپ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت بلالؓ کے سرود محبت و کامرانی سے محظوظ ہوچکے ہیں اب ذرا ابوجہل کے نوحۂ ہزیمت و شکست کو بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ عہد جاہلیت کے افکار و عادات کے خلاف اسلام نے وحدت، اخوت، مساوات وغیرہ کی جو تعلیم دی ہے وہ متکبر مخالفین کے خیال میں فضل عرب کی تباہی کا باعث تھی۔ بوجہل اس پر نوحہ کرتا ہے۔ خصوصیات اور محاسن اسلام کا ذکر ابوجہل کے نوحہ میں نعت گوئی کا نادر پیرایہ ہے۔

مظہرِ شر سے اقرار خیر کا مشاہدہ کیجئے۔

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ — از دم او کعبہ را گل شد چراغ

اپنے تصور جہالت کے خلاف آواز سے بوجہل کا دل و دماغ ٹھکانے نہیں اس لئے سارا معاملہ سحر ہی سحر نظر آتا ہے۔

ساحر و اندر کلامش ساحری — ایں دو حرف لا الہ خود کافری

حالات سے پریشان ہوکر کائنات کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے۔

پاش پاش از ضربتش لات و منات — انتقام از وے بگیر اے کائنات

اس کا خیال ہے کہ حقیقت میں غائب و ناگہی خطا ہے جو چیز چشم محسوس سے اوجھل ہے وہ معدوم ہے۔

دیده بر غائب فروبستن خطا است — آنچه اندر دیده می ناید کجا است

اسلام نے ملک و نسب، فضل و شرف خاندانی کی پرستش پر پانی پھیر دیا ایک ممتاز قریشی کے ہاتھوں قبائلی اور نسلی بت کی شکست اس کے لئے حیرت انگیز ہے۔

مذہب او قاطع ملک و نسب — از قریش و منکر از فضل عرب

اسلام نے آقا و غلام رنگ و ملک کا امتیاز مٹا دیا مساوات کے خلاف عادت عمل اس کم احسان متکبر پر ایک کاری ضرب ہے۔

در نگاه او یکے بالا و پست — با غلام خویش بر یک خوان نشست

حضرت اقبالؒ کا جس قدر کلام نعت میں ہے وہ اس قدر بلند وسیع اور کثیر ہے کہ ایک ہی صحبت میں سب کا سب پیش نہیں کیا جاسکتا انشاء اللہ کسی اگلی صحبت میں اس کی تکمیل ہوسکے گی۔ ؎

فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

سید وحید اللہ وحید۔ (بھگنڈہ دکن)

آہ اقبال

ہندوستاں پہ چھائیں کیوں شام کی گھٹائیں ڈوبی ہوئی ہیں غم کے دریا میں کیوں فضائیں
پھیلی ہوئی ہے ہر سو کیوں موت کی خموشی کیوں آج ہے حکومت ہر چیز پر خزاں کی
کیوں زندگی سراپا مغموم ہو رہی ہے بے لطف اک کہانی معلوم ہو رہی ہے
لیلائے شب کی زلفیں کیوں منتشر ہیں اتنی کیوں زرد پڑ گئی ہے شکل آج چاندنی کی
آنسوؤں سے کیوں ہیں مژگان چشم انجم کیوں آج لب پہ ان کے رقصاں نہیں تبسم

کیوں چپکے چپکے شبنم آنسو بہا رہی ہے
پیغام موت لے کر کیوں صبح آ رہی ہے

رنگینیاں ادب کی آنسو نہ کیوں بہائیں کیوں شاعری کی شمعیں خاموش ہو نہ جائیں
اقبال وہ سپہر علم و ادب کا اختر وہ فخر ملک و ملت۔ وہ ہند کا سکندر
"بانگ درا" نے جس کی اسلام کو جگایا "پیغام" جس نے اپنا "مشرق" کو کہہ سنایا
وہ جس کی "بال جبریل" اہل سخن نے دیکھی "ضرب کلیم" جس کی سارے جہاں میں گونجی
وہ جس کی شاعری کا چرچا تھا آسماں پہ فریاد جس کی پہونچی دنیا سے لامکاں پہ
وہ جس سے زندہ شان اسلام ہو چلی تھی رنگین داستان اسلام ہو چلی تھی
مسلم کے دل میں پھونکی ایماں کی روح جس نے دہرائے جس نے قصے اک بار پھر احد کے
وہ جس کی ضو سے روشن ایوان شاعری تھا سرسبز جس کے دم سے بستان شاعری تھا
افسوس آج رخصت وہ ہو گیا جہاں سے ہم دوش ہے بہار شعر و ادب خزاں سے

گریاں رہیں گی آنکھیں ملت کی مدتوں تک
سونی رہے گی بزم معنی بھی مدتوں تک

علی احمد

یادِ اقبال

موت سے کس کو رستگاری ہے | آج وہ کل ہماری باری ہے۔

موت ہر شخص کے لئے ہے جو دنیا میں آیا ہے وہ جائے گا ضرور۔ انسان ہی نہیں بلکہ ہر جاندار کو فنا ہونا ضروری ہے لیکن مرنے مرنے میں بھی فرق ہے۔ یوں تو روزانہ ہزاروں انسان گزر جاتے ہیں کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ ایک وہ موت ہے کہ ایک شخص کے مرنے سے بہت سوں کو رنج ہوتا ہے اُس کی یاد ایک زمانہ تک دوسروں کے دلوں میں تازہ رہتی ہے۔

سر محمد اقبال مرحوم ہمارے شہر کے رہنے والے نہ تھے لیکن ان کے انتقال کی خبر جب حیدرآباد میں پہنچی تو تمام شہر میں بجلی کی طرح گونج گئی بڑے بڑے تعزیتی جلسے ہونے لگے نوجوانانِ دکن نے بہت بڑا جلسہ کیا اور گاؤں گاؤں میں جلسے ہوئے۔ بہت سے اسکولوں میں جلسے ہوئے۔ سب سے پہلا جلسہ میں نے انجمن خواتین دکن کی جانب سے ۲۵ اپریل کو محل ممتاز یار الدولہ کی صدارت سے اسکول صفدریہ واقع ہمایوں نگر میں کیا۔ یہ جلسے وغیرہ آخر کس لئے ہوئے اس کی وجہ یہ تھی کہ سر محمد اقبال جب تک زندہ رہے انھوں نے اپنا وقت دوسروں کی بھلائی کے لئے دیا ایسی ایسی نظمیں جوشیلی لکھیں جس کی وجہ سے ہم بیدار ہوئے انھوں نے سونے والوں کو جگایا۔ اور اپنے ملک سے محبت کرنا سکھایا۔ انہوں نے زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے بتایا جو انسان دوسروں کے لئے محنت کرتا ہے جس کے دل میں خلوص رہتا ہے اس کی زندگی میں بھی اس کی قدر ہوتی ہے اس کے بعد بھی اس کی عزت ہوتی ہے۔ فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر ایران کی تاریخ کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا اس کی سالگرہ ہزار سالہ بھی ہوئی اس کی یاد پارسی مسلمان سب کے دلوں میں تازہ ہے یہ کس لئے صرف اس کی نیت اور خلوص کا سبب ہے کہ فردوسی کے مرنے کے بعد سالگرہ ہوئی لیکن اقبال مرحوم کی وہ عزت ہوئی کہ ان کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا میرے خیال میں کسی شاعر کی زندگی میں ایسی قدر و عزت نہ ہوئی ہوگی۔ مرنے کے بعد جلسے ہوئے تو کیا نہ ہوئے تو کیا مرنے والے کو تو کچھ اس کی خبر نہیں ہوتی۔ بقول شاعر۔

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہے | کہ ہم تو یہاں بھی اکیلے رہے۔

یہ اقبال کی اقبال مندی تھی جو اُن کی زندگی میں یومِ اقبال منایا گیا ان کو ضرور خوشی ہوئی ہوگی بلکہ روحانی خوشی ان کو ان کی زندگی میں حاصل ہوئی۔ اب بھی وہ مرے نہیں وہ زندۂ جاوید ہیں ان کا کلام اور ان کا نام ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اقبال کشمیر کے رہنے والے تھے انھوں نے اپنے بچپن میں جو اشعار کہے وہ لکھتی ہوں

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور | یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر | بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے | اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائیداد | جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موت اور زندگی پر مرحوم نے جو اشعار لکھے وہ قابل داد ہیں

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوشنوا — شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا
آہ کیا آئے ریاض دہر میں اور کیا گئے — زندگی کی شاخ سے پھوٹے کھلے مرجھا گئے

میں اقبال مرحوم کی زندگی کے حالات نہیں لکھ رہی ہوں اور نہ ان کا کلام لکھ رہی ہوں اس لئے کہ بہت سے لوگوں نے لکھ دیا ہے اقبال ابر نیساں کی طرح آئے اور موتی برسا کر ہمارے لئے چھوڑ گئے۔ سر محمد اقبال مرحوم سے میری خط و کتابت ۱۹۲۲ء سے تھی جب میں نے رسالہ النساء حیدرآباد دکن سے جاری کیا تھا تو رسالہ ان کی خدمت میں بھیجا انھوں نے جو خط مجھے لکھا تھا وہ درج کرتی ہوں۔

مکرمہ

تسلیم۔ رسالہ النساء کے لئے نہایت سپاس گذار ہوں یہ بہت اچھا رسالہ ہے مجھے یقین ہے کہ اس کا مطالعہ مسلمان عورتوں کے لئے بہت سبق آموز ہوگا۔ میں کچھ مدت سے اردو میں بہت کم لکھتا ہوں لیکن اگر کچھ اردو اشعار ہو گئے تو بھیجوں گا۔

محمد اقبال بیرسٹر لاہور ۲ نومبر ۱۹۲۲ء

اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں میں نے ایک خط اور لکھا تھا کہ آپ اپنا کلام رسالہ النساء کے لئے بھیجئے اس کا جواب آیا اس کی نقل بھی لکھتی ہوں۔

مخدومہ جناب صغرا ہمایوں بیگم صاحبہ

تسلیم۔ آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے جس کے لئے سراپا سپاس ہوں میری صحت ایک مدت سے خراب ہے اس واسطے لٹریری مشاغل کی طرف بہت کم توجہ کر سکتا ہوں۔

پیام مشرق نام ایک مجموعہ نظم جو فارسی میں ہے تیار ہو رہا ہے شاید دو تین ماہ میں شائع ہو جائے گا۔ انشاء اللہ ایک کاپی آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا لیکن چونکہ اندیشہ ہے کہ بھول نہ جاؤں اس واسطے اگر کتاب آپ کو نہ پہونچے تو بلا تکلف یاد دلا دیجئے۔ آپ کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہے۔ لیکن میں نے آپ کا خط جو ہزار داستان میں شائع ہوا ہے پڑھا ہے۔ اس خط کے پڑھنے سے مجھے خاص مسرت ہوئی۔ فریاد مرحوم کا شعر بڑی عظمت سے کس کو کلام ہو سکتا ہے جن کے شاگردوں میں شاد عظیم آبادی ہوں۔ امید کہ مزاج بخیر ہوگا۔

مخلص۔ محمد اقبال لاہور ۱۸ فروری ۲۳ء

۱۹۲۳ء تک بیرسٹر صاحب اور سر محمد اقبال صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ۱۹۲۸ء میں جب ہم کشمیر گئے راستہ میں لاہور چند روز ٹھہرنا ہوا ہمارے ہوٹل کے بازو میں سر محمد اقبال مرحوم کا مکان تھا پھاٹک پر بورڈ لکھا ہوا تھا

۱؎ جناب سید شاہ الفت حسینی صاحب فریاد عظیم آبادی میرے خسر تھے اور شاد عظیم آبادی سید ہمایوں مرزا صاحب کے عزیز بھی تھے اور حضرت فریاد کے شاگرد حضرت شاد نے حضرت فریاد کی سوانح عمری لکھی ہے جس کا نام حیات فریاد ہے۔

ماہ جون ۱۹۳۶ء

سب رس

بیرسٹر صاحب سر محمد اقبال سے ملنے گئے اس کے بعد ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی موٹر بھیجکر مجھے بلوایا۔ میں نے ایک نظم نورجہاں کے مزار پر چڑھانے لکھی تھی وہ ان کو دکھائی۔ اس میں مرحوم نے اصلاح دی اس لئے وہ میرے استاد بھی ہوئے اور میرے اوٹوگراف البم میں سر محمد اقبال صاحب نے انگریزی میں ایک مضمون لکھا جس کا اردو ترجمہ لکھتی ہوں ۔

اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں یعنی ۔ ذاتِ باری پر پورا بھروسہ ہے اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا

محمد اقبال لاہور ۱۱ جولائی ۱۹۲۸ء

اس سے ظاہر ہے کہ اُن کے دل میں موت کا ڈر کبھی نہ تھا ۱۹۳۶ء میں جو میرے اوٹوگراف میں لکھا تھا وہی جملے ان کے آخر وقت بھی زبان سے نکلے۔ وہ اپنی بیوی کو کہیں بھیجتے نہ تھے اور نہ کسی سے ملاتے تھے دوران گفتگو میں لیڈی عبدالقادر صاحب سے ذکر آیا میں نے کہا میں محمد اقبال صاحب کی بی بی کے ہاں گئی تھی انھوں نے چاکر پر مجھے بلایا تھا تو لیڈی عبدالقادر صاحب کو سخت تعجب ہوا انھوں نے کہا ہمارے صاحب سے اور محمد اقبال سے بہت دوستی ہے مگر آج تک ہم نے بیگم محمد اقبال کو نہ دیکھا اور آپ مل آئیں!

اس سے ظاہر ہے کہ وہ مہمان نواز دل رکھتے تھے اور مسافر کی قدر ان کے دل میں تھی اور ایک اتفاق عجیب ہوا ہم ۱۹۲۴ء میں لندن گئے کیمبرج میں ایک انڈین مجلس ہے جس میں ہر ماہ جلسہ ہوا کرتا ہے کسی نہ کسی بڑے آدمی کو دعوت دی جاتی ہے وہ تقریر کرتا ہے ۔

ہم جب لندن میں تھے اس زمانہ میں سر علی امام صاحب مرحوم کو تقریر کرنے انڈین مجلس والوں نے بلایا تھا سر علی امام نے بیرسٹر صاحب سے اور مجھ سے کہا آپ لوگ بھی چلیئے ۔ چنانچہ لندن سے کیمبرج تک لیڈی سر علی امام، سر علی امام صاحب سر کرشن گپتا صاحب اور بیرسٹر صاحب ہم سب موٹروں میں گئے وہاں جانے کے بعد مجھے سر کرشن گپتا صاحب اور وہاں کے لڑکوں نے کہا آپ بھی تقریر کریں آپ اردو میں تقریر کر سکتی ہیں یہ انڈین مجلس ہے علی امام صاحب کی تقریر کے بعد میں نے تقریر کی میری تقریر لوگوں کو پسند آئی ۔ جب ہم کیمبرج سے لندن واپس گئے سر علی امام صاحب اور سر کرشن گپتا صاحب نے میری تقریر کی بڑی تعریف لوگوں سے کی کہ یہ تیار نہ تھیں یک بیک مردانہ جلسہ میں زبانی تقریر کی لڑکوں کو خوب نصیحت کی ۔

اسکے بعد مس بک صاحبہ جن کے بھائی مسٹر بک علی گڑھ کالج کے پہلے پرنسپل تھے انھوں نے میرے لئے ایٹ ہوم جلسہ مقرر کیا جس میں عورتوں کی تعلیم پر تقریر کرنے مجھ سے فرمایش کی میں نے اردو میں تقریر کی اس کا ترجمہ انگریزی میں آفتاب اقبال نے کیا بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ سر محمد اقبال صاحب کے یہ بڑے فرزند ہیں۔

حضرت اقبال کے لئے ہم جس قدر رنج کریں کم ہے اب ہماری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں کہ ان کا جانشین کس کو قرار دیں یوں تو اردو و فارسی کے شعرا بہت ہیں لیکن اس جوش سے بیدار کرنے والا نہیں دکھائی دیتا۔

میں دعا کرتی ہوں کہ خدا سر محمد اقبال مرحوم کے پسماندوں کو صبر عنایت فرمائے اور ہم سب کو بھی صبر دے اور ان کی نصیحتوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے ہمیشہ ان کے مزار پر پھول برستے رہیں۔

صغرا ہمایوں مرزا

شاعرِ حکمت شناس

یہ صحیح ہے کہ ایک سائنسداں کے لئے وسعتِ عمل اور آلے ضروری ہیں لیکن لازمی نہیں۔ اس لئے کہ دنیا کے بعض بلند نظر سائنسداں یقیناً معملوں کی پیداوار نہیں تھے نہ اُن کے پاس اُن پیچیدہ اور حساس آلوں کا وجود تھا جن سے موجودہ سائنس متمتع ہے پھر بھی کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ہمارا بیشتر علم ان ہی بے سروساماں محققین کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ اور ہمارا سرمایۂ معلومات ان ہی مجاہدینِ بلند ہمت کے تجسس و تلاش کا رہینِ منت ہے جنھوں نے جہل کے خلاف جینے ایک دوامی جنگ چھیڑ دی۔

حضرت عیسیٰ سے تقریباً ۵۰۰ سال قبل دیموقریطس نے اپنا وہ مشہور "نظریۂ جواہر" پیش کیا جس پر ہماری سائنس کی بنیادیں کھڑی ہیں۔ اس کے یہاں لوتّو اور معمولی خوردبین کا سادہ تر تصور بھی نہ تھا اور نہ سر جے جے تھامسن کے طویل آلے اس کی امداد کو آئے تھے۔ اسی طرح مائی لی تس اور فیثاغورث کے "نظامِ سیارگان" کی دریافت کے لئے نہ تو ویسٹ کی جیب دوربین موجود تھی نہ ایکس کی رصدگاہیں۔

حیرت انسان کا فطری جذبہ ہے اور تجسس اس کا بدیہی نتیجہ۔ اس کے لئے نہ معملوں کی ضرورت ہے نہ آلوں کی۔ بچہ ابھی ماں کو نہیں پہچانتا لیکن دیے کی چمکتی ہوئی لو کو گھورتا ہے "شادی" برات کے باجوں کی جھنک جیسے میٹھے سروں کو دریچوں میں اور چھوٹے چھوٹے ہیروں کو دروازوں سے باہر کھینچ لاتی ہے۔ چاند ماموں اپنے ایک شیر خوار بھانجے کے لئے اتنے ہی سحر کن ہیں جتنے سر جیمس جینس یا سر آرتھر ایڈنگٹن کے لئے۔ چنانچہ حیرت اور تجسس اس عالمِ رنگا رنگ میں بچے کی آنکھ کھلتے ہی ساتھ ہو جاتے ہیں اور جیسے جیسے اس کے حواس اور قویٰ ذہنی کی ترقی ہوتی ہے وہ بھی بڑھتے ہیں۔

سائنس اسی جذبۂ تلاش و جستجو کی نمو یافتہ شکل ہے لہٰذا یہی وہ اولین علم ہے جس کو انسان نے حاصل کیا۔ اور چونکہ انسانی زندگی اور سائنس میں چولی دامن کا ساتھ رہا اس لئے اس کی تہذیب کی ترقی اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ وہ بھی فروغ پاتی رہی۔ اسی کی مدد سے ابتدائی انسان نے شکار کے لئے چوبی آلات تراشے اپنے کمزور بازوؤں سے خونخوار درندوں پر فتح پائی۔ تاریک غاروں میں خوفناک ریچھوں کا مقابلہ کیا اور اسی کی کوشش نے سینۂ سنگ سے اس چنگاری کو روشن کیا جس نے انسان کی معاشرت کی کایا پلٹ دی۔

اس لئے فطری تجسس جس کو آپ سائنس کہتے ہیں نہ تو مغرب کی ایجاد ہے نہ مشرق کی۔ بابل والوں نے اس کو پروان چڑھایا نہ ہندیوں نے اس کو سینچا بلکہ اس کی بنیاد اس وقت ہوئی جب خطِ استواء کے گرم میدانوں کی بلند گھاس سے انسان نے اول اول اپنا سر بلند کیا اور حیوانیت سے دائرۂ انسانیت میں داخل ہونے لگا اس بے یار و مددگار زمانے میں بھی وہ اس کا سہارا تھی اور آج بھی جب وہ فاتحِ عالم کے تخت پر جلوہ افروز ہے وہ اس کی ہم رکاب ہے۔

اسی جذبۂ تلاش نے انسان میں کائنات اور اس کے مافیہ کی اصل و ماہیت دریافت کرنے کا شوق پیدا کیا اور اسی ذوقِ جستجو نے "میں" کے تجزیہ و تشریح کی لگن لگا دی۔ دنیا کے بلند نظر مفکر دور رس محقق اور نکتہ شناس سائنسداں اسی "علمِ حیات" کے اطراف چکر لگاتے ہیں۔ عقل کی گہرائیاں کھودتے ہیں اور فکر کے آسمان چھانتے ہیں۔

چنانچہ ان معنوں میں متجسس انسان فطرتاً سائنسداں ہے، فلسفی ہے، شاعر ہے اور جو بظاہر عینوں نے سائنس، فلسفہ اور شاعری میں اختلاف دیکھا ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ اور سخت غلطی کرتے ہیں۔ صرف ریڈیو، ٹیلی وژن اور بے تار برقی کی میکانیتوں سے واقف آدمی سائنس سے اسی قدر دور ہے جتنا محض زمان و مکاں، نفسی اور خارجی کے مباحث میں الجھا ہوا فلسفی فلسفہ سے، یا فقط ردیف و قافیہ، صنایع و بدایع میں جکڑا ہوا شاعر شاعری سے۔

سائنسداں کائنات کی اصل ماہیت کا جویا ہے، فلسفی عالم کے اصل محرک کا متلاشی، اور شاعر معشوق حقیقی کی تلاش میں سرگرداں۔ یہہ غلط ہے کہ سائنسداں گیس و بخارات ڈھونڈتا ہے۔ فلسفی خیر و شر کی ٹوہ میں ہے اور شاعر چشم نرگسیں کو گھورتا، عارضِ گلگوں کو پیار کرتا، اور زلفِ سیاہ میں پھنسا ہوا ہے بلکہ تینوں ایک "حقیقت" کی تاک میں ہیں اور تینوں ایک ہی "شاہد حقیقی" کے جلوۂ بے باکانہ کے منتظر ہیں۔ دراصل یہی سائنس فلسفہ اور شاعری کی حدیں ملتی ہیں۔ وہ گویا ایک مثلث کے اضلاع سے مشابہ ہیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اور شاید یہی مثلث مساوی الاضلاع کا نام مذہب ہے۔ چنانچہ اگر میں اقبال کو ایک بڑا سائنسداں کہوں تو وہ غلط نہیں ایک روشن حقیقت ہے بنا براں کہ وہ ایک بڑے شاعر اور بڑے فلسفی تھے ان کی شاعری جنسی رجحانات سے پاک تھی اور ان کا فلسفہ منطقی پیچیدگیوں سے بلند تھا۔

میں مبالغہ نہیں کرتا لیکن یہہ مانتا ہوں کہ اگر کسی اور شاعر کے لئے ایسے جرات طلب دعوے کئے جاتے تو شاید ان کا ثابت کرنا مضمون نگار کے لئے دوبھر ہو جاتا لیکن جب کوئی اقبال پر لکھنے بیٹھتا ہے تو دلائل کا ایک دریا ہوتا ہے جو نوکِ قلم سے امڈا آتا ہے اور یہی کسی کے بڑے ہونے کی دلیل بھی ہے ایک سائنسداں کی پہلی خصوصیت اس کا ذوقِ مشاہدہ ہے جو اس کو عوام سے ممتاز کرتا ہے۔ کھوج ہر انسان میں ہے لیکن وہ تلاش جس میں غور و فکر کو دخل ہے۔ اور جستجو جو زندگی کے لئے غذا یا پانی کی طرح ضروری ہو جاتی ہے، سائنسداں کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ موجودات پر سرسری نظر نہیں ڈالتا بلکہ اس کی غائر نگاہیں ہر شئے کی تہ تک پہونچنا چاہتی ہیں۔ اسے ظاہر سے تشفی نہیں ہوتی وہ حقیقت دیکھنا چاہتا ہے اقبال کا کلام اسی تلاشِ مسلسل سے بھرا ہوا ہے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ
ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

نہ صرف یہہ بلکہ وہ تلاشِ پیہم کو کارخانۂ عالم کا محرک بھی سمجھتے ہیں۔

یہ تلاشِ متصل شمع جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

قدرت کی خوبصورت صنعتیں شاعر کے حساس جمالیاتی ذوق پر سحر کا اثر کرتی ہیں۔ لیکن ایک حقیقی شاعر انھیں دیکھ کر صرف متاثر ہی نہیں ہوتا اس کی آنکھیں ان نقوشِ ظاہری میں حقیقت پردہ نشیں کو ڈھونڈتی ہیں غالب کے یہاں یہی شوقِ دید کام کر رہا ہے، جب وہ پوچھتے ہیں۔

یہہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

مگر اقبال کائنات کی دیگر اشیاء کے ساتھ اپنی ذات کے متعلق بھی اسی قدر بے چین ہیں۔ وہ ایک ماہر حیاتیات کی طرح اس "صندوق سربستہ" کو کھولنا چاہتے ہیں۔

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن یہہ نہیں کھلتا
سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

تاریخ تمدنِ آدم شاہد ہے کہ انسان ایک عرصۂ دراز سے "اپنی ذات" کی کھوج میں لگا ہوا ہے۔ آج سے کئی سو سال بیشتر تبریز کے ایک بڑے بزرگ نے دنیا سے سوال کیا تھا۔

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم　　نہ ترسا و یہودی ام نہ گبرم نے مسلمانم

ایک سائنسداں جانتا ہے کہ کائنات اور ذاتِ انسان کے اصل کی جستجو سے یقیناً انسان ہزارہا ایجادات اور سیکڑوں آسائشوں سے بہرہ یاب ہوا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہہ اضطراب "ایک چھپتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے" اور احساسِ جہالت جو روز افزوں دریافت کے باوجود گہرا ہی ہوتا جاتا ہے حقیقت تلاشِ فطرت کے سینے میں ایک مسلسل کھٹک ہے۔ یہی شعور اور آگہی ہے جس سے ہم پریشان ہیں اور یہی خیال ان ساری بے اطمینانیوں کی وجہہ ہے جو آدمی کے دل کو ایک آن چین نہیں لینے دیتی۔

یہہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار　　خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے　　گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہہ آگہی　　اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہہ آگہی

بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا　　کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے　　آئینہ کے گھر میں اور کیا ہے

اس درد استفہام سے اقبال بھی ایک سائنسداں کی طرح رنجیدہ ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ حکمت کی ہزارہا کد و کاوش کے باوجود یہہ بھید نہیں کھلتا اور سائنس کی مسلسل تگ و دو کے بعد بھی یہہ راز اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ تو وہ عقلِ انسانی کی محدودیت اور حواس کی غیر معتبر شہادتوں پر اس کا سارا قصور رکھتے ہیں :-

چشمِ غلط نگر کا یہہ سارا قصور ہے　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

اسی نکتہ کو فانی نے بھی بیان کیا ہے :-

ہر مژدۂ نگاہ غلط، جلوہ خود فریب　　عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

سر جیمس جینس کے الفاظ میں "کائنات کو ہم مادی تصور میں یقیناً پیش نہیں کر سکتے۔ بنابراں میرے خیال میں وہ محض ایک تخیلی احساس ہے"

آپ نے دیکھا کہ جو لوگ سائنس پر تعقین مادیت کی تہمت دھرتے ہیں حقیقت سے ناآشنا ہیں اس لئے کہ پھر پھر کر سائنس بھی ان ہی نتائج پر پہونچتی ہے جو ایک فلسفی یا شاعر کے ماخوذ ہیں۔ اور یہی خیالات ہیں جن سے متاثر ہو کر دنیا کے اکثر مفکرین نظریہ "خود شناسی" کے اطراف جمع ہونے لگے ہیں، اور اب ؎　　نہاں ہے گوہرِ مقصود جیبِ خود شناسی میں

کا خیال سائنس میں زیادہ قوی ہوتا جا رہا ہے اقبال نے اسی نکتہ کو بار بار دہرایا ہے اور سچ پوچھئے تو ان کے سرمایۂ سخن کا زیادہ تر حصہ اسی پیام کے سنانے میں صرف ہوا ہے

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا　　دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے　　راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو
کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا　　ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو
دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی　　قیس تو لیلیٰ بھی تو صحرا بھی تو محمل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا　　مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

اقبال کی نظروں میں ہر ذی حیات شئے کے وجود کا انحصار کا میابی تنازع للبقا میں ہے۔ دنیا میں وہ جاندار جو کروڑہا سال کی متواتر جنگ کے دوران میں

اپنی نسل قائم رکھ سکے زندہ ہیں۔ اور وہی عضویے قائم رہ سکتے ہیں جو زندگی کی مسلسل دوڑ میں تیز گام تھے چنانچہ لیمارک یا ڈارون کی طرح وہ "بقاء اصلح" کے دعوے دار ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ جاندار اقوام اسی طرح طبعی انتخاب کا شکار ہوتی ہیں جیسے سونگر لینڈ کے ناقابل پرواز پرند اور وہ قومیں جو ہر آن تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں خود کو متوافق نہیں بنالیتیں صفحۂ ارض سے امریکہ کے سرخ فام باشندوں کی طرح نابود ہونے لگتی ہیں۔

اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

انسان کے ابتدائی شعور سے لے کر آج تک موت اور حیات کا مسئلہ ایک سب سے زیادہ وقت طلب مبحث رہا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ موت کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوگا یہ وہ سوالات ہیں جن پر انسان نے سب سے زیادہ غور کیا۔

ماقبل تاریخ آدمی کی قبروں میں سامان زندگی کی موجودگی خواہ وہ کتنا ہی مختصر یعنی دو تین ہنڈیوں اور ایک کلہاڑی پر مشتمل کیوں نہ ہو یہ بتلاتی ہے کہ اس ابتدائی عہد میں بھی حیات بعد موت کا تصور تھا اپنے تمدن کے مختلف مدارج میں انسان نے روح کے غیر فانی ہونے کے دعوے کئے اور تناسخ، حشر نشر وغیرہ کے مسائل ان ہی خیالات کی پیداوار ہیں موجودہ دور میں خواہ کوئی حیات اور موت پر یقین نہ رکھتا ہو یہ ضرور مانتا ہے کہ دنیا میں "زندگی" کا ظہور ایک عجوبہ ہے۔

اپنی حقیقت پر غور کرنا ہو تو کسی اندھیری رات میں چمکتے ہوئے تاروں کو دیکھئے۔ کیا آپ نے کبھی ان کے شمار کرنے کی کوشش کی ہے؟ سائنس دانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ اگر تمام دنیا کے ساحلوں کی ریت جمع کی جائے تو ان ذروں کی تعداد غالباً ان ثوابت اور سیاروں کے برابر ہوگی۔

اور ان میں بعض اس قدر جسیم ہوں گے کہ ہماری جیسی ایک ارب دنیائیں ان کے اندر سما جائیں اور پھر بھی کچھ اور کے لئے جگہ بچ رہے۔

اور ان سیاروں کا درمیانی فاصلہ — ممکن ہے کوئی یقین نہ کرے — اتنا ہے کہ اگر آپ ان میں سے قریب ترین ستارے کی سیر کرنا چاہیں تو ...۰...۰...۰...۰...۰... ۱۵ سال کی ضرورت ہوگی، اور جب آپ اس سفر سے بہ سلامت لوٹیں گے تو اس کا بہت امکان ہے کہ ہماری ننھی سی دنیا کسی دمدار ستارے کے تعاقب میں سیاہ و برباد پھرتی ہوگی یا کسی قریب سیارے کے وسیع شکم میں جذب ہو چکی ہوگی یا اس کے لاتعداد ٹکڑے بہ دوش شہاب ستاروں کی صورت میں فضاء بسیط میں ٹوٹتے ہوں گے۔

ان کی عمریں۔ اس حقیقت سے اندازہ لگائیے کہ آپ کی دنیا جو اور ستاروں کی نسبت کل کی ہے ۱۰۔ ۲۰ ارب سال قدیم ہے اقبال کے الفاظ میں

عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے — سرگذشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے

لیکن آدمی اس وقت اور بھی مبہوت ہو جاتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس ناقابل قیاس تعداد میں دو ایک شکستہ سیاروں کو چھوڑ کر صرف ہماری دنیا کو زندگی ودیعت کی گئی ہے یعنی دنیا کے تمام سمندروں کے ساحلوں کی ریت یکجا ہو تو اس میں سے ایک ذرۂ بے مقدار کو یہ شرف ملا ہے۔

سر آرتھر ایڈنگٹن کے لحاظ سے ان حالات میں اگر کائنات میں زندگی یا اس کی انتہائی مخلوق انسان کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جنگل میں ہزارہا اوک کے بکھرے ہوئے بیج سے صرف ایک دو درخت اگ آتے ہیں، ممکن ہے قدرت نے انسان کی تخلیق کے لئے ثوابت کا یہ زبردست جال بچھایا ہو۔

اس مشہور سائنسداں کی تائید میں اقبال کا یہ شعر آفتاب یا تابع آفتاب ستاروں سے متعلق کس قدر چسپاں ہوگیا ہے :-

شعلۂ خورشید شاید حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرر

گو ہم جانتے ہیں کہ اقبال کے یہاں نہ کوئی محل تھی نہ ۱۰۰ انچ دہانے کی انعکاسی دُوربین پھر بھی اُن کے الفاظ تک تقریباً وہی ہیں جو اُن سے کئی ہزار میل دور رہنے والے اس جدید مہندس اور ہیئت داں نے استعمال کئے تھے شاید ایسے ہی مقامات پر انسان یہ ماننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔　شاعری جزویست از پیغمبری۔

اقبال حیات بعد موت پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں ان کے دلائل دلچسپ بھی ہیں اور سائنٹفک بھی۔ جب کبھی وہ اس مبحث پر کچھ کہنے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک رنگین بیان شاعر کی صورت میں ایک خشک سائنٹسٹ حقائق پیش کر رہا ہے۔

سائنس کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ اشیا کی تبدیلیٔ اشکال یا باہمی ترکیب و تحلیل سے مختلف صورتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ کسے نہیں معلوم کہ برف سے پانی اور پانی سے برف ایک ہی مرکب کی کئی حالتیں ہیں ان کی تحلیل سے آکسیجن اور ہائیڈروجن گیس اور ان گیسوں کے اتصال سے وہی پانی حاصل ہوگا۔

مانا کہ آکسیجن نہیں لیکن اس گیس کی تبدیل شدہ شکل تو اس مرکب میں موجود ہے اقبال بھی مظاہر حیات و موت کو ان ہی مسلسل بدلنے والی کیفیتوں کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو ایک لطیف تشبیہ میں پیش کیا ہے۔

جس طرح ایک کشتی ساحل پر کھڑے ہوئے انسان کی نظروں سے دور ہوتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی۔ انسان بھی نظروں سے چھپ جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِ نظر سے دور گئی
جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

اس دعوے میں ایک اور دلیل بھی پیش کی ہے اور دیکھئے وہ کس قدر وزنی ہے۔

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

ہمیں یہ معلوم ہے کہ دنیا میں زندگی کے کس قدر لاتعداد اور مختلف الاشکال مظاہر ہیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان زندہ صورتوں کی حفاظت کی کیا کیا تدبیریں قدرت کرتی رہتی ہے پھر اگر یہ یوں ہی ختم ہو جانے والی ہوتیں تو نظامِ کائنات انھیں اس قدر عام نہ کرتا۔

کسی ماہرِ حیاتیات تو کجا جاہل کسان سے کہئے کہ بیج بے جان ہیں اس لئے کہ ان میں کیفیاتِ زیست کا فقدان ہے تو وہ ہنسنے لگے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تخم دراصل دو عالی مدارج کے درمیان ایک سستانے والا وقفہ ہے اور یقیناً شاخ سے اس کی علٰحدگی موت نہیں بلکہ ابتدا ہے کسی آنے والی زندگی کی

تخمِ گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

اور اپنے اس نظریئہ سے وہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔

تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت ہے　　برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

لیکن اقبال یقیناً ایک صحیح شاعر نہ ہوتے اگر وہ اس اعتراف مجبوری کا اظہار نہ کرتے جس کو ایک سائنٹسٹ محسوس تو کرتا ہے لیکن اقرار سے ڈرتا ہے "یہی اقبالِ نادانی" ان کی عالی ہمتی کی غمازی کرتی ہے۔

یونان کی اس عدیم النظیر شخصیت نے جس پر فلسفہ کو اب تک ناز ہے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "تمام زندگی کے تفکر کے بعد اس نے یہ معلوم کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا" پوچھا گیا کہ "پھر آپ اور جاہل میں کیا فرق ہوا" کہا "کہ میں یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا اور ایک عام انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔"

جب عقل کی گرمیاں ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں اور تدبیر کی کلیں بوسیدہ ہو جاتی ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اس کارخانے میں جس کے سپید و سیاہ میں ہم کو کوئی دخل نہیں ہے انسان مجبور و لاچار ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ موجودات کا ہر ذرہ ذرہ ایک غیر یقینی حالت میں گھومتا ہے۔ (Professor Heisen Berg) پروفیسر ہزن برگ کے اصول عدم استقلال کا خواہ ریاضی دان جو چاہیں نتیجہ اخذ کریں ایک بات تو یقینی ہے کہ کارخانۂ عالم کی قسمت غیر یقینی ہے اور ہم مجبور ہیں ہماری عقل لاچار ہے، اور ہماری تدابیر اپاہج ہیں۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے　　پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے
آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں　　انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں
ہے شکست انجام غنچہ کا سبو گلزار میں　　سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں

وہ کانٹ کی طرح فکر کی کائنات سے واقف اور عقل کی رسائی سے آگاہ ہیں　　وہ حواس کی قیاس آرائیوں سے مجبور انسان کے سرمایۂ علم کا اندازہ لگاتے ہیں۔

فروغ دانش ما از قیاسی است　　قیاس ما ز تقدیر حواس است

مشرق کا یہ حکیم جو فلسفی بھی تھا اور شاعر بھی آج ہم میں نہیں ہے اس کا پیغام ایک سرچشمہ ہے جس سے ہر شخص بقدر ہمت خویش فیضیاب ہوتا ہے جس کے کلام میں نوجوانوں کے لئے درس عمل اور ضعیفوں کو مژدہ امن و سکون ہے۔ اس دریائے سخن سے ایک سائنسداں حقائق کے گہر ہائے بے بہا نکالتا ہے فلسفی اخلاقیات کے لاقیمت جواہر اور شاعر مضامین کے دُر ہائے نایاب پاتا ہے۔

یہ شاعر جسے مشرق نے بے وقت کھو دیا، ایک سائنسداں تھا معلموں سے بے نیاز، ایک فلسفی تھا منطقی پیچیدگیوں سے متنفر اور ایک شاعر تھا تصنع سے برگشتہ۔

ہم نے اسے کھو دیا ہے جس کا بدل ممکن ہے ہندوستان صدیوں میں نہ پا سکے، اور ہم سے وہ کلیم جادو بیان چھین لیا گیا ہے جو شاید ہی پھر کبھی مادر وطن پیدا کر سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مہندر راج سکسینہ

اقبال حالات اور شاعری

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے انجمن ترقی ملیہ حیدرآباد کے تعزیتی جلسے میں اقبال پر پڑھا تھا جس کے اہم اجزا درج ذیل ہیں ممکن ہے کہ کہیں کہیں بعض چیزیں چھوٹ جانے کی وجہ سے عبارت غیر مربوط ہوگئی ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے آخر میں اپنی ایک نظم بھی سنائی جو تاثرات سے لبریز تھی) "تشاہد"

اقبال کے متعلق حیدرآباد میں اس سے پہلے دو اجتماع ہو چکے ہیں ایک یوم اقبال کے سلسلے میں جب کہ ابھی ان کی عمر مستعار کے کچھ دن باقی تھے دوسرا ان کی وفات حسرت آیات کے موقع پر لیکن یہ اقبال کی ہر دل عزیزی اور دلوں پر گہرے نقش کا بیّن ثبوت ہے کہ لوگ ان کے حالات سننے سے سیر نہیں ہوتے اقبال کی نسبت دو طرح سے گفتگو ہو سکتی ہے ایک یہ کہ صرف ان کی زندگی کے حالات بیان کئے جائیں دوسرے ان کے کلام پر تنقید کی جائے ایک ایسا شخص جس کی زندگی زیادہ تر تصنیف کے کاموں میں بسر ہوئی ہو اس کی زندگی کو اس کے حالات سے علٰحدہ کرنا مشکل کام ہے اقبال جیسے قادر الکلام شخص کی شاعری کا تجزیہ اگر نثر میں کیا جائے تو اس میں اس کے اعجاز کا کما حقہ پتہ نہیں چل سکتا۔ اقبال کے تمام افکار عالیہ اور دلنشیں خیالات کا قوم پر گہرا اثر پڑا ہے۔ آدم سے لے کر اب تک دنیا نے کوئی ایسا خیال نہیں پیش کیا جس کو بالکل نیا کہا جا سکے لیکن خیالات کو ادا کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے جو ان خیالات کی جان ہے۔ اقبال ہر چیز کو نئے انداز میں پیش کرتا ہے کسی شاعر پر تبصرہ کرتے ہوئے اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا کہ حسن نظر اور حسن ذوق سے اس کے کلام کا انتخاب کیا جائے باوجود اس کے اقبال جیسے مفکر شاعر کے متعلق لوگ چاہتے ہیں کہ اس کی شاعری پر فلسفیانہ اور مفکرانہ تبصرہ کیا جائے۔

اقبال ایک کشمیری برہمن خاندان کے فرد تھے جو چند پشت ہوئیں مسلمان ہو گیا۔ شاید آپ نے اقبال کی فارسی شاعری میں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنے برہمن ہونے پر فخر کرتا ہے آپ کو تعجب ہوگا کہ کیوں فخر کرتا ہے مسلمان اور امید کر برہمنوں کو کچھ بھی کہیں لیکن برہمنوں نے روحانی طریقوں اور نسلی پاکیزگی کی غیر معمولی کوششوں سے خاص تربیت حاصل کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آریائی برہمن ایک خاص قسم کا دماغ رکھتے ہیں۔ اقبال کہتے تھے کہ "ایشیا میں تین ذہین قومیں ہیں: ایرانی کشمیری اور بنگالی" اقبال نے جا بجا اپنے برہمن ہونے پر فخر کیا ہے، ایک اور جگہ ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام نظم لکھی ہے جس میں کہتے ہیں میں تو برہمن ہوں ہست و بود اور فلسفہ کی موشگافیاں میرے رگ و پے میں ہیں تو خیبر شکن علی کی اولاد میں ہو کر اس خیال بافی میں کیوں پڑتا ہے۔ اپنے نکتہ شناس ہونے کو یوں بیان کیا ہے ؎

میر و مرزا بہ سیاست دل و دیں باختہ اند
جز برہمن پسرے محرم اسرار کجاست

مسز سروجنی نائیڈو نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ شخص برہمن اور اسلام کے امتزاج کے ساتھ (Genius) کے اعلیٰ درجے پر پہنچ گیا۔ وہ اپنی کشمیری ذہانت کی نسبت بھی تفریحاً اس قسم کا ذکر کیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے ان کے استاد مولوی میر حسن کے سامنے کسی نے ایک کشمیری لڑکے کو کہا او بیوقوف مولوی صاحب نے کہا نہیں کہہ رہا ہے کشمیری بھی کہیں بیوقوف ہوتا ہے۔ اس کے بعد فرمانے لگے کہ تم نے کشمیری کا وہ لطیفہ نہیں سنا کہ "شیطان سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے کہا کہ خدا نے تجھ کو کائنات پر قدرت دے رکھی ہے اگر تم ہم سے شرکت کرو تو بہتر ہے ہم مل کر کاشت کاری کریں گے بارش اور موسموں کو ہمارے مقصد کے مطابق کر دو اور جو کچھ پیداوار ہو ہم آپس میں تقسیم کریں گے" شیطان راضی ہو گیا اور کہا کہ "تقسیم کیسے ہوگی" کشمیری نے کہا کہ "زمین کے اندر کچھ پیداوار ہوگی اور زمین کے اوپر کچھ ایک حصہ تم لے لو اور ایک ہمارے لئے چھوڑ دو" شیطان زمین کے اوپر کی پیداوار لینے پر راضی ہو گیا۔ کشمیری نے آلو بو دئے جب فصل تیار ہوئی تو شیطان کے حصے میں فقط اوپر کے پتے آئے اور آلو کشمیری کے حصے میں آ گئے۔ شیطان نے کہا "یوں نہیں جو اوپر نکلے وہ تمہارا اور جو نیچے ہو وہ ہمارا" کشمیری نے گنے کی کاشت کی اسی طرح شیطان دونوں مرتبہ محروم رہا کہتے تھے کہ کشمیری کی ذہانت ایسی ہے کہ شیطان پناہ مانگتا ہے۔

میری اس گفتگو کا مطلب یہ تھا کہ اقبال ایک ذہین نسل سے تعلق رکھتے تھے اور تقدیر کی حسن سے وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب کہ انسان کے لئے ممکن تھا کہ وہ دنیا کے علوم سے بہرہ ور ہو سکے صرف نوعی تمدن کے دائرے ہی میں محدود نہ رہے۔ مولانا آزاد نے "نیرنگ خیال" کے دیباچہ میں لکھا تھا کہ آئندہ لوگ وہ کمال پر پہونچیں گے کہ مشرق اور مغرب کی کنجیاں ان کے ہاتھ میں ہوں گی۔ اقبال میں خوبی یہ تھی کہ مذاق مذاق میں بہت ساری باتیں سمجھاتے تھے میر حسن کی تربیت کو وہ شکریہ کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ سیالکوٹ ان کا وطن ہے جو پنجاب کا مردم خیز خطہ ہے۔ شاہجہاں کے زمانے میں عبدالحکیم سیالکوٹی بہت مشہور عالم گذرا ہے، سیالکوٹ سے لاہور آکر گورنمنٹ کالج سے بی، اے اور ایم، اے کامیاب کیا، خوش قسمتی سے آرنلڈ جیسا استاد مل گیا وہ خاص قسم کا معلم تھا، شبلی کی تصانیف اور اس کے انداز تحقیق میں آرنلڈ کی رہنمائی کو بہت دخل ہے، اگر شبلی پر آرنلڈ کا اثر نہ ہوتا تو ممکن ہے کہ وہ بھی قدیم ملاؤں کی طرح تنگ نظر بن کر رہ جاتا۔ اقبال کو آرنلڈ کی صحبت سے جو فائدہ پہنچا وہ خود اقبال ہی جانتے ہیں آرنلڈ کو بھی اپنے شاگرد پر فخر تھا وہ کہتے تھے کہ "ذہین شاگرد کو پڑھانے سے استاد سیکھتا ہے اقبال کے سوالات سے میرے علم میں اضافہ ہوتا ہے"۔ آرنلڈ کی شان میں اقبال نے ایک قصیدہ بھی لکھا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے دل پر ان کا گہرا اثر تھا اقبال کسی کے احسان کو فراموش نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا ذکر کرتے تھے، اقبال نے سرسری طور پر داغ کی شاگردی بھی کی خط و کتابت کے ذریعے سے داغ سے دو تین غزلوں کی اصلاح لی داغ نے لکھ بھیجا کہ اب آپ کو اصلاح کی حاجت نہیں غزلیں بھیجنے کی زحمت نہ کیجئے۔ تین یا چار غزلیں "بانگ درا" میں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ داغ کے زیر اثر لکھی گئی ہیں اور داغ کے رنگ میں اقبال نے اپنے کو سمو کر لکھا، لیکن اقبال رسمی شاعری اور مصنوعی عاشق کی غزل گوئی سے متنفر تھے۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی　　مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا　　خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا　　تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں　　یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں
علاج درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں　　جو تھے چھالوں میں کانٹے نوک سوزن سے نکالے ہیں
پھلا پھولا رہے یارب چمن میری امیدوں کا　　جگر کا خون دے دے کر یہ بوٹے میں نے پالے ہیں

غالب کا رنگ فطرتاً ان پر غالب تھا وہ غالب کے نہ صرف مداح تھے بلکہ اس کے انداز بیان سے بھی بہت متاثر تھے، فرماتے تھے کہ میرا عرصے سے خیال ہے کہ غالب کے حکیمانہ خیالات کی ایک فلسفیانہ شرح لکھوں افسوس کہ کسی نے غالب کا پورا حق ادا نہیں کیا ایرانی ہندوستانیوں کی فارسی کو فارسی ہی نہیں سمجھتے ایک ایرانی نے کہا کہ غالب ہندوستان میں فارسی کا بڑا شاعر مشہور ہے لیکن ہمیں تو وہ اعلےٰ درجے کا شاعر نہیں معلوم ہوتا اقبال نے کہا غالب کا یہی کمال ہے کہ ایرانی کی سمجھ میں نہ آئے اس کا ذہن ہندی اور زبان تمہاری ہے، اقبال، غالب کے اتنے مداح تھے کہ انھوں نے غالب پر ایک نظم لکھی اس نظم میں خوبی یہ ہے کہ حقیقت میں وہ غالب کی مدح نہیں بلکہ اپنے لئے ایک نصب العین کا تعین ہے۔ اقبال نے اپنے نصب العین کو غالب کے پردے میں پیش کیا اور بعد کو حرف بہ حرف اس کو پورا کیا کچھ دور چل کر وہ غالب تک پہنچ گئے اور اس کے بعد غالب عطار اور سنائی سے کہیں آگے بڑھ گئے انھوں نے نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کئے۔

اقبال کے کلام میں استعارات، تشبیہات کے ساتھ فکر کی شدت اس قدر ہے کہ اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا غالب کی نظم میں شعر کے معاملے میں انھوں نے بیان کیا ہے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں ‏ تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ‏ ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے ‏ شمع یہ سودائیٔ دلسوزیٔ پروانہ ہے

اقبال نے اردو کو چھوڑ کر فارسی کی طرف توجہ کی تو سر عبدالقادر نے اقبال کو یاد دلایا۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

اس کا یہ اثر ہوا کہ اقبال اپنی آخری عمر میں بالِ جبریل اور ضربِ کلیم جیسی دو گراں بہا کتابیں چھوڑ گئے۔

اسی نظم میں انھوں نے غالب کو گوئٹے سے تشبیہہ دی ہے۔

گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

گوئٹے اپنے زمانے کا بہت بڑا آدمی تھا نپولین کا ہم عصر تھا اس نے مغرب کی تہذیب کا مطالعہ کر کے اس کو شاعری میں پیش کیا جب مغرب سے تسکین نہیں ہوی تو مشرق کی طرف جھکا اور مشرق کے ترجموں کو پڑھ کر ایک دیوان لکھا یہ وہی دیوان ہے جس کے جواب میں اقبال نے پیامِ مشرق لکھا۔ غالب سے زیادہ گوئٹے کا ہم نوا اقبال تھا ذہنی ترقی کے بعض پہلوؤں میں وہ گوئٹے سے بھی آگے بڑھ گیا وہ فرنگ کو روحانیت سے خالی سمجھتا ہے اقبال کا خیال مغرب کے بڑے بڑے لوگوں کے متعلق تھا کہ یہ لوگ محمل تک نہیں پہنچتے بلکہ غبارِ ناقۂ لیلی تک جا کر رہ جاتے ہیں۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است ‏ شعر مے گردد چو سوز از دل گرفت
بو علی اندر غبارِ ناقہ گم ‏ دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

اقبال فلسفہ میں ایسی ٹھنڈی بحث کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص روکھا فلسفی ہے۔ میں ایک مرتبہ ان سے ملنے گیا تو ایک فلسفیانہ مکالمہ پڑھ رہے تھے۔ اس کے موضوع کے متعلق گفتگو ہونے لگی، اس بحث میں لطیفہ یہ ہوا کہ اقبال عقل کی تائید کرتے تھے اور میں وجدان کی وہ کہتے تھے کہ Cold Intellect اور Sharp ہو تو پھر اسی مقام پر پہنچیں گے جہاں وجدان پہنچتا ہے۔

اقبال نے جا بجا اپنا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے لیکن بالکل بے ریا نہ خود مغالطہ میں رہنا چاہتے اور نہ دوسروں کو مغالطے میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے کہا کہ "دیکھو میرے متعلق مشکل یہ ہے کہ مجھ کو ریاکاری کا فن نہیں آتا اور کبھی اگر میں نے کوشش بھی کی ہے تو کامیابی نہیں ہوی اس لئے میں نے ریا کو بالکل چھوڑ دیا ہے اسی خیال کو ایک نظم میں ظاہر کیا ہے۔

کل ملا مجھ سے جو اقبال تو پوچھا میں نے ‏ عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز

ڈھب گر قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی ‏ اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

اقبال پر مذہبیت کا رنگ کچھ نہ کچھ شروع سے موجود تھا جو آخر میں غالب ہو گیا۔ لیکن یہ مذہبیت ایک خاص رنگ کی تھی۔ وہ ملا نہیں تھے

اقبال نے ہمیشہ ملائیت سے گریز کیا ہے، وہ رند بھی تھا، فلسفی بھی تھا، صوفی بھی تھا، عقلمند بھی مگر مسلّمہ مفہوم کے لحاظ سے ان میں سے کسی صفت کا اطلاق ان پر پوری طرح نہیں ہو سکتا ہے۔

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

ایام جوانی میں ان کا جو انداز تھا اس کا صحیح نقشہ انھوں نے ایک مولوی صاحب کی زبان سے کھینچا ہے ؎

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی — تیزی نہیں منظور طبیعت کی دکھانی
لبریز مئے زہد سے تھی دل کی صراحی — تھی تہ میں کہیں درد خیال ہمہ دانی
کرتے تھے بیاں آپ کرامات کا اپنی — منظور تھی تعداد مریدوں کی بڑھانی
مدت سے رہا کرتے تھے ہمسائے میں میرے — تھی رند سے زاہد کی ملاقات پرانی
حضرت نے مرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبال کہ ہے قمری شمشاد معانی
سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا — ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی — ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی
اک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
فرمایا شکایت وہ محبت کے سبب تھی — تھا فرض مرا راہ شریعت کی دکھانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا ز رہ قرب مکانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے مرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی
اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے! — کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

جھوٹ موٹ کے زہد و تقوے کا رنگ اختیار نہیں کرتے تھے بعض اوقات بے تکلف رندانہ گفتگو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے ساتھ بازار میں سے گذر رہے تھے اتفاق سے حسن فروشوں کا بازار رستے میں آ گیا گذرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے گئے کہنے لگے کہ بعض صورتیں اس میں نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس فقرے سے معلوم ہوا کہ وہ ان سب صورتوں کا جائزہ لے چکے ہیں۔

رات کو ۴ بجے تک گانا سن کر گھر واپس آتے اور صبح کو قرآن مجید کی تلاوت اس طرح کرتے کہ پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ اقبال کو مولویوں کے طعن تشنیع پر کبھی غصہ نہیں آیا ایک دفعہ کہنے لگے کہ ملا اور مولوی نے اسلام کی مٹی پلید کر دی ہے۔ پانچ وقت ٹکر مار کر خدا پر احسان کر دیتے ہیں۔ اگر اسلام کی پیروی میں کہیں ان کا کچھ مالی نقصان ہوتا ہے تو ان کا اسلام باقی نہیں رہتا۔ ایک مرتبہ ایک مولوی صاحب آ کر وعظ کرنے لگے کہ تم اس قدر عالم ہو کر شریعت کا احترام کیوں نہیں کرتے۔ ذرا اپنے علم کی تو قدر کرو۔ میں نے کہا "کیا کروں" فرمانے لگے کہ "داڑھی چھوڑ دو"۔ میں نے کہا کہ "شریعت کی کچھ آپ کوتاہی کرتے ہیں اور کچھ میں"۔ واقعہ یہ تھا کہ وہ مولوی صاحب ایک مقدمے کے سلسلے میں اقبال کے پاس آیا کرتے تھے۔ قصہ یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو شرعی حصہ نہیں دینا چاہتے تھے اور اقبال سے طرح طرح کے قانونی مشورے لیا کرتے جس میں اس قسم کی گنجائش ہو کہ وہ اپنی بہن کو حصہ نہ دے سکیں اور بار بار یہی کہتے کہ ہمارے خاندان میں اس قسم کا رواج نہیں۔ اقبال نے کہا مولوی صاحب آج خدا نے آپ کو ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ لائیے ہاتھ ملا لیجئے آپ اپنی بہن کو حصہ دے دیجئے اور میں داڑھی چھوڑ دیتا ہوں۔ جب وہ ہاتھ ملانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے تو مولوی صاحب پیچھے ہٹتے جاتے۔

اقبال کی شاعری میں جابجا ان کی زندگی کے متعلق واقعات ملتے ہیں ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ خانہ اور اہل خانہ دونوں کی طرف سے بے نیاز معلوم ہوتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت مطالعے میں گذرتا تھا۔ سینکڑوں عجیب و غریب کتابیں ان کے پاس پڑی رہتی تھیں۔ قانون کی کتابوں کے سوا ہر قسم کی کتابیں موجود رہتیں۔ ان کو اپنی تصانیف سے ۵۰ یا ۶۰ ہزار روپے مل گئے تو ان کو اپنے

بال بچوں کا خیال ہوا اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ اپنی نگرانی میں ایک بنگلہ بنا دو۔ بڑے بھائی کہتے کہ چلو بنگلہ بن رہا ہے ایک نظر دیکھ لو اور اپنی رائے دو تو کہتے کہ بنگلہ بن جائے گا تو دیکھیں گے۔ جب حیدرآباد آئے تو مجھ سے سر اکبر نے کہا کہ اقبال کو کنگ کوٹھی مبارک اور رزیڈنسی لے جاؤ۔ میں ان کو کنگ کوٹھی لے گیا اور سرامین جنگ سے مل کر اعلی حضرت سے ملاقات کا وقت مقرر کرا دیا۔ وہاں سے رزیڈنسی آئے تو معلوم ہوا کہ رزیڈنٹ بلارم میں ہیں۔ انھوں نے اپنا کارڈ چھوڑ دیا۔ میں نے ان سے کہا کہ رزیڈنٹ سے تو ملاقات نہیں ہوئی چلئے عمارت ہی کو دیکھ لیں بڑی عظیم الشان عمارت ہے قدیم انداز کی معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور کہا چلو یہ سرمایہ داروں کی لوٹ ہے۔

ان کے کلام میں قلندری کا جو ذکر ہے وہ شاعرانہ نہیں بلکہ حقیقت ہے جو لوگ ان کے پاس رہے ہوں وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کھانا ۲۴ گھنٹوں میں ایک دفعہ کھاتے تھے۔ بہت کم سوتے تھے۔ سحر خیز تھے۔

اقبال کا نام الہامی نام تھا۔ ان کے والد صوفی اور پاکیزہ نفس تھے۔ ایک مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی شستہ اور لطیف گفتگو کرتے تھے ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ اقبال جب پیدا ہونے کو تھے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب و غریب رنگ کا خوبصورت پرندہ آسمان سے زمین کی طرف آرہا ہے۔ جب وہ قریب آگیا تو بہت سے لوگوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی اور میں خاموش کھڑا رہا وہ پرندہ میری گود میں آگیا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔

اقبال کی ہر دل عزیزی کا یہ حال تھا کہ سیکڑوں نے ان کے کلام کی نقل شروع کر دی۔ اقبال نے سیکڑوں ادیب پیدا کئے۔ اقبال کے طرز خیال سے واقف ہوں تو معلوم ہو کہ جس طرح سمندر میں ایک چاند سے ہزاروں چاند پیدا ہوتے ہیں اسی طرح اقبال نے بحر حیات میں اپنا عکس ڈالا اور ہزاروں چاند پیدا کئے۔ چنانچہ تصویر درد میں اپنے متعلق کہا ہے ؎

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

لوگوں نے ان کی لے کی بھی نقل کی جس کے متعلق لکھتے ہیں ؎

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

اقبال کی شاعری کا ارتقاء فطری شاعری سے ہوا اور یہ ان کی عام شاعری تھی پھر اقبال نے حب وطن سے متعلق ایسی نظمیں لکھیں کہ کوئی محب وطن ان سے بہتر نہیں لکھ سکتا ؎

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اقبال دل یعنی عشق سے کیا مراد لیتا ہے، اس کے پاس عشق کا مفہوم بہت گہرا ہے۔ دل اور عشق اقبال کے کلام میں ایک مستقل مضمون ہے جس پر اگر کوئی لکھنا چاہے تو کافی مواد مل سکتا ہے۔ کہا

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل
یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملک بقا ہے خط پیمانۂ دل
ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرع ہستی تو اگا دانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے　　برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

اقبال شروع شروع میں کچھ روایتی تصوف میں پڑے رہے اور یہ ایک بڑا مضمون ہے کہ وہ کس طرح تصوف سے نکلے۔ تصوف کی دو قسمیں ہیں، سکونی تصوف اور حرکی تصوف۔ ایک تصوف وہ ہے جو کمالِ سکون سے حرکی تصوف کی طرف پہنچاتا ہے۔ جس زور سے انھوں نے حرکی تصوف کے پہلو کو واضح کیا ہے آج تک کسی کے کلام میں نظر نہیں آتا۔

یورپ میں تعلیم کے دوران میں ان پر کن تحریکات کا اثر ہوا ہے ایک طویل بحث ہے۔ اقبال نے گفر دین دونوں سے فیض حاصل کیا نیٹشے سے متاثر ہو کر انھوں نے عمل اور حرکت پر نظمیں لکھنی شروع کیں، مثلاً "چاند تارے" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ؎

کہنے لگا چاند ہم نشینو!　　اے مزرعۂ شب کے خوشہ چینو
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی　　یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے　　پوشیدہ قرار میں اجل ہے

خدائے حسن نے اک روز یہ سوال کیا　　جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا
ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا　　شب دراز عدم کا فسانہ ہے دنیا
ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی　　وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی
کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی　　فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو　　فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے　　کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا　　شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

مذکورہ بالا نظم کے ایک ایک لفظ میں معانی اور تاثرات کے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ انھوں نے یہ نظم آرنلڈ کو سنائی تو آرنلڈ نے کہا کہ "دیکھو مشرقی اور مغربی میں یہی فرق ہے۔ تم نے اس کو نیا لباس پہنا دیا ہے۔" ایک جگہ عمل کی تعلیم نہایت ہی پُر زور انداز میں کی ہے ؎

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمان خوش آہنگ　　دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہئے شاہیں کا تجسس　　جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانش و فرہنگ
کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ　　بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ

اقبال نے قریب قریب ہر چیز کو نئے معنی پہنائے۔ فقر کو نئے انداز سے پیش کیا۔ اسلام میں فقر کے دو معنی ہیں حدیث میں ہے "اَلْفَقْرُ سَوَادُ الْوَجْهِ فِي الدَّارَيْنِ" یعنی فقیری کی وجہ سے دونوں جہاں میں منہ کالا ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ہے کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا یعنے فقر انسان کو کفر سے زیادہ قریب کر دیتا ہے اور ایک جگہ ہے اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ یعنی فقر میرے لئے باعث فخر ہے۔ فقر کی دو قسمیں ہیں ایک وہ فقر جس کو سعدیؒ نے بیان کیا ہے ؎ خداوند روزی بحق مشتغل　　پراگندہ روزی پراگندہ دل

ایک مغربی مفکر کہتا ہے کہ ایک فقر وہ ہے جو خود آدمی اختیار کر لیتا ہے اور ایک وہ ہے جو اس پر عاید کیا جاتا ہے۔ اقبال نے فقر کو عشق کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہوئے اس کو اتنا بلند کر دیا ہے کہ شہنشاہیت سے بڑھا دیا ہے۔ جب کوئی شخص تمام چیزوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو تمام کائنات اس میں داخل ہو جاتی ہے۔ اقبال نے قناعت کے خلاف بھی جہاد کیا ہے۔ — اقبال عین فقیری اس کو سمجھتا ہے کہ کائنات کی تمام چیزوں کو اپنے میں جذب کر لیا جائے۔ اقبال کے ہاں فقیری بڑی وسیع چیز ہے وہ فقیر سمجھتا ہے آنحضرتؐ کو، عمر فاروقؓ کو، اس قسم کے شہنشاہی فقیر اس کی نظروں میں تھے۔

خدا جانے کب سے ابلیس کو برا بھلا کہہ رہے ہیں ایرانیوں کے مذہب میں تو ابلیس کو برائیوں کا خالق قرار دیا گیا۔ اس کا نام اہرمن رکھا۔ یہی اہرمن ذرا سی صورت بدل کر اسرائیلی مذاہب میں داخل ہو گیا اور ہر برائی شیطان کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے لیکن بعض صوفیائے کرام اور بڑے بڑے نکتہ داں ہمیشہ شیطان کی تعریف کرتے رہے ہیں۔ اقبال کہتے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک فقیر سے پوچھا کہ تو کس کا مرید ہے؟ اس نے کہا کہ ابلیس کا کیونکہ وہی موحد ہے۔ منصور حلاج نے ابلیس اور موسیٰ کا مکالمہ لکھا ہے۔ آخر میں موسیٰ شکست کھا جاتے ہیں۔ ملٹن کا خدا بھی اس کے شیطان کے مقابلے میں ڈھیلا ڈھالا معلوم ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں رکاوٹوں کا نام شیطان ہے اور رکاوٹوں پر قابو پانے کا نام زندگی ہے یہ واقعہ ہے کہ ابلیس کو نکال دو تو جہان کی رونق باقی نہیں رہتی اقبال نے جبریل اور ابلیس کو لڑا دیا ہے اور جبریل کو شکست دلائی ہے

جبریل۔ ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہانِ رنگ و بو۔ ابلیس۔ سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے و آرزو
جبریل۔ ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو
ابلیس۔ آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے کر گیا سرمست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو
جبریل۔ کھو دیے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو
ابلیس۔ ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح تو فقط اللہ ہو اللہ ہو اللہ ہو

محض ذکر کے ناکافی ہونے کی بابت اقبال نے ایک ایسا لطیف مضمون پیدا کیا ہے کہ اسلامی لٹریچر میں اس سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ قرآن کریم میں ہے "یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ" یعنی تمام کائنات خدا کی تسبیح میں مصروف ہے اقبال نے اس سے ایک مضمون پیدا کیا ہے کہ خدا کی صرف تسبیح کرنا نباتات اور جمادات کا کام ہے انسان کا کام تو آسمانوں سے اوپر نکل جانا ہے

وہ مذہبِ مردانِ خدا داد و خدا مست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

خلیفہ عبدالحکیم

کلامِ اقبال کی بعض خصوصیتیں

از شمارِ دو چشم یک تن کم
وز حسابِ خرد ہزاراں بیش

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ کی موت ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی شاید صدیوں کے بعد ہو سکے۔ ان کی رحلت کا افسوس نہ صرف ہندوستانیوں کو ہے بلکہ تمام دنیائے اُردو اُن کے غم میں سوگوار ہے' اُردو اور فارسی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ ہم کو سنوارنے والا نہ رہا۔ فلسفہ مضطرب ہے کہ اس کے مسائل حل کرنے والا ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔ ہندوستانی افسوس کر رہے ہیں کہ اب ان کو کون پیغامِ حیات دے گا' حقیقت میں آنکھ اور گوشِ نصیحت نیوش کی ضرورت ہے۔ ہم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ اقبالؔ کا تنِ خاکی زمین میں دفن ہو گیا لیکن اس کی روح ہر وقت ہمارے لئے پیغامِ حیات لئے پھر رہی ہے۔ "بانگِ درا" اب بھی بھٹکے ہوؤں کو راستہ بتلا سکتی ہے "اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی" اب بھی حق شناسی کا سبق دے سکتی ہیں۔ "پیامِ مشرق" ہر وقت ایک نیا پیغام پیش کر سکتی ہے۔ "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" اب بھی سوتوں کو جگا سکتی ہے بشرطیکہ ہم میں شاعرِ اعظم کے پیام کے احترام کا صحیح جذبہ موجود ہو۔

ہر زمانے میں مختلف مقامات پر مختلف پیغمبر آئے اور انھوں نے انسانوں کو صحیح راستہ بتلانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ سننے والوں نے ان کے پیغام کو گوشِ دل سے سنا اور اس پر عمل پیرا ہو کر سعادت حاصل کی۔ جب پیغمبروں کا سلسلہ ختم ہو گیا تو دنیا کو پیغام دینے والے صرف شاعر رہ گئے۔ جس طرح پیغمبر الہامی کلام کو لوگوں تک پہنچایا کرتے تھے بالکل اسی طرح حقیقی شاعر بھی اپنے الہامی کیفیات اور وارداتِ قلبی کو لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے جذبات اور کیفیات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ عوام کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرتا اور حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے ؎ شاعری جزویست از پیغمبری

جس طرح پیغمبر کی ہر آواز خدا کی آواز ہوتی ہے شاعر کا ہر لفظ الہامی کیفیات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ شاعر عوام کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے ماحول کے نشیب و فراز سے بہت جلد متاثر ہو کر دوسروں میں بھی احساسِ تاثر پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وہ نعمت ہے جس کی باعث شاعر کی ہستی ملک و قوم میں امتیاز حاصل کر لیتی ہے۔

اقبالؔ نے جتنا کائناتِ عالم کا قریب سے مطالعہ کیا ہے شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ انھوں نے مشرقی فلاسفہ مثلاً مولانا رومؒ، عطارؒ، سنائیؒ اور رازیؒ کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے خیالات کو دنیا کے سامنے نئے رنگ میں پیش کیا۔ ان کے کلام میں جابجا ایک بجلی سی کوندتی نظر آتی ہے۔ طاقت اور زورِ بیان کا وہ حال کہ سوتوں کو جگا دے' مردوں کو زندہ کر دے' مایوس دلوں کو شاہ راہِ ترقی پر گامزن بنا دے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ان کے کلام میں سوز و گداز' تڑپ اور اضطراب جابجا نظر آتا ہے انھوں نے اپنے کلام سے ہندوستان کی زوال یافتہ قوم میں احساسِ خودی اور جوشِ عمل پیدا کر دیا۔ ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد دل میں ذوقِ عمل اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ہر شعر اہلِ دنیا کے لئے ایک بصیرت افروز پیغام ہے اور ہر پیغام میں حیاتِ جاوداں۔

اقبالؔ کی قوتِ تخیل اور فلسفے نے زندگی کی ایک نئی شاہراہ قائم کر کے نہایت دقیق مشکل اور گہرے مسائل کو عام فہم اور سلیس بنا دیا۔ یہ اقبال ہی کا حصہ تھا۔ اقبالؔ کے کلام کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا رومؒ کی روح نے اقبالؔ کے جسم میں دوبارہ جنم لیا۔

جن اصحاب نے مولانا اور اقبال کے کلام کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ غرض اقبال ان کے قدم بہ قدم نظر آتے ہیں جس طرح مثنوی کی وجہ سے مولانا رومؒ کا نام زندہ ہے اسی طرح اقبال بھی اپنے حکیمانہ اور فلسفیانہ کلام کے باعث رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے۔

اقبال فطرتاً خود دار آزاد منش تھے شاعرانہ قیود کی جکڑ بندیوں کا پابند رہنا ان کی شانِ خودداری کے خلاف تھا۔ وہ جس چیز کو بیان کرنا چاہتے آزادانہ اور بے باکانہ کہہ جاتے۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے الفاظ ڈھونڈنا باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے خیالات خود اپنے ساتھ الفاظ لئے آتے۔ سادگی، بے ساختہ پن، اپج، شگفتگی ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں ہیں۔ ان سب سے زیادہ ان کے کلام میں بڑا کا اثر تھا۔ جو بھی لکھتے متاثر ہو کر لکھتے اور دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہ رہتے۔ ان کی انقلاب پسند طبیعت ہمیشہ جمود کے خلاف جنگ کرتی رہتی تھی۔ قوم کو بیدار کرنا اور خودی کا سبق پڑھانا ان کا مطمحِ نظر تھا خاص کر ہندوستان والوں میں جوشِ عمل اخوت اور خودداری کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا ان ہی کے سر رہے گا۔

اقبال کا کلام ہمہ گیر ہے۔ اس لئے اس کے متعدد پہلو ہیں وہ ہر جگہ حیات کی گتھی سلجھاتے ہیں اور زندگی کو بے نقاب کر کے دکھانا چاہتے ہیں ؎

ترا یک نکتۂ سربستہ گویم ۔ اگر دانی حیات از من بگیری ۔ بمیری گر بہ تن جانے نداری ۔ وگر جانے بہ تن داری نمیری

بہ دریا غلط و با موجش در آویز ۔ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است ۔ کسے کو درد پنہانے ندارد ۔ تنے دارد ولے جانے ندارد

مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ ۔ اگر دم رفت دل باقی ست غم نیست

بگوشم آمد از خاکِ مزارے ۔ کہ در زیرِ زمیں ہم می تواں زیست ۔ نفس دارد و لیکن جاں ندارد ۔ کسے کو بر مرادِ دیگراں زیست

تو نہ شناسی ہنوز شوقِ بمیرد ز وصال ۔ چیست حیاتِ دوام؟ سوختن ناتمام ۔ بہ ساز زندگی سوزے بہ سوزِ زندگی سازے ۔ چہ بے دردانہ می سوزد چہ بیتابانہ می سازد

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے ۔ زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے ۔ گل تبسم کہہ رہا تھا زندگانی کو مگر ۔ شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں

خطر پسند طبیعت کو ساز گار نہیں ۔ وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد ۔ ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا ۔ حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال کی جستجو پسند طبیعت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ تلاش و جستجو کسی نقطہ پر آ کر ختم ہو جائے وہ تمام عمر حقیقت کے پردوں کو چاک کرنا چاہتے ہیں بحرِ ہستی میں موج بن کر بدھر چاہتے ہیں نکل جاتے ہیں۔ ساحل کا خیال ان کے لئے سوہانِ روح ہے۔ ان کی اضطراب پسند طبیعت سکون سے بالکل بے نیاز ہے تنگ دامنی اور قناعت ان کی شان کے خلاف ہے۔ ذوقِ سفر کا وہ عالم کہ منزل بھی سنگِ راہ بن کر رہ جاتی ہے وہ اپنی منزل کو اسی ذوقِ سفر میں مضمر سمجھتے ہیں۔ وہ ایک جگہ مقید رہنا نہیں چاہتے۔ ان کی آزادی پسند طبیعت ہمیشہ پرواز کی طرف مائل نظر آتی ہے ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا ۔ ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں ۔ نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج ۔ ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے ! ۔ مضطرب ہوں دل سکوں ناآشنا رکھتا ہوں میں

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قائم ہے شان تیری ۔ وفورِ گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

من از ذوقِ سفر آں گونہ مستم ۔ کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست ۔ گفتم کہ شوقِ سیر بسر داشت بہ منزلے ۔ گفتا کہ منزلش بہ رہ میں تسوقِ مقصود است

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذتِ پرواز ۔ گہے بہ شاخِ گلم گاہ بر لبِ جویم

مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے اور مسلمانوں کا سا نام رکھ لینے سے کوئی مومن نہیں کہلا سکتا صرف باتوں سے نہیں بلکہ کردار او عمل سے ایمان کی تجلیات رونما ہونی چاہئیں مومن کی تعریف اور اس کی شان اقبال کی زبان سے سنئے ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں ہے گم
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت
لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امید مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کے کلام کی ایک اور اہم خصوصیت یہہ ہے کہ اس میں "نازِ بندگی" کی جھلکیں نظر آتی ہیں۔ انسان کو اپنی خوبیوں اور کمال پر ناز ہوتا ہے مثلاً کوئی حسن پر ناز کرتا ہے تو کوئی دولت پر، کسی کو اپنی قابلیت اور شرافت پر ناز ہے تو کسی کو اپنی حکومت اور سروری پر لیکن اقبال کا ناز انوکھی قسم کا ہے۔ وہ اپنے بندہ ہونے پر ناز کرتے ہیں چنانچہ ان کے کلام میں ہر جگہ یہی عنصر غالب نظر آتا ہے۔ "شکوہ" ان کے نازِ بندگی کی بہترین مثال ہے۔ بعض سطح بینوں نے شکوہ کی گہرائیوں تک نہ پہنچنے کی وجہہ سے اقبال پر کفر کے الزامات لگائے جن کے بعد ہی انھوں نے "جوابِ شکوہ" لکھا۔ شکوہ میں اقبال نے خدا سے بغاوت نہیں کی بلکہ خدا کی بے نیازی اور بندگی کے ناز کو واضح کیا ہے ؎

صفحۂ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی ہم سے یہہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دلدار نہیں

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے
شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے
آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

ایک جگہ اقبال نے بندگی اور خداوندی پر روشنی ڈالی ہے ؎

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے
خداوندا! خدائی دردِ سر ہے

ولیکن بندگی استغفر اللہ
یہہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

بندگی کے متعلق اقبال کا تخیل بالکل انوکھا ہے۔ وہ درد و سوز اور تلاش و آرزو کو اصلِ حیات سمجھتے ہیں۔ اور اس کی طرف اس قدر مائل نظر آتے ہیں کہ مقامِ بندگی کے بدلے شانِ خداوندی لینا پسند نہیں کرتے ؎

متاعِ بے بہا ہے درد و سوزِ آرزومندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

خواجہ حمید الدین شاہد

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ہندوستان یا اسلامی دنیا کے شاعر نہ تھے بلکہ بہ حیثیت شاعر، مفکر اور فلسفی ان کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ چنانچہ مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار نے آپ کی وفات پر جو بیان دیا ہے اس میں کہا کہ مسولینی اقبال کی بڑی عزت کرتا تھا، اور آپ کی متعدد نظموں کا ترجمہ اطالوی زبان میں ہو چکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اقبال نے اُردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ دنیا کے بڑے حصہ کو براہ راست اپنا پیغام پہونچایا اور باقی ماندہ دنیا اس کے ترجموں سے مستفید ہوئی۔ اقبال کی وفات سے مشرق اور بالخصوص ہندوستان کو جو نقصان عظیم پہونچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے، اور مادر ہند اپنے اس عظیم المرتبت فرزند کی جدائی پر جتنی بھی سوگواری کرے کم ہے۔

غالب کے بعد اُردو اور فارسی شاعری میں اقبال کا ہی درجہ ہے۔ خود اقبال غالب سے متاثر بھی ہوا، اور ان دونوں میں بعض خصوصیات مشترک بھی ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے سر شیخ محمد عبد القادر سابق مدیر مخزن نے بانگ درا کے دیباچہ میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں بھی جا کر چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی پیکر خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے، اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔"

اقبال محض شاعر ہی نہ تھا بلکہ وہ جید عالم بھی تھا۔ اس نے ایک طرف مولانا روم، غالب اور دوسرے مشرقی علماء کے فلسفہ کا مطالعہ کیا تو دوسری جانب نٹشے، برگساں اور گوئٹے کا بھی بنظر غائر مطالعہ اور اس وسیع مطالعہ سے اس نے اپنا ایک جدید فلسفہ پیش کیا، اقبال نے شاعری اور فلسفہ کو ملا دیا۔ اس کے تمام کلام حتی کہ صبح و شام، شفق، جیسی معمولی اور سادہ نظموں میں بھی جا بجا فلسفہ موجود ہے۔

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ قومی شاعر نہ تھا اور ہندوستان میں رہ کر عراق و عرب کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ بہ حیثیت مسلمان اس کو فلسفہ اسلام کے مطالعہ میں سہولت ہوئی اور اس کا بڑا گہرا اثر اس پر پڑا، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے حقائق و واقعات کو نظر انداز نہیں کر دیا۔ در اصل یہ سوال کچھ آسان بھی نہیں ہے کہ کسی شاعر کا کسی بات کے متعلق صحیح اور قطعی نظریہ کیا ہے۔ کیونکہ اس کے پیش نظر تو حقائق اور مشاہدات ہوتے ہیں اور وہ ہر پہلو پر جدا جدا روشنی ڈالتا ہے اقبال مذہب کو کسی ملک سے وابستہ نہیں کرتا وہ عالمگیر اخوت پر زور دیتا ہے، وہ غلط قومیت کو بھی مہلک سمجھتا ہے۔ وہ اپنے ان خیالات کا جا بجا اظہار کرتا ہے، طارق کی زبان سے کہلواتا ہے۔

طارق چو بر کنارِ اندلس سفینہ سوخت — گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم — ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت — ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

جوابِ شکوہ میں صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مذہب کا تعلق کسی خاص ملک یا خطہ سے نہیں ہے ۔

تو نہ مٹ جائیگا ایران کے مٹ جانے سے — نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

وطن کی محبت بلا شبہ ایک عزیز ترین شے ہے ۔ مگر اس میں مبالغہ اور غلو سے کام لینا بھی مناسب نہیں موجودہ زمانہ میں وطنیت کی انتہائی شدت اکثر ممالک میں نظر آرہی ہے، اور دنیا اس کے خطرناک نتائج سے بھی نا واقف نہیں ہے، چنانچہ اقبال کسی ملک کی قید بھی گوارا نہیں کرتا ۔

تو ابھی رہ گذر میں ہے، قیدِ مقام سے گذر — مصر و حجاز سے گذر، پارس و شام سے گذر

لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے حسبِ ذیل اشعار دیکھ کر کون انکار کر سکتا ہے کہ اس کو ہندوستان سے محبت نہ تھی وہ تو نہ صرف وطن بلکہ اس کے پہاڑوں، دریاوں، وادیوں، اور مناظر تک سے الفت کرتا ہے، اس کو خاکِ وطن کا ذرہ ذرہ عزیز ہے ۔ وہ وطن سے دور رہ کر بھی وطن کو یاد کرتا ہے ۔ وہ قومس دو نقد کے " لولے " کی طرح گو اونچی فضا میں پرواز کرتا ہے مگر اس کا دل ہر دم اپنے آشیانے کی طرف ہی لگا رہتا ہے ۔ ہندوستان کے متعلق کہا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستان ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستان ہمارا

ہندوستانی بچوں کے قومی گیت میں لکھتا ہے ۔

چشتی نے جس زمیں پہ پیغامِ حق سنایا — نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا — جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے ۔ میرا وطن وہی ہے ۔

شاعر کو وہ " دیدۂ بینائے قوم " سے تشبیہ دیتا ہے اور دیدۂ بینا کا ملک کی تباہ حالی پر آنسو بہانا ضروری ہے ۔ چنانچہ وہ بھی اپنے ملک کی حالت پر روتا ہے ۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وہ ہندوستانیوں کے آپس کے نفاق اور نا اتفاقیوں کو دور کرنا چاہتا ہے، ان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنا چاہتا ہے ان میں عزم و استقلال کی ایک نئی روح پھونکنا چاہتا ہے ۔ مگر جب دیکھتا ہے ۔ کہ ملک پر جوں تک نہ رینگی تو فیصلہ کن لہجہ میں کہہ دیتا ہے ۔

سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

ہندوستان میں قدیم زمانے میں ہندو مسلمانوں میں جو یگانگت اور خلوص پایا جاتا تھا، اس کے قصے ہر ایک نے اپنے

بزرگوں سے سنتے ہونگے، اور آج جو بات بات پر لڑائی، جھگڑا، دنگا فساد، مار پیٹ، کی نوبت آ رہی ہے' وہ ہم سب کے سامنے موجود ہے، شاعر کی پیش نظر دونوں چیزیں تھیں اس نے ساری کیفیت کو اس شعر میں پیش کیا ہے

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبت قائم تھا
یا بحثِ اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

ہندوستان میں قومیت کا تخیل بالکل جدید چیز ہے ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے بعد سے اس کا آغاز سمجھنا چاہیے، اور ۱۹۳۵ء کے نئے دستور کے بعد اس میں جان ڈالنے کی کوشش شروع ہوئی، شاعر نے اس تخیل کو بہت عرصہ پہلے اس صورت میں پیش کر دیا تھا۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالا اس دیس میں بنا دیں

اقبال نے اگر ایک جانب ابوبکر صدیق رض بلال رض اور اسلام کی دوسری برگزیدہ ہستیوں کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ تو دوسری جانب ہندوستان کے مشاہیر اور بزرگوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، سوامی رام تیرتھ، رام مہاراج، گرونانک، جیسے بزرگوں سے بھی وہ عقیدت کا اظہار کرتا ہے۔ رام مہاراج کے متعلق لکھتا ہے

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

گرونانک کے متعلق ارشاد ہے

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اقبال کے اسلام میں ایک جوش اور ولولہ پایا جاتا ہے، وہ انسان کو پستی سے رفعت کی جانب لے جانا چاہتا ہے اس کو عزم و استقلال، کوشش، نیک کرداری، صداقت، اور بہادری کی تعلیم دیتا ہے۔ زندگی مصیبتوں اور خطروں سے پر ہے مگر بلند ہمت انسان ان خطرات سے نہیں گھبراتا۔ وہ ان کا جان توڑ مقابلہ کرتا ہے۔ اور زندگی میں کامیابی حاصل کرتا ہے ذیل کے اشعار میں ان ہی چیزوں کو پیش کیا ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زندگی کی راہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل
یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

وہ اکثر جگہ اپنے مخاطب نوجوانوں کو بناتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ملک و قوم کا انحصار ان ہی پر ہے یہی ان کی

سب ہم قسمتوں کو بگاڑ اور بنا سکتے ہیں، ان کے لئے کس قدر بلند نصب العین پیش کرتا ہے

ضمیر پاک، نگاہ بلند، مستیٔ شوق　　　نہ مال و دولت قاروں نہ فکر افلاطوں

کسی ملک کے نوجوانوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی زندگی تعیشات و تنوعات میں بسر کریں۔ بالخصوص غلام ملک کے نوجوان کو اس وقت جبکہ اس کے ہم وطن ملک و قوم کی خاطر قربانیاں کر رہے ہوں، جاہ و منصب، آرام و آسائش، اور مال و دولت کی تمنا نہ کرنا چاہئے، چنانچہ کہتا ہے

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر　　　تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

موجودہ دور سرمایہ داری کا دور ہے، سرمایہ داروں نے مزدوروں پر جو مظالم روا رکھے ہیں، ان کی داستان بڑی تلخ اور طویل ہے، مزدور جو دراصل دولت پیدا کر رہا ہے، اس کو اپنی پیدا شدہ دولت کا آٹھواں حصہ بھی نہیں ملتا کہ وہ اپنی اور اپنے بال بچوں کی اچھی طرح شکم پری بھی کر سکے اور وہ لوگ جو پیدائش دولت میں قطعی کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں، مزدوروں کے خون اور پسینہ کی کمائی سے اپنی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کر رہے ہیں اور تمام مزدوروں کی پیدا شدہ آمدنی کی بدولت مزدوروں کے حقوق غصب کرنے میں مدد لیتے ہیں، اس طویل داستان کو کس عمدہ پیرایہ میں ایک شعر میں بیان کیا ہے،

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی　　　اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

لینن کی زبان سے خدا کے حضور میں کہلواتا ہے۔

رعنائی تعمیر میں، رونق میں، صفا میں۔ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات۔ یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت۔ پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں۔ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات۔ کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ۔ دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

روس میں جو انقلاب ہو رہا تھا وہ اس کے سامنے تھا۔ دوسرے ممالک میں مزدور جو آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں وہ بھی اس کے پیش نظر تھی، اس لئے وہ یقین کر لیتا ہے کہ اب سرمایہ داروں کا خاتمہ قریب ہے۔ اس لئے کہتا ہے۔

پرانی سیاست گری خوار ہے　　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے　　　گیا دور سرمایہ داری گیا　　　تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے　　　ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

دور سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے، غریبوں کو ان کے جائز حقوق مزدوروں کو ان کی مزدوریاں دلوانے، مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ گرفت سے چھڑانے، اور نام نہاد مولویوں، پنڈتوں اور پادریوں کی غلط تعلیم و تدریس کے خلاف آواز بلند کرتا ہوا خدا کی زبان سے کہلواتا ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　　کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو　　　گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے　　　کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو　　　جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی۔ اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو۔ کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے۔ پیران کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو

وہ اس ساہوکار کو جو اپنی ناجائز ترکیبوں سے غریبوں کی آمدنی کا بڑا حصہ بشکل سود وصول کر لیتا ہے، اور اس نظام سلطنت کو جس میں غریبوں کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو، جہاں وہ اپنی داد خواہی نہ کر سکیں، جہاں کوئی ان کی آواز سننے والا نہ ہو، ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔　　　چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں　　　ساہوکاری، بیسواداری، سلطنت

دنیا کا ہمیشہ سے قاعدہ رہا ہے کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں، بڑے جانور چھوٹے جانوروں کا شکار کر لیتے ہیں۔

سب رس جون ۱۹۳۸ء

جو جتنا کمزور ہوتا ہے اس کو اتنا ہی زیادہ دبایا جاتا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد کس طرح یورپ کی مختلف حکومتوں کو دبایا گیا، ان کی نو آبادیاں چھین لی گئیں، فوج و اسلحہ میں کمی کی گئی تاوان جنگ عاید کیا گیا اور دنیا خاموشی سے تماشا دیکھتی رہی۔ مگر جب یہ ملک خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے اور قوت و اقتدار حاصل کیا تو ان نے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا، اسلحہ و فوج میں اضافہ کیا نئے نئے ملکوں پر قبضہ کرلیا اور دنیا نے بھی بے چون و چرا ان کے حقوق کو تسلیم کیا۔ شاعر یہی کہتا ہے کہ جب تک دوسروں کی مدد اور بھروسہ کا انتظار کروگے اسوقت تم ہرگز کامیابی حاصل نہیں کرسکتے، اگر واقعی زبردست بننا چاہتے تو خود اپنے اندر قوت و صلاحیت پیدا کرو تب ہی دنیا تمہارا لوہا تسلیم کریگی، ورنہ کمزوروں کو تو دنیا مٹاتی ہی رہتی ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

ان اشعار کو دیکھکر کون انکار کرسکتا ہے کہ وہ شاعر انقلاب نہ تھا، وہ بادشاہت، سرمایہ داری اور ظالمانہ قومیت کے خلاف ہے اور ببانگ دہل ان کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ جدید تعلیم کے رواج سے ملک میں تعلیم یافتہ افراد ضرور پیدا ہوگئے ہیں مگر ان کی بڑی تعداد مغرب کی تقلید میں مصروف ہے، مغرب کی جن مختلف باتوں کی تقلید کی جا رہی ہے، ان میں سے ایک چیز الحاد بھی ہے، سوسائٹی ان لوگوں کو قدامت پرست تصور کرتی ہے، جو باوجود اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے خدا پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ اقبال کہتا ہے

ہم سمجھتے تھے کہ لائیگی فراغت تعلیم کیا خبر تھی کہ چلا آئیگا الحاد بھی ساتھ

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں پیش کیا ہے۔

آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل دنیا تو ملی، طائر دیں کر گیا پرواز

دوسرا شعر آج سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے کا ہے، ورنہ آج تو یہ حال ہے کہ دنیا بھی نہیں ملتی وہ موجودہ تعلیمی نظام سے بھی مطمئن نہیں اس کا خیال ہے، اور جو بالکل صحیح ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم ہم میں صحیح علمی مذاق، نجتہ فکر پیدا نہیں کرتا، اور ہماری تعلیم محض کتابی تعلیم ہو کر رہ جاتی ہے۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے، مگر صاحب کتاب نہیں

حکمران قومیں کبھی یہ نہیں چاہتیں کہ ان کے محکوم ممالک آزاد ہوں، خواہ ان سے بجائے معاشی فائدہ کے نقصان ہی کیوں نہ پہونچ رہا ہو، ریاستہائے متحدہ امریکہ باوجود جمہوریت کی دلدادہ ہونے کے اور باوجود جمہوریت کا دم بھرنے کے فلپائن کے چند مٹھی بھر جزیروں کو بھی مکمل آزادی نہیں دینا چاہتیں، زبردستی ان کو محکوم بنائے ہوئے ہیں، یہی صورت دوسری حکمران قوتوں کی ہے اگر کبھی محکوم ابھرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو مختلف حیلوں، بہانوں اور تدبیروں سے ان کو تھپک تھپک کر سلا دیا جاتا ہے، شاعر نے اس حکمت عملی کو یوں بیان کیا ہے۔

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

مسلمانوں کے پاس اول تو جائداد ہی نہیں، اور جو کچھ ہے وہ بھی ان کی فضول خرچیوں اور بری عادتوں کی بدولت ان کے قبضہ سے نکلی جا رہی ہے۔ اس خیال کو کس لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

قانون وقف کے لئے لڑتے ہیں شیخ جی پوچھو تو وقف کے لئے جائداد بھی ہے

پیروں کی جس قدر عزت و وقعت ہمارے ملک میں ہے، شاید ہی کسی ملک میں ہو، خود مرید کے گھر میں کھانے کو نہ ہو مگر حضرت پیر و مرشد کی خدمت میں نذر، حلوے مانڈے، دستار و تہ بند کا پیش کرنا ضروری ہے، دراصل ان میں اور ساہوکار میں کوئی فرق نہیں، ایک غریبوں کی آمدنی پر گھل سود در سود وصول کرتا ہے، اور دوسرا بشکل نذرانہ [illegible] مرتبہ اپنے رکیک افعال سے ان بندگوں کو بھی بدنام کرتے ہیں جن کے یہ نام لیوا ہیں مگر اس کے باوجود بھیڑوں کے لباس میں بھیڑیوں سے کوئی بدگمان نہیں۔ اور ان کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہا جاتا ہے، شاعر نے کس انداز اور خوبی سے ان لوگوں کی قلعی کھولی ہے، نیز نظم کا عنوان "باغی مرید" قرار دیا ہے، کیونکہ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب ارادت و عقیدت مرید تو ان کی شان میں اس قسم کی گستاخی کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی　　گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن
شہری ہو دہاتی ہو مسلمان ہے سادہ　　مانند بتاں پجتے ہیں کعبہ کے برہمن
نذرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا　　ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن
میراث میں آئی ہے انھیں مسند ارشاد　　زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

اردو شاعری کے جدید دبستان کے امام مولانا حالی تھے جنھوں نے گل و بلبل، سنبل و ریحان، اور ہجر و وصال کی پامال داستانوں کو چھوڑ کر ایک نئی روش اختیار کی۔ اقبال اس دبستان کے پہلے اور سب سے اہم علمبردار تھے، انھوں نے اس نوشگفتہ کلی کو گل نورس میں تبدیل کیا، انھوں نے اعلیٰ جذبات، قومی سیرت، انسانی عظمت، اپنج ذوق طلب، اور سیاست حاضرہ پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھ کر شاعری کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اقبال نے فطرت کی ان چیزوں میں بھی حقیقت کی جھلکیاں دیکھیں جن کو دوسرے مبتذل اور عامیانہ سمجھ کر نظر انداز کر چکے تھے، چنانچہ انھوں نے گائے، گلہری، مکڑی، مکھی، جگنو جیسی بے حقیقت اور معمولی چیزوں پر اعلیٰ قسم کی نظمیں لکھ کر اپنی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا۔ جگنو جیسے حقیر کیڑے پر جو نظم لکھی ہے۔ غالباً اردو ادب اب تک تو اس کا جواب پیش نہ کر سکا، کہتا ہے

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں　　یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ　　یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا　　غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی　　نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی　　جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے
یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو　　ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال نے مغربی ادب کا مطالعہ کیا، مغرب میں کافی عرصہ تک قیام کیا، مگر وہ مغرب کی پرشکوہ عظمت و شہرت سے مرعوب نہ ہوا، وہ ہر مغربی شے کو اپنے شوق معیار پر جانچنے کی کوشش کرتا تھا، وہ مشرقی تہذیب کا علمبردار تھا، اس نے مغربی خیالات کی رو میں اپنے پاؤں اکھڑنے نہ دیئے اس کی شاعری میں مشرقی نشاۃ ثانیہ کی روح موجود ہے، اس نے قدامت اور جدت میں اس صحیح اور موزوں تناسب کو قائم رکھا جو ہر دور میں کسی رہنمائے قوم، شاعر یا مجدد کا فرض ہے۔ ایسے افراد جو قوموں کی رہبری کرتے ہیں، ان کا ادب بناتے ہیں، ان میں جوش و ولولہ پیدا کرتے ہیں ہر وقت اور ہمیشہ پیدا نہیں ہوتے، میرا عقیدہ ہے کہ میر نے ان ہی ہستیوں کے متعلق کہا ہے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں　　تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اقبال ہم سے جدا ہو چکا ہے، زندگی میں کبھی اس کی عظمت کا وہ احساس پیدا نہ ہو سکا جو اب ایک خلا کی صورت میں محسوس کیا جا رہا ہے جو اس کی وفات سے پیدا ہو گیا ہے، گو اقبال آج ہم میں موجود نہیں مگر اس کا کلام جو فنائیت کی دسترس سے باہر ہے، ہمارے ادب کا گرانبہا خزانہ ہے جس سے نہ صرف ہم بلکہ آنے والی نسلیں بھی مستفید ہوں گی، وہ ان کے لئے شمع ہدایت کا کام کرے گا، غنچوں کو گرمائے گا، دلوں میں جولانیاں پیدا کرے گا، خفتہ قوتوں میں جوش و ولولہ اور عزم و استقلال پیدا کرے گا، یہی ایک باکمال بلند پایہ اور بلند مرتبت شاعر کا کمال ہے۔

محمد احمد سبزواری　بھوپال۔

اقبال کی وطن پرستی

اقبال کی شاعری میں جس عنصر کو سب سے کم نمایاں کیا جاتا ہے، وہ اس کی وطن پرستی ہے۔ حالانکہ ہندوستان کا یہ شاعر اعظم جس نے اپنے جادو اثر نغموں سے دنیا کا دل موہ لیا تھا، ایک حقیقی محب وطن ہے۔ ان کا ترانہ اور اکثر و بیشتر اشعار علی الاعلان اس جذبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے وہ لوگ جو اقبال کو فرقہ پرستی کے رنگ میں دیکھنے کے عادی ہیں حقیقت نہیں جانتے۔ قطع نظر اس کے ان کا ایک خاص سیاسی مسلک تھا، ہم ان کی وطن پرستی پر کوئی شبہ نہیں کر سکتے برخلاف اس کے یہ خیال نا ممکن نظر آتا ہے کہ ایسا ذی حس شاعر جس کا دل محبت و عشق کے انتہائی جذبات سے معمور ہو اپنے ملک سے کوئی انس نہیں رکھتا تھا حقیقت پوچھئے تو وطنیت انسان کی فطرت میں داخل ہے، چنانچہ آدمی میں جس قدر یہ جذبہ ترقی یافتہ ہوگا وہ اس کے بلند احساسات کو ظاہر کرےگا۔ یہ ناممکن ہے کہ بچہ ماں کی گود سے لاگو نہ رہے، گہوارہ سے انس نہ رکھے اور پھر جب بڑا ہو تو گھر کی چار دیواری سے محبت نہ کرے یہی وجہ ہے کہ اکثر نئے مقامات پر بچوں کو نیند نہیں آتی اور وہ چڑچڑے ہو جاتے ہیں، جیسے جیسے ہم ہوش سنبھالتے ہیں ہمیں ہمسایہ سے لگاؤ ہو جاتا ہے، پھر محلہ کی باری آتی ہے، اس کے بعد شہر اور ملک سے انس پیدا ہوتا ہے، اور یہ کیفیت اشرف المخلوقات تو کجا ادنیٰ حشرات الارض یعنی چیونٹیوں، کوڑوں، شہد کی مکھیوں، اور کئی جانداروں میں پائی جاتی ہے، پھر اقبال جو نوع انسانی کی ایک بہتر پیداوار تھے، کیونکر اس جذبہ سے مبرا ہوتے، آج ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر ان کا ترانہ ہندی ہے اور اب بھی ملک کے مدرسوں کے در و دیوار "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کے نغموں سے گونج اٹھتے ہیں بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے سرمایۂ سخن کا سارا جوش، پوری قوت اور تمام لطیف احساس کو ان چند منظوم جملوں میں مرکب کر دیا گیا ہے اور ایک ایسا قوام پیدا ہوا ہے، جس نے قوم کے معطل دماغ کو جگا دیا، اس کی مردہ رگوں میں خون کی روانی تیز کر دی اور اس کے پژمردہ اعصاب میں ایک نئی روح پھونک دی اور شاید ہندوستان کی آیندہ تاریخ میں اس ترانہ کا ہر بند ایک مذہبی تقدس کا حامل رہے گا۔

نہ صرف یہ بلکہ ملک کی ابتر کیفیت نے اقبال کے دل کو سخت متاثر کیا تھا، وہ اپنے وطن کی گرتی ہوئی حالت کو دیکھ کر تڑپ جاتے تھے، اکثر ان کے اشعار اس احساس کو کچھ اس طرح رقت انگیز الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ خود غرض طبائع بھی تصویر درد بن جاتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں — تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے — عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

انھیں اپنی اس حب وطنی پر ناز ہے، اور وہ فخریہ کہتے ہیں کہ

عطا ایسا بیاں مجھکو ہوا رنگیں بیانوں میں — کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دیدیا گویا — لکھا کلک ازل نے مجھکو تیرے نوحہ خوانوں میں

بعض وقت وہ اس جذبہ سے اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ جنت نشان وطن کی زمین کا چپہ چپہ ان کی نظروں میں آسمان سے بلند ہو جاتا ہے۔

بندے کلیم جس کے پربت جہاں کے سینا — نوح نبی کا آکر ٹھیرا جہاں سفینہ۔
رفعت ہے جس زمیں کی بام فلک کا زینہ — جنت کی زندگی ہے جس کی ہوا میں جینا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

وطن کے ان روز افزوں اختلافات اور فرقہ آرائیوں سے وہ متنفر ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ملک کے ان بکھرے دانوں کو محبت و عشق کی ایک نظم میں منسلک کر دیں۔ کہتے ہیں۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو — جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا
جلانا ہے مجھے ہر شمع دل کو سوز پنہاں سے — تری ظلمت میں میں روشن چراغاں کر کے چھوڑونگا

اسی خیال کو کس بہتر کنایہ میں پیش کیا ہے۔

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاک وطن کا مجھکو ہر ذرہ دیوتا ہے
آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں — بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ — دامان آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نفاق پرور فضا سے وہ گھبرا جاتے ہیں، اور اس پریشانی میں جو صدائے درد ان کے حساس قلب کی گہرائیوں کو چیرتی ہوئی نکلتی ہے، وہ سامع پر بجلی کا اثر کرتی ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے — ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا یاں تو اک قرب فراق آموز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطف نغمہ پیرائی نہیں
لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں — اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

ہندوستان کا یہ جلیل القدر شاعر ایک سچا وطن پرست شکر تھا وہ آج ہم میں نہیں لیکن اس کے کلام نے جس نے کشمیر سے لیکر راس کماری تک بلا لحاظ امتیاز مذہب و ملت دلوں کو گرما دیا ہے وہ اس ظلمت کدہ میں ہزاروں مایوس دلوں کی رہنمائی کرتا رہے گا

گروچرن داس سکسینہ

بزم تہذیب

اشک خونیں

تیرہ و تاریک قطروں میں، نہ ہو کیونکر جہاں — سایۂ اقبال سے محروم ہے ہندوستاں
گونج اٹھی، جس کے نغموں سے فضائے بوستاں — اٹھ گیا دنیا سے اب وہ بلبلِ شیریں بیاں

جس کے نغموں کا ترنم، جاں نوازِ زندگی
جس کا سوزِ دل پئے ملت تھا سازِ زندگی

ملہمِ اسرارِ غیبی، آہ جو خاموش ہے — قلبِ ملت میں الٰہی حسرتوں کا جوش ہے
واقفِ رازِ حیاتِ دہر، خود روپوش ہے — واصلِ حق، آخرش وہ عارفِ ذی ہوش ہے

قوم کو درسِ بصیرت، جو سدا دیتا رہا
کشتیٔ ملت جو اپنے ہاتھ سے کھیتا رہا

قوم مردہ کو دیا جس نے پیامِ زندگی — جس کی ہر تصنیف ہے نقشِ دوامِ زندگی
جس کا اک اک شعر ہے، روحِ کلامِ زندگی — منضبط جس کے تخیل سے نظامِ زندگی

جس نے ملت کو سکھائے درسِ اطوارِ خرد
منتشر آفات میں کر ڈالے انوارِ خرد

مبدءِ فیاض سے پائی وسیع المشربی — فیض سے سیراب جس کے مشرقی و مغربی
رفعتِ افکار میں شامل تھی، تعلیمِ نبیؐ — رازجویانِ حقیقت کی بجھی تشنہ لبی

آشکارا کر دئے، ہستی کے اسرارِ نہاں
راہ گم کردہ کو منزل کا دیا جس نے نشاں

روح پرور ہیں جو اس شاعر کی نغمہ سنجیاں — موت میں بھی شان اس کی زندگی کی ہے عیاں
اس کے نقشِ پا ہمیں منزل کا دیتے ہیں نشاں — جس کے ہیں درسِ بصیرت رہنمائے کارواں

زندۂ جاوید بعدِ مرگ بھی اقبال ہے
تیرے نغموں میں نوائے زندگی اقبال ہے

نوشابہ خاتون

علامہ اقبال کے ساتھ چند لمحے

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی موت مشرق کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، اور ایسی ہستیاں جن کے دل میں وطن کا درد ہوتا ہے، ضرور اپنی جدائی سے اہل وطن کو رنج والم میں مبتلا کر دیتی ہیں، یقیناً اقبال اپنے اہل وطن اور خصوصاً اپنی قوم کی ترقی و بیداری کا آرزو مند تھا، مشرق کا یہ مایۂ ناز شاعر صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑا فلسفی، سیاست داں اور رہا دی قوم بھی تھا، عام شاعری اس پر اپنا رنگ نہ جما سکی بلکہ شاعری کو اس نے اپنے رنگ میں رنگا اور اس کے ذریعے سے مقتضائے وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اہل ملک کو ترقی اور بیداری کا سبق دیا، اس شاعر کی آہ اور واہ ہماری زبوں حالی کا مرثیہ اور ہماری عظمت گذشتہ کی تصویر تھی اور اس کی آرزو ہماری امید ترقی۔ اقبال کا پیام صرف مسلمانوں یا ہندوستانیوں سے مخصوص نہ تھا، بلکہ دنیا میں جہاں کہیں غلام قوم آباد ہے وہ مشعل ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ اقبال کی حیثیت بین الاقوامی تھی۔ میں اس وقت اس مختصر سی گفتگو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو دو سال قبل کشمیر جاتے ہوئے اس شاعر اعظم سے ملاقات کا شرف حاصل ہونے پر ہوئی تھی۔ عجب اتفاق کہ اوائل مئی اور لاہور کی گرمی ہونے پر دن کے تقریباً بارہ بجے تھے کہ میں اپنے چند رفقا کے ساتھ سر اقبال کی قیام گاہ "جاوید منزل" پہنچا۔ گو وقت ایسا غیر موزوں تھا لیکن اطلاع ملتے ہی فوراً اپنی آرام گاہ میں آنے کی ہم کو اجازت دی۔ برآمدے میں سے گذر کر ہم لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔ اس وقت مشرق کا یہ شاعر عظیم پلنگ پر تکیہ سے ٹیکہ لگائے نیم دراز لیٹا ہوا تھا، صرف تہمد اور کرتہ زیب بدن تھا۔ ہاتھ میں حقے کی نلی تھی، اور ایک صاحب سامنے ذرا ہٹ کر بیٹھے تھے کچھ نوٹ کرایا جا رہا تھا۔ ہماری جانب پشت تھی لیکن جونہی، ہم داخل ہوئے ہماری طرف مڑ کر سلام لیتے ہوئے اور مصافحہ کرتے ہوئے سامنے کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اقبال کی علالت کا خیال کر کے جس کی وجہ سے شرف نیاز حاصل ہونے میں بھی ہم کو شک تھا، ہم لوگوں نے مشورہ کر لیا تھا کہ بہت ہی کم بات کریں گے، غرض گفتگو کا آغاز اسی ممتاز ہستی پر چھوڑا، سر اقبال نے ٹھیر ٹھیر کر اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے گفتگو فرمائی اور بات کرتے وقت سانس کی آواز زور سے آ رہی تھی گفتگو کبھی اردو میں اور کبھی انگریزی میں کی زیادہ تر انگریزی ہی میں گفتگو رہی، سر اقبال نے ہماری آمد کی وجہ دریافت کی اور جب ہم نے اپنا کشمیر کا قصد بتلایا تو فرمانے لگے کہ۔ جہاں تم جا رہے ہو وہ اصل کشمیر نہیں، میں بھی اصل کشمیر دیکھ نہ سکا، کشمیر ان اندرونی مقامات میں واقع ہے، جن کا راستہ دشوار گذار اور اکثر برف سے بند رہتا ہے، گویا سر اقبال نے وادی کشمیر کو جس میں سری نگر آباد ہے، یا خاص کر سری نگر کو اصل کشمیر قرار نہ دیا، بلکہ وہ جنت نظیر مقامات جہاں کا راستہ صرف چند روز کے لئے کھلا رہتا ہے، اور جہاں جانے کی شاعر کو آرزو رہی، اس کے بعد درد مند قوم نے ہماری پستی اور زبوں حالی کا مرثیہ چھیڑا اور ہماری ترقی کی فی الحال بہت کم امید ظاہر کی جب ہم نے یورپ کے

موجودہ مسلمانوں کا ذکر کیا تو ارشاد ہوا کہ ان کو میں تم سے زیادہ جانتا ہوں، اکثر برائے نام ہیں، اور حقیقی جوش ان میں مفقود ہے، ہندوستان کے متعلق فرمایا کہ یہاں کی حالت عیاں ہے، سلطان ٹیپو کے زمانے میں مسلمانوں کی امیدیں دکن سے وابستہ تھیں، اب شمالی ہند سے وابستہ ہیں، اس سے سر اقبال کا مطلب یہ نہ تھا، کہ خدانخواستہ دکن کے مسلمان راہِ ترقی میں پیچھے ہیں، بلکہ مراد یہ تھی کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کی اُمیدیں دکن سے وابستہ تھیں اور جب سلطان ٹیپو کی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو وہ اُمید باقی نہ رہی۔ اب کہ انگریزی حکومت ہے اور جمہوریت کا آغاز اور چونکہ مسلمانوں کی اکثریت شمالی ہند میں ہے، اس صورت میں اس قسم کی امیدیں بھی وہیں سے وابستہ ہیں، اس کے بعد فرمانے لگے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت خراب ہے، شمالی ہند کے امرا اور شرفا کو غدر نے تباہ و برباد کر دیا اور اکثر حیدرآباد کے امرا و شرفا کو عیش پرستی نے برباد کیا، یہ کہہ کر سر اقبال نے میری طرف دیکھا اس میں شک نہیں کہ یہ حیدرآباد پر حملہ تھا لیکن کچھ صداقت پر بھی مبنی تھا، میں نے کہا کہ اس کا اطلاق سب پر نہیں ہو سکتا اور یوں تو دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اس قسم کی بدعنوانیاں نہ ہوں تو اقبال مرحوم نے مسکراتے ہوئے فرمایا "ہاں ٹھیک ہے، لیکن حیدرآباد اس کے لئے بدنام ضرور ہے" اس قسم کی گفتگو سر اقبال نے اس وجہ سے فرمائی کہ ہم سب مسلمان تھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی قوم کی اصلاح اور ترقی کی عظیم المرتبت شاعر کو بےچینی سے آرزو تھی؛ اس کے بعد ہم نے وفاق کا مسئلہ چھیڑا۔ یہ وہ پیچیدہ مسئلہ ہے جو حل ہونے کا نام نہیں لیتا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کب، اور کس شکل میں حل ہو گا، سر اقبال وفاق کی موجودہ صورت کے بالکل خلاف تھے، ان کی رائے میں ہندوستان کی تین حصوں میں تقسیم ہونی چاہیے تھی یعنی دیسی ریاستیں، ہندو اور مسلم ہم نے اس کے امکانات پر سوال کیا تو فرمانے لگے کہ "یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے، اور اب کہ انڈیا ایکٹ پاس ہو چکا ہے، اس پر بحث کرنی بیکار ہے، ان دنوں شہید گنج کا مسئلہ تازہ تھا اور مسٹر جناح کو مسلمانوں نے اپنا نمائندہ بنا کر سمجھوتے کے لئے مقرر کیا تھا، اس کے متعلق دریافت کرنے پر فرمایا کہ تفصیل اور واقعات تو تم نے اخبار میں دیکھے ہوں گے مسٹر جناح ایک شریف انسان ہیں، ان میں لیڈر ہونے کی پوری قابلیت موجود ہے۔ اور مجھ کو ان پر کامل اعتماد ہے، یہ دو برس پہلے کی بات ہے اور اس کے بعد مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر اور بلا اختلاف مسلمانوں کے لیڈر بنے، میں نے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا، کیونکہ اب پھر سر اقبال نے تکیہ کو ٹیکا دیا تھا، میرے دوستوں نے اپنی اپنی آٹوگراف بک پیش کی، سر اقبال یہ ارشاد فرماتے ہوئے کہ ہیرو ورشپ اسلام کے خلاف ہے۔ مسلمان کو اس قسم کا شوق نہ رکھنا چاہیے، اپنی دستخط کی۔ سر اقبال کا یہ فرمانا میرے موافق ہوا، کیونکہ نہ تو میرے پاس اس وقت آٹوگراف بک تھی اور نہ مجھے اس کا شوق جب میری طرف کتاب کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میں نے کہا، آپ کی ہدایت پر میں پہلے ہی سے عمل پیرا ہوں تو مسکرانے لگے، اس کے بعد مصافحہ کر کے ہم خوش خوش اقبال سے رخصت ہوئے یہ ایک اتفاقی ملاقات کی سرسری گفتگو تھی جو مختلف موضوعوں پر ہوتی تفصیل سے اقبال عمر بھر کہتے رہے، ان کا کلام ہمیشہ کے لئے جب تک اردو زبان بھی زندہ ہے زندہ رہیگا، اس ملی اور قومی جذبات کا مجھ پر بہت اثر ہوا اس وقت کی پوری تصویر میری نظر کے سامنے ہے گفتگو اور طرز گفتگو سے صاف ظاہر تھا کہ قوم کا درد اس قومی شاعر کے دل میں حقیقی طور پر جاگزیں ہے اللہ جل شانہ سے دعا ہے کہ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور ہم کو وہ درجہ نصیب کرے جس کی مرحوم کو آرزو رہی ہے

محمد الیاس

اقبال کا نوجوانوں کو پیغام

اقبال نے عام طور پر نوجوانوں کو مخاطب کیا اور مختلف جگہ اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے مثلاً ایک جگہ حقائق زندگی اور سرمایۂ حیات وغیرہ کے متعلق فرماتے ہیں
جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ — خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ
طلبائے علی گڑھ یونیورسٹی کے نام آپ نے جو پیغام بھیجا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ میرا پیام اوروں کے پیام سے نرالا ہے اور پھر اس کے بعد حیات اور زندگی وغیرہ کے متعلق یوں گوہر افشانی فرماتے ہیں ؎ آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے
موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے — شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز — غم کدۂ نمود میں شرط دوام اور ہے
اور پھر تعجب کرتے ہیں ؎ بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی — رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسیا ابھی — ایک جگہ اپنے متعلق فرماتے ہیں ؎ عشق نے کر دیا تجھے ذوق تپش سے آشنا — بزم کو مثل شمع بزم حاصل سوز و ساز دے — ایک جگہ نوجوانوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں ؎

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی — لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں — نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

پھر دلاسا دیتے ہیں ؎ نہ ہو نومید نومیدی زوال علم و عرفاں ہے — امید مرد مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
ان کے نزدیک نوجوان ایک پرند ہے جس کو ہر قسم کی مصیبت ہر قسم کی تکلیف اور صبر کا ساتھ کرنا چاہئے آپ نہیں چاہتے کہ نوجوان بڑے بڑے عالیشان محلات میں آرام کی زندگی بسر کریں ؎ نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں
اقبال کے نزدیک خودی کی پرورش نہ کرنے والے شخص کی کوئی اہمیت نہیں ان کا خیال ہے کہ خودی کی پرورش کرنے والا شخص ایک بلند خیال اور بلند مرتبہ آدمی بن سکتا ہے متعدد جگہ انھوں نے اس کا اشارہ کیا ہے ؎
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے — اس آبجو سے کئے بحر بیکراں پیدا — وہی زمانے کی گردش سے باز آتا ہے — جو ہر نفس سے کرے عمر جاوداں پیدا
ان کے خیال میں خودی سے استغنا کی وجہ سے تمام لوگ — میں کر کے ہوئے ہیں ؎
خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور — خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام — خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر — قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
غرض آپ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ خودی کی حفاظت نہایت ضروری ہے اس کے علاوہ دوسری اور چیزوں کے متعلق بھی انھوں نے جو ہدایت فرمائی ہے ...... کہ انسان کو جس قدر بھی تکلیف یا ذلت سہنا ہو ہمیشہ خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کرنا چاہئے مثلاً فرماتے ہیں ؎
طریق اہل دنیا ہے گلہ شکوہ زمانے کا — نہیں ہے زخم کھا کر آہ کرنا شان درویشی — یہ نکتہ پیر دانا نے مجھے خلوت میں سمجھایا — کہ ہے ضبط فغاں شیری فغاں روباہی و میشی
وہ ہمیشہ کاہل اور بیکار آدمیوں سے نفرت کرتے تھے بلکہ ان کے سایہ میں اپنا گزر حرام سمجھتے ان کا خیال تھا کہ لا ابالی زندگی سے دنیا میں ابتری اور تباہی پیدا ہوتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ اقبال ہمیشہ اپنے دوستوں کو اور خصوصاً نوجوان طلباء کو ہدایت کرتے کہ کوئی بہتر کام انجام دیا جائے ان کا خیال تھا کہ سستی اور کاہلی موت کے مساوی ہے مثلاً ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎
آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ — ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ان کا قول تھا کہ جس چیز سے دنیا کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا وہ چیز بالکل بیکار ہے بلکہ ایسی چیز کا دنیا سے فنا ہو جانا بہتر ہے ؎

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

الغرض اقبال کا پیام نوجوانوں کے لئے اس سارے بیان سے یہی نکلتا ہے کہ (۱) مسلم نوجوانوں کو اسلام سے محبت و الفت پیدا کرنا (۲) اقبال نے مسلمانوں میں جو غلطیاں پائیں انھیں رفع کرنے کی کوشش کی یہ اقبال کا پہلا مقصد تھا اور نوجوان طلباء کے لئے یہ پیغام تھا کہ خود کو پہچانو خود کو جانو اور خودی کا احساس پیدا کرو، اس کے علاوہ خاص مسلمانوں کے لیے جو پیغام بھیجا تھا وہ یہ کہ سارے دنیا کے مسلمان در اصل ایک ہیں اور انھیں چاہئے کہ آپس میں متفق ہو کر یکجہتی کی کوشش کریں، اقبال کے نزدیک عملی جد و جہد زندگی اور کاہلی بیکاری موت ہے، اقبال کا پیغام اعلیٰ تخیلات کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے جس کے سمجھنے کے لئے ایک اعلیٰ دماغ کی ضرورت ہے، اقبال کا پیغام بالکل سچائی پر مبنی ہے اور ایک خاص روحانی جذبہ کا اثر رکھتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جو دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اقبال کی سچائی اور نیک نفسی کا نتیجہ ہے کہ ان کا کلام اس قدر مقبول عام ہوا۔ وہ اپنی قوم والوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ غفلت و سستی کو ترک کرو خود کو سمجھو اپنے اوپر بھروسہ کرو اسلاف کے درخشاں کارناموں پر نظر ڈالو اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرو، اقبال کے کلام میں خوشامدانہ الفاظ نہیں پائے جاتے۔ بلکہ ان کا پیغام سچائی اور سچے جوش پر مبنی ہے، مختصر یہ کہ اقبال کا پیغام عمل و کوشش کا پیغام ہے، آج یہ عالمگیر شاعر یہ خوشنوا طائر اس چمن سے پرواز کر گیا ہے، لیکن اس کے سچے پیغام ہمارے لئے شمع ہدایت ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

کلراج پرشاد

کاشفِ رازِ حقیقت

آہ وہ چرخِ ادب کا مہرِ تاباں مٹ گیا صفحۂ ہستی سے لاثانی سخن داں مٹ گیا
چھوڑ کر بے وقت ہائے اپنا ساماں مٹ گیا نیرِ برجِ شرافت ماہِ رخشاں مٹ گیا

وہ صفِ اول کا اک بے مثل شاعر گم ہوا
نظم و نسقِ شاعری اب درہم و برہم ہوا

مشرقی شاعر کا ماتم حشر تک شہرا پائے گا عمر بھر منصورؔ اس غم کا ترانہ گائے گا
ایسا ہمدم چرخِ کج رفتار کیونکر پائے گا سرپرستِ قوم ایسا پھر کہاں سے لائے گا

مصلحِ اقوامِ ملت ہم سے رخصت ہو گیا
کاشفِ رازِ حقیقت ہم سے رخصت ہو گیا

محمد احمد اللہ خاں منصورؔ
(آصف آباد)

زندۂ جاوید اقبال کی خدمت میں

شعراء کا خراجِ تحسین

ذیل میں ہم ان نظموں سے منتخب شعر درج کرتے ہیں جو ہمیں "اقبال نمبر" کے لئے وصول ہوئی ہیں (سب رس)

وہ روز نہیں، ماہ نہیں، سال نہیں ہے — اندھیر ہے دنیا میں کہ اقبال نہیں ہے
جاتی رہی اب رونقِ دنیائے تکلم — وہ رنگ نہیں، تیل نہیں، اقبال نہیں ہے
رونا ہے وزیر اس کا کہ تھا شاعرِ بے مثل
صد حیف کہ اب ثانیٔ اقبال نہیں ہے

محمد وزیر وزیر

لاہور کی زمیں ہے آرام گاہ اس کی — تھا جس کے دم سے باقی قومی نشاں ہمارا
اب بھی اگر نہ جاگیں، مشرق کی مردہ قومیں — لٹ جائے گا وطن کا سب کارواں ہمارا

محمد سکندر علی سکندر

ضربِ کلیم، سرِ خودی، رمزِ بے خودی — تیری نشانیوں سے ہے دنیا بھری ہوئی
پیامِ مشرق، بانگِ درا، علمِ اقتصاد — تا حشر ہم کو تیری دلاتے رہیں گے یاد
جاوید نامہ، فلسفۂ مسلم و عجم — اور بالِ جبرئیل کو دیکھیں گے جب کہ ہم
لیں گے دعائے خیر سے اقبال تیرا نام
تیری نشانیوں کا کریں گے ہم احترام

میر کاظم علی برق موسوی

جس کے دم سے اک اجالا مشرق و مغرب میں تھا — ہائے وہ شمعِ شبستانِ جہاں جاتا رہا
حریت کی روح جس نے پھونک دی تھی ہند میں — قوم کا ہادی، امیرِ کارواں جاتا رہا

مرزا شاکر علی دانش

یکایک سرزمینِ ہند کا چہرہ دمک اٹھا — ستارہ دفعتاً اقبال کا اپنے چمک اٹھا
اٹھا پنجاب سے اقبال، قومی رہنما بن کر — لیا ہم بے کسوں کو اپنے سائے میں ہما بن کر
دیا افراد کو احیائے ملت کا پیام اس نے — کیا یوں اپنی ملت کی بقا کا اہتمام اس نے
وہ جس کی اک نوا سے عہدِ ماضی ہو گیا تازہ — جو باندھا رشتۂ اشعار سے ملت کا شیرازہ
ہزار افسوس ایسا رہنما رخصت ہوا ہم سے — ہمارے قلب بیٹھے جا رہے ہیں آہ اس غم سے

اس کا ہر نغمہ تلاطم خیز بر و بحر میں　ہر طرف اس کی صدائیں گونجتی ہیں دہر میں
مرتے دم بھی اس کے دل پر کچھ نہ تھا خوفِ خطر　ہاں مگر تھی قوم ہی کی بہتری پیشِ نظر
مسکراہٹ تھی لبوں پر کیسا استقلال تھا
کیوں نہ ہو وہ صاحبِ ایمان و دیں اقبال تھا

ابوالمحامد محمد احمد اللہ احمد

اٹھ خدا کے واسطے اٹھ ہوش میں پھر ہم کو لا　نغمۂ توحید سے پھر وجد میں عالم کو لا
جس طرح اٹھا تھا پھر چشمِ محبت بن کے اٹھ　ہے جہاں میں فتنہ برپا اٹھ قیامت بن کے اٹھ
خشک ہو جو مہر کے پرتو سے وہ دریا نہیں
لاکھ آئے موت پر شاعر کبھی مرتا نہیں

غلام دستگیر خاں یکتا قائم خانی

الوداع اے مادرِ گیتی کے فرخندہ پسر　الفراق اے شاعرِ اسلام، اے صاحب نظر
تو نہیں اقبالؔ، تیری زندگی جاوید ہے　اہلِ بینش کو ترا ہر شعر پیغامِ جاوید ہے
آج تو ہم میں نہیں تو کیا ترا پیغام ہے
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے

ممنور علوی

ہم سب کے جو دل میں تھا وہ لکھا تو نے　ہم سے جو چھپا تھا راز وہ دیکھا تو نے
ہم سب کو چکھا کے زندگانی کا مزہ　آخر کو مزا موت کا چکھا تو نے

سید فخر الحسن لکچرار ٹریننگ کالج

اشکِ خونیں موت پر اقبال کی روتا ہوں میں　آج اے دل بے نیازِ رنگ و بو ہوتا ہوں میں
موت یہ تیری نہیں اُردو زباں کی موت ہے　موت میں پنہاں تری ہندوستاں کی موت ہے
جز ترے ہندوستاں کا پاسباں کوئی نہ تھا　شکر، وہ کا میر کارواں کوئی نہ تھا
یاد تیری حشر تک مشرق بھلا سکتا نہیں　تجھ سا پھر اقبالؔ، ہندوستان پا سکتا نہیں

مرزا باقر علی زاہد

سکا بھی اسے اعزاز ملا اور سر میں اس کے فلسفہ تھا
وہ شاعری کی ٹکسال میں آکر سکہ اپنا ڈھال گیا
اقبال کو اب کیا روتے ہو، کیوں اشکوں سے منہ دھوتے ہو
شاعر نہیں اس کے شعر تو ہیں ماحال رہا من تمال گیا
آزاد نے حکم امجد سے سب رس کے لئے یہ شعر لکھے
ایسا نہ ہو کوئی یہ کہہ دے تو حکم، محمد ٹال گیا

بیٹھے بیٹھے شکوہ ہا ہے خالقِ ارض و سما — قوم کی پستی سے تھیں دل میں ترے بیتابیاں
قیل و قالِ دہر سے کچھ واسطہ تجھ کو نہ تھا — ساری دنیا ہے انوکھا تھا ترا طرزِ بیاں
تو تو ہے آرام سے شہرِ خموشاں میں مگر — بن گیا ہے غم میں تیرے غم کدہ سارا جہاں

میر حسن علیخاں یمین

ہندوستاں نہ ہو کیوں رشکِ جہاں ہمارا — باغ و بہارِ ہستی یہ آشیاں ہمارا
دورِ فلک نے اس کی گو دھجیاں اڑائیں — لہرا رہا ہے لیکن اب تک نشاں ہمارا
بلبل تھا وہ اسی کا ہم نغمہ زن ہیں جس کے
ہے مرغ زارِ عالم ہندوستاں ہمارا

گور سرن لال آزاد

گھٹا رنج و الم کی ہر طرف چھائی ہوئی سی ہے — چمن میں ان دنوں گویا خزاں آئی ہوئی سی ہے
کہا جس نے کہ رازِ زندگی پنہاں ہے حرکت میں — دلیلِ کامرانی "سعیٔ پیہم" ہے حقیقت میں
کریگا یوں تو شاعر سیکڑوں ہندوستاں پیدا
نہیں ممکن کہ ہو اقبال سا معجز بیاں پیدا

محمد جمال

شکوہ سنا جو ہم نے ترا لاجواب تھا — آنکھوں میں پھر گیا وہ زمانہ جو خواب تھا
شکوہ کا تیرے ہو ٹھہرا وہ جواب تھا — واللہ میری آنکھیں تھیں یا اک سحاب تھا

محمد اکرام الحق صدیقی عبرت

جس کا کہنا تھا کہ مسلم موت سے ڈرتا نہیں — جس کے دل میں ہو صداقت وہ کبھی مرتا نہیں
گلشنِ علم و ادب کی ہر کلی افسردہ ہے — تو بظاہر مر گیا پر نام تیرا زندہ ہے

ابوالمکارم محمد شائق عارف چنیاوی

انتخابِ قطعاتِ تاریخی

حزن و غم شاعر
۱۳۵۷ھ
محمد سکندر علی سکندر

سر اقبال خلد بریں کو گئے
۱۳۴۷ف
علامہ سر اقبال بہشت آج گئے ہیں
۱۳۵۷ھ
ابوالحامد محمد احمد اللہ حمد

عزتِ قوم ہے مردہ گر اقبال نہیں
۱۳۵۷ھ
بشیر النساء بیگم بشیر

محمد اقبال رضی اللہ تعالیٰ عنہ
۱۹۳۸ء
معین الدین جوہر فاروقی

راہی خلد ہوئے ہیں میر محمد اقبال
۱۳۵۷ھ
کی قضا اقبال نے افسوس ہے
۱۳۴۷ف
محمد اصغر صدیقی امجد

چل دئے عرشِ معلیٰ پہ ٹہلنے کے لئے
۱۳۴۷ف
جمیل

گئے مر کر بہشت کو اقبال
۱۳۵۷ھ
شیخ حسین شاغل

اقبال کا تخیّل

تخیل اور طرزِ بیان ادب اور خصوصاً شاعری کی جان ہیں۔ اُردو زبان میں ان گنت شاعر اور ناظم ہر دور میں گذرے ہیں اور ان میں جو ممتاز تھے تذکرے ان کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں اور ان کی تعداد بھی کچھ کم نہیں لیکن بہت کم شاعر ایسے ہوئے ہیں جو تخیل کی بلند پروازی اور طرزِ بیان کی دلاویزی کے مالک تھے۔ ایسے شاعر جن کا تخیل نرالا ہو اور جن کے طرزِ بیان میں ندرت ہو یعنے جو تخیل اور بیان دونوں کے اعتبار سے بہت بڑی حد تک ایک انفرادی حیثیت کے مالک ہوں، کم سے کم اُردو زبان میں بہت ہی کم ہوئے ہیں۔ یہ اردو زبان کی ترقی کی فال نیک تھی کہ اقبال جیسا شاعر جو صدیوں ہی میں کسی ملک اور زبان کو نصیب ہوتا ہے اُردو کے موجودہ عبوری دور میں اس کو حاصل ہو گیا تھا۔ اور اپنے تخیل و طرزِ بیان سے اس زبان کو رفعت و ترقی کے ان اعلیٰ مدارج پر پہنچا رہا تھا جو دنیا کی مشہور زبانوں کو حاصل ہیں اور جن کی وجہ سے ایک دنیا ان زبانوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس کے وجد آفریں نغموں کا لطف اٹھانے اور اس کے تخیل کی دنیا میں سیر کرنے کے لئے شائقینِ ادب اسی شوق سے اُردو کی طرف متوجہ ہونگے جس شوق سے گوئٹے کا کلام پڑھنے کے لئے جرمن، ہومر کے مطالعہ کے لئے یونانی اور سعدی و حافظ، مولانائے روم اور عمر خیام کے لئے فارسی زبان پڑھتے ہیں۔

(۲)

اقبال شاعر تھا اور فطرت کی طرف سے شاعری کے ایسے تقاضے لے کر آیا تھا کہ باوجود شاعری سے بیزار ہونے اور ترکِ شعر کی کوششوں کے وہ شعر گوئی سے نہیں رکا۔ اس کی شاعری جو اندر ہی اندر پہاڑ کے لاوے کی طرح ایک بے پناہ جوش و جذبہ کا نتیجہ تھی، یہی وجہ ہے کہ اس کی ہر نظم ایک غیر معمولی زورِ بیان اور رفعتِ تخیل کا نمونہ ہے۔ فطری صلاحیت کے ساتھ اعلیٰ تعلیم اور فلسفۂ مشرق و مغرب کے مطالعہ اور اساتذۂ قدیم کے افکارِ عالیہ پر گہری نظر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس کی ہر نظم میں اس کی انفرادیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ بعض دفعہ روندے ہوئے اور بہت ہی پامال مضامین کو کام میں لاتا ہے لیکن اپنے اندازِ بیان سے ان میں بھی ایک جانِ تازہ ڈال دیتا ہے۔ بچپن کے زمانے میں جب کہ وہ کتابوں کا بستہ بغل میں دبائے مدرسے سے گھر لوٹتا تھا، تو راستے میں ایک جگہ چند خوش فکر شعرا کا مجمع دیکھا۔ مشاعرہ منعقد تھا اور واہ واہ کی آوازوں میں لوگ شعر سنا رہے تھے۔ اقبال نے بھی اس مشاعرے میں ایک غزل سنائی جو اس کی بالکل ابتدائی مشق اور طفلانہ کوشش سے زیادہ نہیں تھی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ابھی سے اس میں انفرادیت کے آثار نظر آتے ہیں۔ پندرہ سولہ برس کا سن اور یہ شعر ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ۔۔۔ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بعض صاحبِ نظر اور مبصر حضرات نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، یہ لڑکا شاعر ہے اور آگے چل کر بڑا شاعر ہوگا۔ یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اقبال آج نہ صرف اُردو بلکہ سارے ممالکِ مشرق کا شاعرِ اعظم کہلاتا ہے۔

سید محمد

بچوں سے دو باتیں

"اقبال" کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ آپ کے وطن کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس نے پچھلے مہینے وفات پائی۔ دنیا کو جدائی کا رنج دے گیا۔ اقبال نے آپ جیسے کم عمر بچوں کے لئے بھی بعض بڑی اچھی نظمیں لکھی تھیں۔ فرصت کے وقت ان کو ضرور پڑھئے۔

"سب رس" بھائیوں اور بہنوں نے اپنے "سب رس" کے لئے اقبال پر بہت اچھے مضمون بھیجے۔ بعض مضمون ہم اس لئے نہیں چھاپ سکے کہ ان کے لئے "سب رس" میں جگہ نہیں تھی۔ ان مضامین کے لکھنے والوں کو جو سب رس میں جگہ نہ پا سکے رنجیدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ ان کی بجائے ان کے دوسرے بھائیوں کے مضامین چھپ گئے ہیں۔

اب کی دفعہ ہم آپ کے لئے "پہیلیاں" نہیں چھاپ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اپنا تمام وقت اپنے شاعر کے حالات پڑھنے میں گزاریں۔ آئندہ مہینے میں ہمیشہ کی طرح ہم مئی نمبر کی پہیلیوں کے حل اور نئی پہیلیاں چھاپیں گے۔

آپ کے ہاتھ میں رسالہ پہنچتے ہی آپ کی نظروں نے ایک تبدیلی دیکھی ہوگی۔ اور آپ اس کو دیر تک دیکھتے رہے ہوں گے۔ یہ سرورق کی تبدیلی ہے۔ آپ مسٹر خلیل سے واقف ہی ہوں گے۔ جنھوں نے آپ کے رسالہ کے لئے پہلے بھی ایک سرورق بنایا تھا۔ اور جس کے متعلق آپ میں اکثر بھائیوں اور بہنوں نے ہمارے سوال کا جواب دیا تھا۔

"اقبال" کے متعلق جو مضمون لکھے گئے ہیں ان پر خواجہ حمید الدین صاحب شاہد نے جو بڑی محنت سے آپ کے رسالہ کا انتظام کرتے ہیں، سراج الدین احمد صاحب اور سب رس کے مشہور مدد دینے والے معین الدین احمد انصاری صاحب نے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ہم آنے والے مہینے میں اعلان کریں گے یہ انعام کس نے حاصل کئے۔

میکش

معمۂ اقبال

ہر لفظ کے سر حرف کو جوڑنے سے ایک نام نکلتا ہے اور یہ تمام نام اقبال ہی سے متعلق ہیں۔

مثلاً :۔ باسط۔ قاضی۔ احمد۔ لیاقت۔ اکبر = (اقبال)

(۱) اسد۔ بغداد۔ ناصر۔ گاجر۔ رحیم۔ اقبال۔ داؤد۔

(۲) یٰسین۔ سراج۔ انصاری۔ لئیق۔ وحید۔ کریم۔ ٹٹو۔

(۳) بیراج۔ امجد۔ معین۔ لاج۔ ہنسی۔

(۴) رفعت۔ ضعیف۔ باجا۔ لاٹھ۔ یاد۔ امجد۔

(معمہ ۱۔ ۲۔ ۳۔ الضار(ی)

یادِ اقبال

بزمِ نونہال سلسلہ جوہری گلی

عزیز سب ہی بچو! تم کو بھی بہت رنج ہوا ہوگا۔ اور کیسے نہ ہوتا۔ اقبال کی موت صرف بڑوں ہی کے لئے باعث رنج نہیں تمہارے لئے بھی ہے۔ اقبال تمہارا بھی ہے۔ اقبال کو تو شاید نہ دیکھا ہوگا لیکن سب رس کے [illegible] نمبر میں ان کی تصویر دیکھ لو۔ ایک بڑے آدمی کو کیسا ہونا چاہیے تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ چہرے سے کتنی ذہانت، سنجیدگی اور بڑا پن جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشکل مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی قوم کے لئے وقف تھی۔ قوم کا درد ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ قوم کی موجودہ خراب حالت ہی نے ان کی جان لی۔ ہندوستان بھر میں کشت و خون ہو رہا ہے۔ کہیں ہندو مسلم فسادات ہیں تو کہیں شیعہ سنی کے جھگڑے۔ اپنے ہی ہاتھوں اپنے گلے کٹ رہے ہیں۔ اقبال جیسا قومی شاعر اس حالت سے جس قدر بھی متاثر ہوتا کم تھا۔

مرنے والا مر جاتا ہے لیکن اس کی باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ اب کی دفعہ جو "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" گنگناؤ گے تو تمہاری آواز ضرور بھرا جائے گی۔ لکھنے والے کی تصویر آنکھوں میں پھرنے لگے گی۔ سوچو گے کہ وہی شخص جس نے کل اپنی مردہ قوم کو زندہ کرنے کی ٹھانی تھی آج خود مردہ ہے۔ "موت سے کسی کو چھٹکارا نہیں"۔ یہ نہ سمجھنا کہ جتنے بڑے آدمی ہوتے ہیں وہ کبھی تم جیسے ...... نہ رہے ہوں گے۔ اقبال بھی اپنے زمانے میں ایک دبلے پتلے لڑکے تھے۔ روزانہ مدرسہ جایا کرتے تھے۔ شرارت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مدرسہ دیر سے پہنچے استاد نے پوچھا "تم اکثر دیر سے آیا کرتے ہو" اقبال نے جواب دیا "جی ہاں اقبال دیر ہی سے آیا کرتا ہے"۔ بڑے ذہین اور ہونہار طالب علم تھے سارے استاد ان کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور وہ خود اپنے والدین سے زیادہ ان کی تعظیم کرتے تھے۔ ایک انگریز استاد سے ان کو اتنی محبت ہوگئی تھی کہ اس سے ملنے کے لئے انگلینڈ گئے۔ وہاں ان کی آنکھیں کھلیں۔ مغرب اور مشرق کا مقابلہ کیا۔ دیکھا کہ زمین و آسمان کا فرق ہے۔ واپس آئے تو ایک قومی شاعر بن گئے۔ قوم کی اس خراب حالت پر اشعار لکھنے شروع کئے۔ ان کی شاعری ایک آئینہ تھی جس میں قوم نے اپنے مکروہ چہرے کا عکس دیکھا۔ ترقی کے لئے ہاتھ پاؤں مارے ...... اور بگڑی حالت درست ہو چلی تھی۔ اور درست ہو جاتی۔

اقبال کو بچوں سے کتنی محبت تھی۔ اس کا اندازہ تمہیں ان کی کتابیں پڑھنے سے ہوگا۔ جاوید نامہ انھوں نے اپنے بیٹے کے نام پر ہی لکھا۔ "بانگ درا" میں بچوں کے لئے کئی نظمیں ہیں۔ "ایک پہاڑ اور گلہری" "مکڑا اور مکھی" "بچہ اور شمع" میں انھوں نے بچوں کی فطرت پر روشنی ڈالی ہے۔ بچہ کتنا نا سمجھ اور بھولا ہوتا ہے۔ دوست، دشمن میں تمیز نہیں کر سکتا۔ تم تو خیر اب اس درجہ سے گذر چکے ہو۔ تم میں برے بھلے کی تمیز ہے۔ دوست دشمن کی پہچان ہے۔ تم میں نہ معلوم کتنے ایسے ہیں جو آگے چل کر بڑے بڑے آدمی بنیں گے۔ اقبال یا اور کوئی۔ اقبال جس وقت بھولے تھے ان کے دل میں شاید یہ آرزو تھی کہ "زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری" اور "ہر طرف میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے"۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سچے دل سے نکلی ہوئی دعا اللہ کے ہاں قبول ہو کے رہی۔ اقبال جب تک زندہ رہا، شمع محفل بنا رہا۔ محفل کو اپنی روشنی سے منور کرتا رہا۔ پروانوں کو محبت اور ایثار کا سبق سکھاتا رہا۔ اور آخر ...... یہ شمع بجھ گئی۔ ساری محفل میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ اندھیری راتوں میں بجلی چمکتی ہے ...... روشنی ہوتی ہے اور پھر وہی تاریکی۔ لیکن اس ایک سے بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں۔ بھٹکے ہوئے راہ سے لگ جاتے ہیں۔

اقبال نے بچھڑوں کو ملانے کی کوشش کی۔ بھٹکوں کو راہ پر لگانا چاہا۔ ایک نیا شوالہ بنایا۔ ایک نیا راستہ بتایا۔ جو سب کو ایک کرنے والا ہے۔

اقبال تم سے کیا چاہتا ہے؟ وہ تم سے ارادہ اور عمل کی توقع رکھتا ہے۔ تمھیں تمھارے بزرگوں کے قصے سناتا ہے۔ تمھاری سوئی ہوئی حمیت کو جگانا چاہتا ہے۔ وطن کی حمیت تم پر فرض گردانتا ہے۔ وطن کی بھلائی کے لئے تمھاری عزیز جانوں کی قربانی چاہتا ہے۔ آپس میں اتفاق کی توقع رکھتا ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ ان سے دوستی رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کی قبر پر پھول نہ چڑھاؤ، فاتحہ نہ دو، آنسو نہ بہاؤ، مگر ان کی ہدایتوں پر عمل کرو۔ اسی ایک چیز سے اس کی روح کو اطمینان اور خوشی ہو سکتی ہے۔ اپنے آپ کو بچہ نہ سمجھو قوم کی ترقی کے ذمہ دار تم بھی ہو۔ اقبال کی باتوں کو مرنے والے کی نشانی سمجھ کر، ایک بڑے آدمی کی بھیک سمجھ کر...... سن لو۔ سمجھ لو...... اور پھر انہیں کے مطابق کام کرو۔ اپنے کمرے میں اقبال کی تصویر آویزاں کرو۔ روزآنہ اسے دیکھتے رہو۔ سمجھ لو کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہونا چاہیئے اور سب سے بہتر "خدمت وطن ہے"۔ اقبال مرا نہیں وہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ قوم کو زندہ کرنے والے مرتے نہیں۔ زیادہ افسوس نہ کرو۔ موت بڑے چھوٹے کو نہیں دیکھتی۔ اور وہ بچے جن کے نام "اقبال" ہیں وہ تو اور بھی سبھی سے کام لیں۔

رشید قریشی

اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی ان کے استاد شمس العلماء مولانا میر حسن صاحب اپنے وقت کے نہایت جید عالم تھے اقبال نے فارسی اور عربی کی تعلیم علامہ موصوف ہی سے حاصل کی مولانا ممدوح اپنے ہونہار طالب علم اقبال سے نہایت محبت و شفقت سے پیش آتے تھے اور زیادہ وقت ان ہی کی تعلیم میں صرف کرتے تھے اقبال نے گھر کی تعلیم کے سوا اسکول کی تعلیم بھی حاصل کی حتیٰ کہ انٹرنس کامیاب کیا اس کے بعد انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں بی، اے کا امتحان دیا چونکہ اقبال کو فلسفۂ اسلام سے بہت لگاؤ تھا اس لئے ان کا ارادہ ہوا کہ مسٹر آرنلڈ کے پاس جو اپنے وقت کے زبردست مستشرق تھے اور اس زمانے میں لاہور کالج میں فلسفۂ اسلام کے پروفیسر تھے تعلیم حاصل کریں صاحب موصوف کو بھی اقبال سے بے حد دلچسپی تھی وہ نہایت دلچسپی سے تعلیم دیا کرتے تھے۔ سر محمد اقبال دو سال کے بعد فلسفہ کے ام اے ہو گئے۔ اقبال کمسن ہی سے شعر کہتے تھے۔ سیالکوٹ کے جلسوں میں نظمیں وغیرہ کئی دفعہ اقبال نے پڑھی تھیں اور اس زمانے میں استاد داغ کی بڑی شہرت تھی اور آپ کی شاعری کا غلغلہ سارے ہندوستان میں بلند تھا اس لئے سر محمد اقبال انہیں سے اصلاح لیا کرتے تھے لیکن اقبال کی بلند پروازی و اعلیٰ خیالات نے ان کے کلام میں وہ پختگی پیدا کر دی کہ بہت جلد جناب داغ نے فرمایا کہ اب اصلاح کی گنجائش نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں اقبال جیسے شاگرد پر جس قدر ناز کروں کم ہے سر محمد اقبال نے ۱۸۹۱ء میں "نالۂ یتیم" کے نام سے ایک ایسی اچھی نظم لکھی کہ اس دل گداز نظم کو پڑھنے کے بعد کونسا ایسا شخص ہے جو آنسو کے چند قطرے نہ بہادے اب یہ نظم کتاب کی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ سر محمد اقبال نے ۳۱ سال کی عمر میں بیرسٹری پاس کی تھے علاوہ فارسی عربی سنسکرت اور یورپ کی زبانوں میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اقبال کے اس ترانے نے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

بچوں، جوانوں، بوڑھوں سب کے دل میں وطنیت کی ایک نئی روح پھونک دی۔ لیکن افسوس اب کہاں ہے وہ اقبال جو اپنے شیریں نغمے دنیا کو سناتا تھا۔ اب کہاں ہے وہ اقبال جو کسی جلسے کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہو کر اپنی سحر آفریں آواز سے دنیا کو محبت و الفت کا سبق پڑھاتا تھا۔ سچ ہے۔ "کل من علیہا فان"

محمد مسیح الدین خاں (بشیر آباد)

نامور اقبال

"سب رس" کے ننھوں سے جی چاہتا ہے کہ اچھی اچھی باتیں کروں۔ کیا کسی اچھے کھیل کی نسبت کچھ لکھوں؟ نہیں یہ بھی کچھ ایسا موزوں نہیں معلوم ہوتا۔ اب سمجھ میں آیا آج "سب رس" کے ننھوں کو ایک ایسے شخص کا حال سناؤں گی جس کو پڑھ کر یقین ہے تم بےحد خوش ہوگے۔ اچھے بچے اچھے آدمیوں کے حالات سن کر اچھے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب اچھے بن جاتے ہیں تو لوگ بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔ پھر وہ دنیا میں مشہور ہو جاتے ہیں۔ اچھا اب ذرا کان دھر کر سنو کہ وہ شخص کون تھا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ "وہ نامور شخص ڈاکٹر سر محمد اقبال ہیں یہ ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اقبال اپنے بچپن میں بڑے پیارے بچے تھے۔ خوب جی لگا کر سبق یاد کرتے۔ محنت کرنے جس کا صلہ انہیں یہ ملا کہ وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول رہتے۔ اس سے اُن کے استاد بھی سمجھنے لگے تھے کہ یہ بچہ ضرور بڑا ہو کر نام پیدا کرے گا۔ اور ساری دنیا میں مشہور ہو جائے گا۔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے اقبال لاہور چلے گئے۔ اور وہاں کے کالج سے ایم اے کامیاب کیا۔ اور اورینٹل کالج میں فارسی کے پروفیسر بھی بن گئے۔ کچھ دنوں بعد گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ لیکن انہیں علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا اسی لئے ۱۹۰۵ء میں عمر کے ائیسویں سال وہ قانون اور فلسفہ پڑھنے کے لئے کیمبرج یونیورسٹی گئے۔ اور تیسرے سال فلسفہ کی ڈگری بی اے اور بیرسٹری کا امتحان کامیاب کیا پھر جرمنی چلے گئے۔

"فلسفہ ایران" جرمنی میں لکھی۔ اور میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں لاہور واپس آئے اور وکالت شروع کر دی۔ اقبال کو شعر کہنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنے کالج کے زمانے ہی میں شعر کہا کرتے تھے۔ انھوں نے تم جیسے ننھوں کے لئے بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ تم کو اقبال کی کتاب "بانگِ درا" ضرور پڑھنی چاہئے۔ اس میں بچوں کے لئے بہت سی مفید چیزیں ہیں۔

ہاں! تو جب انگلستان سے واپس آئے تھے تو اسی زمانے میں بلقان طرابلس وغیرہ میں لڑائیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ یورپین قومیں عربوں اور ترک مسلمانوں پر بہت ظلم کر رہی تھیں۔ اور ان کو غلام بنا لیا تھا۔ اس سانحہ پر اقبال چونک پڑے۔ اور چونکہ ان کے دل میں قوم کا درد تھا۔ اسی لئے انھوں نے ایسی نظمیں کہنی شروع کیں جن کو پڑھ کر مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا وقار اور شان و شوکت یاد آگئی۔ ان نظموں کا اتنا اثر ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی فلاح کے لئے بہترین کوشش شروع کی۔ ہندوستانیوں کے آئے دن کے نفاق کو دیکھ کر انھوں نے بہت سی نظمیں لکھی ہیں جن میں "نیا شوالہ" اور "ہندوستاں ہمارا" بہت مشہور ہیں اور ان کو درسی کتابوں میں داخل کر دیا گیا ہے جب تم خوب کوشش کر کے بڑی جماعتوں میں آؤگے تب تم کو معلوم ہوگا کہ اقبال نے تمھارے لئے کیا کیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں اقبال کو پنجاب کونسل کا ممبر بنایا گیا۔ اور مسلم لیگ کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ ہندوستانیوں کی جانب سے گول میز کانفرنس میں نمائندگی کی۔ ان کی سب تقریریں کتابی صورت میں محفوظ ہیں۔ اسی سال ہماری ریاست میں "یوم اقبال" بھی منایا گیا تھا۔ اور اقبال کو عثمانیہ یونیورسٹی کی جانب سے ڈی لٹ کی ڈگری دی گئی تھی ۔۔۔ ان کا ارادہ حجاز جانے کا تھا۔ لیکن ۱۲ اپریل کو وہ اس ارادہ کو ساتھ لئے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہو گئے۔ اور لاہور کی جامع مسجد میں دفن ہوئے۔

سعیدہ منظہر (کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ)

دوستوں کا مکالمہ

انور:- بھئی سراج آج مجھے کچھ بے کلی سی محسوس ہو رہی ہے۔ دل بھی اداس معلوم ہوتا ہے طبیعت پریشان سی ہے۔ اور مشرق کا چہرا اترا ہوا۔ ہر دو کے چہرہ پر موت سی مردنی نظر آتی ہے۔

سراج:- ہاں آج ہر طرف ایک قسم کی اداسی ہی اداسی چھائی ہوئی ہے۔ اخبارات کے کالم بھی دردناک خبروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ اکثر کالم سیاہ حاشیہ لئے ہوئے ہیں۔ لیکن مجھے اس کا موقعہ نہ ملا کہ میں ان خبروں کو پڑھ سکوں۔

استد:- خوب آپ لوگوں کو اس وقت تک معلوم ہی نہیں ایک نے تو اخبار دیکھا ہی نہیں دوسرے نے صرف سیاہ حاشیہ ہی پر نظر ڈالی۔ مشرق نے ایک زبردست چیز کھو دی اور اپنے اس عظیم ترین نقصان پہ آنسو بہا رہا ہے لیکن آپ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں۔ آج کا دن مشرق کی تاریخ میں نہایت منحوس ہے جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ آج مشرق کا اقبال ختم ہو گیا۔

انور:- کیا آج مشرق کا اقبال ختم ہو گیا! اب مشرق کو زوال آ جائیگا کیا اب مشرق پھر دوبارہ اقبال نہیں پا سکتا؟

سراج:- پھر تو ہندوستان اور مشرق کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس کے اقبال کی شمع حیات ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی اور دربار مشرق کو تاریک کر گئی افسوس وہ شمع گل ہو گئی جس کی ہر شعاع ہند کے ظلمات کو نور بخش رہی تھی۔ جو خودی نا آشنا پروانے کو شمع خودی کا پروانہ بنا رہی تھی اب تو ہم کو مجبوراً یہی کہنا پڑیگا۔

آج لیکن ہم نوا سارا چمن ماتم میں ہے — شمع روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

استد:- نہ صرف آج بلکہ ہمیشہ دنیا اقبال پر خون کے آنسو بہاتی رہے گی۔ مشرق اپنے اس ناقابل تلافی نقصان پر جس قدر کفِ افسوس ملے کم ہے۔ مشرق کا یہ وہ اقبال مند فرزند تھا جس نے نہ صرف مشرق کو بلکہ پوری دنیا کو اپنی قابلیت اور دماغی کاوشوں کے ذریعہ سے اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ دنیا اس کو ایک بہت بڑا مفکر اور نوع انسان کا پیغامبر مانتی تھی۔ اس نے اپنی ادبی اور فلسفیانہ خدمات اور قلمی کاوشوں کے ذریعہ سے مشرق کی موجودہ نسل کی ذہنیت کو متاثر کیا۔

انور:- نہ صرف یہ بلکہ اقبال نے ہمارے اسلاف کی عظمت ماضی کے ترانے دنیا کو سنائے ہم کو واقعات پارینہ کے راگ شیریں لے میں سنا کر دنیا میں زندوں کی طرح جینے کا گر سکھایا۔ اس نے مغرب کی زہریلی اذان کی صدا دی۔ "رموز بے خودی" اور "اسرار خودی" کے ذریعہ سے دلوں میں آزادی کی روح پھونک دی اور خودی کا درس سکھلایا۔

سراج:- نہ صرف یہ بلکہ مردہ قوموں میں زندگی کی ایک لہر دوڑا دی۔ پست ہمت اور بزدلوں کی ہمت بڑھائی۔ ان میں جوش، اور ولولہ پیدا کیا اور وطن سے غافل رہنے والوں کو یہ آواز بلند کہا ہے

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

استد:- تم اس شعر پر کیا زور دے رہے ہو۔ اس کا ہر شعر اپنے اندر حقائق لیے ہوا ہوتا ہے اس کے قلم سے نکلنے والا ہر نقطہ کسی نہ کسی خاص خوبی کا حامل نظر آتا ہے اس کی قلمی کاوشیں قیامت تک صفحۂ ہستی سے مٹائی نہیں جا سکتیں اس کا کلام دنیا والوں کو رہتی دنیا تک پیغام عمل دیتا رہے گا۔ وہ جو تعلیم دے گیا ہے اس کو دنیا والے ہرگز ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔ خصوصاً میرے دل سے یہ اشعار کبھی نہیں بھلائے جا سکتے۔

علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت — پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

مری آنکھیں وحدت میں کثرت کا نظارہ — کہ خود عاشق ہوں خود معشوق ہوں خود ...

یہی انداز ہے ... — اسی پیمانہ ... ہیں رمز ہستی کو

میر کارواں ... — دل اپنا ...

انور:- کیا کہنے اقبال کی ہر ادا میں ایک رمز پوشیدہ ہے۔ اس کی ہر آواز نغمۂ وحدت ہے۔ اس کا ہر شعر ایک زبردست درس کا حامل ہے اور

سب رس

نہ صرف مشرق بلکہ تمام دنیا کو اسلام کی حقیقی عظمت سے واقف کرایا۔ خودی کے فلسفہ میں کھو کر دنیا کو اسرارِ زندگی کے حقائق سے روشناس کرایا اور خودی سے آگاہ کر کے انسانیت اور فلسفۂ حیات کی تشریح کر دی ہے

نمود تیری، نمود اس کی، نمود اس کی، نمود تیری
خدا کو تو بے نقاب کر دے، خدا تجھے بے نقاب کر دے

سراج :- دوست واقعہ تو یہ ہے کہ ہم اس کے کلام کی خوبیاں بیان نہیں کر سکتے وہ بظاہر انسان تھا لیکن اس کے صفات فرشتوں کے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کے کلام ہی پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ اس کے کلام میں کیا کیا خصوصیات موجود ہیں سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑتی ہے وہ قومیت کا عنصر ہے۔ حقیقت، درد، بصیرت، تاثیر، جوشِ عمل، ماضی کی سچی تصویر، احساسات، رجائیت، رنگینی، رازِ انسانیت، وطن پرستی، سلاست، پیامِ زندگی، روحانیت، فرض شناسی، شکوہ، فلسفۂ حیات، بیباکی، بلند پروازی، اسلامیت، اقبال کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

اسعد :- حقیقت میں اقبال نے دنیا والوں کے دلوں پر وہ گہرے نقش چھوڑے ہیں کہ جو مٹ نہیں سکتے بلکہ ہمیشہ ابھرتے ہی رہیں گے اس کا کلام بنی نوعِ انسان کے حق میں ہمیشہ شمعِ ہدایت کا کام کرتا رہے گا اور یہی وہ چیز ہے جس سے انسان کو بقائے جاوداں حاصل ہوتی ہے۔

انور :- ٹھیک ہے ایسے ترجمانِ حقیقت، علمبردارِ آزادی، مفکرِ اعظم کا ہر اسلام کو دنیا کیسے بھلا سکتی ہے۔ جس کی عالمگیر شہرت کی یہ حالت ہو کہ مسلمان اور ہندو اقبال کو ہندوستان کی آزادی کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ ہر قوم و ملت کا فرد اس کا دل سے احترام کرتا ہے۔

سراج :- میرا جی تو یہی کہتا ہے کہ جس نے ہندوستانی نوجوانوں کی ذہنیت میں انقلابِ عظیم برپا کر دیا ہو۔ جس کا دائرۂ وطنیت جغرافی حدود سے باہر ہو۔ جس کو دنیا ایک بڑا فلسفی، نبی ہو۔ جس کی سیاست کا دنیا پر سکہ جما ہوا ہو۔ وہ کیسے بھلایا جا سکتا۔

مرزا عثمان بیگ

متعلم ففتھ فارم سٹی کالج

بچے کی دُعا

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

دُور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے!
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے!

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب!
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت، یارب!

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا!

مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

(اقبال)

محسنِ قوم اقبالؔ

بچہ:— میری امی جاں مجھ سے کہیے ذرا
یہ تھا کون اقبالؔ جو مر گیا

یہی ذکر ہر صبح ہر شام ہے
جدھر دیکھو اقبال کا نام ہے

بہت یوں تو مرتے ہیں دنیا میں لوگ
نہیں ہوتا لیکن کسی کا یہ سوگ

خبر پڑھ کے اخبار میں موت کی
لگی رونے اُس روز تھیں آپ بھی

ہر اک اس کے مرنے سے بےتاب ہے
میں حیراں ہوں امی یہ کیا بات ہے

ماںؔ:— مری جان تھا وہ بڑا آدمی
تڑپ قوم کی اس کے سینے میں تھی

نہ رو دل میں کس طرح اس پر بھلا
وہ محسن تھا پیارے مری قوم کا

بہت اس نے ہم پر کئے ہیں کرم
جنہیں یاد کر کے روتے ہیں ہم

یہ تعلیم دی ہم کو اسلام نے
ادا کر دو احسان احسان سے

تِری قوم کا میرے نورِ نظر
ہے خم مرنے والے کے احساں سے سر

ادا اُس کے احساں ہوں گے کہاں
مگر یاد رکھے گا اِن کو جہاں

اسی سے زمانے میں بس نام ہے
بڑی چیز انسان کا کام ہے

بڑا کام اُس نے کیا قوم کا
جو چاہو کہ احساں ہو اس کا ادا

مگر اس کی لے لو مرے لال تم
بڑے ہو کے بن جاؤ اقبال تم

لطیف النساء بیگم

حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی؟

پیارے بچو! تم نے حضرت اقبال کا نام سنا ہوگا ان کی کوئی نہ کوئی نظم کہیں نہ کہیں پڑھی یا سنی ہوگی۔ آپ ہندوستان کے سب سے بڑے قومی شاعر تھے۔ آپ نے سوتوں کو جگایا اور ان میں زندگی کی روح پھونکی آپ کی شہرت مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس ہے کہ بے رحم موت نے آپ کو ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا۔ اگرچہ آپ ہم سے جدا ہو چکے مگر آپ کا کلام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور زندگی کے جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتا رہے گا۔ آج ہم تمھیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی ہے؟ اس میں شک نہیں کہ حضرت اقبال کے کلام کا زیادہ حصہ جوانوں اور بڈھوں کے لئے ہے۔ مگر آپ نے بچوں کی بھی کافی خدمت کی ہے۔ کیونکہ یہ ناممکن تھا کہ آپ اپنی قوم کی اُٹھتی ہوئی پود کو بھول جاتے۔ یوں تو ہندوستان کے دوسرے بڑے شاعروں نظیر اکبر آبادی حالی پانی پتی آزاد دہلوی اور افسر میرٹھی حیدر آبادی نے بھی بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں۔ مگر حضرت اقبال کی بچوں کے لئے لکھی ہوئی نظمیں خاص ہیں۔ اس کے سوا حضرت اقبال نے بچوں کے لئے نظمیں لکھکر ہندوستان کے شاعروں کو دکھایا ہے کہ بچوں کے لئے کس قسم کی نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ بچوں کے لئے کچھ لکھنا آسان کام نہیں ہے۔ وہی لوگ بچوں کے لئے کچھ لکھ سکتے ہیں جو بچوں کی فطرت کو جانتے ہوں اور جن کی مشق پکی ہو۔

حضرت اقبال نے بچوں کے لئے یہ نظمیں لکھی ہیں۔ (۱) بچے کی دعا (۲) ہمدردی (۳) ماں کا خواب (۴) پرندے کی فریاد (۵) ایک مکڑا اور مکھی (۶) ایک گائے اور بکری (۷) ایک پہاڑ اور گلہری (۸) ہندوستان ہمارا (۹) میرا وطن وہی ہے۔ ان نظموں میں صرف پہلی نظم دعا کے طور پر لکھی ہے کچھ نظمیں عام رنگ میں اور اکثر نظمیں قصے کے پیرایے میں ہی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بچوں کو قصوں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اور مثال کے بعد نتیجہ نکال لینے میں آسانی معلوم ہوتی ہے جو شاعر قدرت کا یہ راز نہیں جانتے وہ نتیجہ پہلے بیان کرتے ہیں اس کے بعد مثال پیش کرتے ہیں۔

پیارے بچو! ہم تمھیں سب سے پہلے بچے کی دعا سناتے ہیں۔ اس نظم میں ایک بچہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ وہ علم کی شمع کا پروانہ بن جائے۔ اس دھن میں وہ شمع کی مانند پگھلے تاکہ دنیا کی جہالت کا اندھیرا اس کے ذریعہ دور ہو کر ہر طرف علم کی روشنی پھیل جائے۔ وہ اپنے وطن کے لئے رونق ہو۔ اس کی زندگی کا مقصد غریبوں، کمزوروں اور دکھیوں کی مدد کرنا ہو۔ خدا اسے برائی سے بچائے اور نیک راہ پر چلائے۔ بے شک یہ نظم رات دن وظیفے کے طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ اس لئے آج ہی تم اسے زبانی یاد کر لو۔ اصل نظم یہ ہے:-

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو مری پروانے کی صورت یا رب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

مرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

پیارے بچو! نظم کئے ہوئے قصے نثر یعنی عام بول چال میں لکھے ہوئے قصوں سے زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ اس لئے

حضرت اقبال نے چند قصے نظم بھی کیے ہیں۔ یہ نظم کیے ہوئے قصے بہت دلچسپ اور نصیحت سے بھرے ہوئے ہیں۔ زبان میٹھی اور بہت آسان ہے۔ بیان کا طرز سیدھا سادہ۔ قصے کے جزوں کو ملا کر موتی کی لڑی بنا دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے آنکھوں دیکھی بات لکھی ہے۔ بیان کی طاقت سے لفظی تصویریں بنا دی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظمیں بولتی چالتی تصویریں ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر ایک دو قصے بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلے مکڑے اور مکھی کی کہانی سن لو۔ کہتے ہیں کہ ایک مکڑا کئی دن سے بھوکا تھا۔ ایک دن جب کہ وہ اپنے جالے میں بیٹھا ہوا تھا ادھر سے ایک مکھی کا گزر ہوا۔ مکڑے نے مکھی کو اپنے جھونپڑے سے کمرے میں آنے کی دعوت دی۔ مکھی نے جواب دیا "جو کوئی تمھارے گھر میں قدم رکھتا ہے پھر وہ باہر نکلنے نہیں پاتا۔ میں ناداں نہیں جو تمھارے دھوکے میں آؤں۔" مکڑے نے جواب دیا "میرا گھر اگرچہ باہر سے چھوٹا سا نظر آتا ہے۔ مگر اس کا اندرونی حصہ بہت سجا سجایا ہے۔ دیواروں پر آئینے لگے ہوئے ہیں دروازوں پر پردے پڑے ہیں۔ مہمانوں کے آرام کے لیے بستر بچھائے ہیں اور آرام کے دوسرے سامان بھی مہیا کیے ہیں۔ ایسی آرام کی چیزیں تمھیں دوسری جگہ نہ ملیں گی۔" مکھی نے کہا "آپ سچ کہتے ہیں۔ مگر میں آپ کے گھر نہ آئی ہوں نہ آؤں گی۔ کیوں کہ جو کوئی آپ کے نرم بستر پر سوتا ہے وہ پھر کبھی نہیں جاگتا۔" جب مکڑے نے دیکھا کہ لالچ دینے سے کام نہیں بنتا ہے تو اس نے خوشامد کرنی شروع کی۔ کیوں کہ دنیا میں خوشامد ہی سے کام بنتے ہیں۔ اس لیے اس نے کہا "جو کوئی آپ کی صورت ایک بار دیکھ لیتا ہے اس کو آپ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ کی آنکھیں ہیرے کی کنیوں کی طرح جگمگاتی ہیں۔ سر پر کلغی ہے پھر آپ کا حسن لباس خوبی اور صفائی تو بہت ہی اچھی ہے۔ اور سب سے زیادہ آپ کا اڑتے ہوئے گانا سب کو بھاتا ہے۔" مکڑے کی اتنی میٹھی چپڑی باتوں نے مکھی کا دل موہ لیا۔ وہ پسیجی اور بولی "انکار کرنا اور کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں۔" یہ کہہ کر مکڑے کے قریب گئی۔ مکڑے نے کود کر اسے پکڑ لیا۔ اور بے فکری سے گھر بیٹھے ہوئے اسے چٹ کر گیا۔

اس قصے کا حاصل (Moral) یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ غرض والوں کی خوشامد پر نہ پسیجے۔

اب گائے اور بکری کا قصہ سنو۔ ایک ہری بھری چراگاہ تھی۔ جس میں ہر طرف صاف پانی کی ندیاں بہتی تھیں۔ انار اور پیپل کے کئی ایک سایہ دار درخت تھے۔ چڑیوں کا جھمگھٹا! ٹھنڈی ہوا کا چلنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں ایک بکری آنکلی اس کی نظر ایک گائے پر پڑی۔ بکری نے گائے کو سلام کر کے کہا "بڑی بی! مزاج کیسے ہیں؟" گائے نے کہا "بڑی مصیبت میں جان ہے۔ بری تلخی زندگی گزار رہی ہوں۔ میری قسمت ہی بری ہے۔ انسان سے کام پڑا ہے۔ اس نے نت نئی چالوں سے مجھے اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اگرچہ میں اسے دودھ پلاتی ہوں۔ اس کے بچوں کو پالتی ہوں۔ مگر جب کبھی دودھ کم دیتی ہوں۔ تو وہ میری شکایت کرتا ہے۔ اور جب دبلی ہو جاتی ہوں تو بیچ کھاتا ہے۔ اس طرح نیکی کے بدلے بدی سے پیش آتا ہے۔" بکری نے گائے کی رام کہانی کو سن کر کہا "مجھے معاف کیجیے۔ میں کھری کھری سناتی ہوں۔ کہیں آپ بے مزہ نہ ہو جائیں۔ خدا لگتی بات کڑوی لگتی ہے۔ آپ کو یہ چراگاہ، سہانی گھاس، سایہ دار درخت، خوشیاں، بے فکریاں اور آرام سب کچھ انسان کا دیا ہوا ہے۔ اس کے مقابلے میں جنگلوں میں دشمن کا ہر وقت خوف لگا رہتا ہے۔ اس لیے ہمیں گلہ نہ کرنا چاہیے۔ اور آرام کی قدر کرنی چاہیے۔" یہ جواب سن کر گائے شرما کر بولی "بی بکری! اگرچہ تم چھوٹی ہو۔ مگر تمھاری باتیں دل کو لگتی ہیں۔" اس کہانی کا حاصل یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ احسان کی قدر کرے۔

پیارے بچو! تم نے ابھی ابھی جو دو قصے پڑھے ان میں اشعار کو بول چال میں ادا کیا گیا تھا۔ اب ایک نظم کی ہوئی کہانی حضرت اقبال کی زبانی پڑھ لو۔ کہانی کا عنوان ہے "ہمدردی"

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اڑنے چگنے میں دن گزارا

پہنچوں کس طرح آشیاں تک   ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا   سن کر بلبل کی آہ و زاری   جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے   کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا   کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری   میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل   چمکا کے مجھے دیا بنایا   ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے   آتے ہیں جو کام دوسروں کے

پیارے بچو! تم نے حضرت اقبال کی ان نظموں کو حال میں پڑھ لیا جو انھوں نے تمھارے لئے لکھی ہیں۔ ان میں شہد کی مٹھاس، پھول کا بانکپن، دھنک کی رنگینی، چاند کی خوبصورتی، اور دریا کی روانی موجود ہے۔ ان کے پڑھنے سے طبیعت میں تازگی اور دل کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ دماغ سے سوچنے اور ہاتھ پاؤں کو کام میں لگا رکھنے کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ یہ نظمیں وقت کی قدر کرنے، وطن دوست اپنے پرائے سے محبت اور ہمدردی کرنے، برائی سے بچنے، نیک راستے پر چلنے، خوشامد سے بچنے، احسان ماننے اور شریفانہ عادتیں ڈالنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ تم ان نظموں کا شوق سے مطالعہ کرتے رہو گے۔

محمد عبدالسلام ذکی ایم اے، بی ٹی (عثمانیہ)

سر محمد اقبال ۔ [illegible]

سر محمد اقبال مشرق کے بہت بڑے شاعر اور اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے۔ ان کی اچانک موت سے ہندوستان کو بہت بڑا نقصان پہنچا۔

سر محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کو بچپن ہی سے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ مشن کالج سیالکوٹ سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ، بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔

۱۹۰۵ء میں وہ لندن تشریف لے گئے اور وہاں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اقبال کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ آپ نے "نالۂ یتیم" "فلسفۂ ایران" اور دوسری پرجوش نظمیں لکھیں۔ ۱۹۲۴ء میں آپ نے اپنی غزلوں اور نظموں کے مجموعہ کو "بانگ درا" کے نام سے شائع کیا۔ ۱۹۳۵ء میں "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے نام سے دو مجموعے شائع کئے۔

سر اقبال نے اپنی وفات سے قبل یہ رباعی کہی تھی۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید   نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سرآمد روزگارِ ایں فقیرے   دگر دانائے راز آید کہ ناید

سر اقبال مرتے دم تک بھی تصنیف کے کام میں مصروف تھے۔ اسی سے ان کا علمی شوق ظاہر ہوتا ہے اور چند لمحے پہلے آپ نے فرمایا تھا۔ "میں مسلمان ہوں موت سے نہیں ڈرتا اور خوشی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں" سر اقبال کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔ دنیا میں بعض ایسی ہستیاں ہیں جو روئے زمین سے بالکل نیست و نابود ہو چکی ہیں لیکن ان کا نام اب تک زندہ ہے۔ بڑے لوگوں کی سوانح سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم بھی اپنی زندگی کو باعظمت بنا سکتے ہیں اور رخصت ہوتے ہوئے زمانے کی ریت پر اپنا نقش قدم بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ یہ سب لوگ محنت پسندی ہی کی وجہ سے نامور ہوئے۔ آرام پسندی سے بہت سی قومیں تباہ و تاراج ہو چکی ہیں جن کے نام اس دنیا سے حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔

ابوالحسن

حیاتِ اقبال

سب ننھے بھائیو! تم نے یہ خبر سنی ہوگی کہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر اور فلسفی ڈاکٹر سر محمد اقبال کا بمقام لاہور انتقال ہوگیا۔ سر محمد اقبال ہندوستان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کی وفات ہندوستان کے لئے بہت بڑا نقصان ہے۔ انھوں نے بچوں کے لئے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں بہت دلچسپ ہیں۔ ہم ان کی زندگی کے کچھ حالات سپردِ قلم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال ۱۸۷۶ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ (سیالکوٹ پنجاب کا ایک ضلع ہے) ان کا خاندان ہندو تھا۔ لیکن بعد میں مسلمان ہوگیا۔ ان کا نام اقبال رکھا گیا۔ یہ نام ان کو ایسا راس آیا کہ ہندوستان کے لئے اقبال ہو کر رہے۔ جس کی موت کے سبب آج ہندوستان سوگوار ہے۔ اردو اور فارسی ادب خون کے آنسو بہا رہا ہے۔

جب ان کی عمر پڑھائی کے قابل ہوئی تو مقامی مشن اسکول میں شریک کر دیے گئے۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت میں اول آتے۔ اور اساتذہ بھی ان کی دل جوئی کرتے رہتے تھے۔ جب انھوں نے وسطانی درجے کی تعلیم ختم کی تو ہائی اسکول میں شریک کر دیا گیا۔ اقبال اپنے مدرسہ میں مشہور تھے۔ اور اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے وظیفہ پاتے رہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال بچپن ہی سے حاضر جواب اور بیدار مغز تھے۔ کہتے ہیں کہ جب ایک روز مدرسہ دیر سے پہنچے تو استاد نے کہا اقبال تم ہمیشہ دیر سے آتے ہو۔ انھوں نے فوراً جواب دیا کہ اقبال ہمیشہ دیر سے آتا ہے۔ اقبال نہ صرف پڑھائی میں امتیاز رکھتے تھے۔ بلکہ تقریر میں بھی سب پر سبقت لے جاتے تھے۔ لیکن کبھی فخر نہیں کیا۔ ثانوی تعلیم کے ختم کرنے کے بعد سیالکوٹ کالج میں شریک ہوگئے۔ اقبال اپنی حاضر جوابی کے باعث بہت مشہور تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی جو دوست احباب فرمائش کرتے اس کی تعمیل کرتے۔ ایف اے کامیاب کرنے کے بعد لاہور آئے۔ ان کو فلسفہ اور شاعری سے دلی لگاؤ تھا۔ اتفاق سے آرنلڈ جیسا شفیق استاد ملا۔ کالج کے زمانے میں فلسفیانہ اور نئی طرز کی شاعری کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ ان دنوں پنجاب میں مشاعرے بھی ہوتے تھے اور اقبال ان مشاعروں میں برابر شرکت کرتے۔ ان کی شاعری میں انگریزی خیالات ہوتے تھے۔ دوستوں نے مجبور کر کے ایک مشاعرے میں لاکھڑا کر دیا۔ اور جب سنانے کے لئے تیار ہوگئے تو ترنم میں پڑھنے پر اصرار کیا۔ اقبال ترنم سے بھی واقف تھے اور آواز بھی اچھی تھی۔ انھوں نے اپنی نظم ہمالہ سنائی۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

اس نظم میں انگریزی خیالات تھے۔ اور یہ ایک بالکل نئے طرز میں لکھی گئی تھی۔ اس لئے بہت مقبول ہوئی۔ اس جلسے میں مدیر مخزن بھی موجود تھے جب انھوں نے ان سے نظم طلب کی تو یہ کہہ کر ٹال دیا گیا کہ ابھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ لیکن وہ کب ٹلنے والے تھے۔ نہ صرف اسی نظم کو لیا۔ بلکہ مخزن کے لئے اور نظمیں لکھنے کا وعدہ بھی لیا۔ اور کئی نظمیں رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہیں۔ اقبال انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں بھی اپنی نظمیں پڑھتے تھے۔ اقبال اب وہ اقبال نہ تھے جو کہ پہلے تھے۔ پہلے اپنے دوستوں میں مشہور تھے۔ لیکن بعد میں سارے ہندوستان میں مشہور ہوئے اور ترجمان حقیقت کے لقب سے یاد کئے جانے لگے۔ سفر یورپ کے بعد ان ممالک میں جہاں جہاں کسی نہ کسی طرح ان کا کلام پہنچا۔ ان کی شہرت کے ڈنکے بجنے لگے۔ اقبال نے اردو شاعری کا چولا اتار پھینکا۔ اور ایک نیا لباس پہنا دیا۔ دوسروں نے ان کی تقلید کی۔ اقبال کو حالی، شبلی اور اکبر الہ آبادی جیسی قابل فخر ہستیوں کا ساتھ ملا۔ اقبال نے اپنی چند غزلیات استاد وقت داغ کو دکھاں

خط کے ذریعہ سے بھیج کر اصلاح کر لی۔ کچھ زیادہ یہ سلسلہ جاری نہ رہا لیکن داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان کے شاگردوں میں سے تھے۔

اقبال کی خوش قسمتی سے ایسے استاد ملے کہ اپنے فن کے ماہر تھے اور اقبال کو بھی ماہر بنا کر چھوڑا۔ فارسی کے استاد شمس العلماء سید میر حسن صاحب تھے ان کی وجہ سے اقبال نے فارسی میں کافی قابلیت حاصل کر لی۔ پروفیسر سر ٹامس آرنلڈ اور اقبال میں محبت اس درجہ بڑھی کہ خود اقبال کو انگلستان جانے پر مجبور کیا۔ اقبال نے انگلستان کی جامعہ کیمبرج سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی "اسلامی فلسفہ" پر مقالہ لکھ کر جرمنی سے "پی ایچ۔ ڈی" ہو گئے۔ انگلستان میں "اسلام" پر تقاریر بھی کیں۔ اور اپنے استاد آرنلڈ کے ایام رخصت کے زمانے میں خود ان کی جگہ کام کرتے رہے۔ ہندوستان کے اتنے بڑے آدمی کا انتقال ہندوستان کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اقبال مرتے وقت بھی یہ کہہ کر مر سکے "میں موت سے نہیں ڈرتا مسلمان ہوں اور خندہ پیشانی سے موت کا خیر مقدم کرتا ہوں" شاید ہی اب ایسا بڑا شاعر پیدا ہو۔ آخر میں ہم اقبال سے اس طرح شکوہ کرتے ہیں۔

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
"تو ہمارا شکوہ تجھ سے اور آزادانہ ہے"

اقبال زندہ ہے!

شیخ رحیم الدین

موت و حیات کی عمر نہایت طویل اور دراز ہے۔ ان کا نام سنتے سنتے اور ان واقعات کا مشاہدہ کرتے کرتے انسان اس قدر عادی ہو گیا ہے کہ نہ اس کو موت سے کھٹکا ہوتا ہے اور نہ پیدائش سے کوئی تعجب۔ اگرچہ شروع البتہ اس کا یہ سبب ہو سکتا ہے مرنے والے کے والدین اور متعلقین مستثنیٰ ہیں کیونکہ والدین کو اگر بچے کی پیدائش سے خوشی اور موت سے رنج نہ ہو تو دنیا کا نظام قطعاً درہم برہم ہو جائے گا۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے جن کے جسم پر موت کے نام سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہوں مگر کسی خاص ہستی کی مرگ ناگہانی پر اظہار تاسف و تعزیت کرنے والے کثیر التعداد ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی موت پر ہر کس و ناکس رنج کرتا ہے اور جس طرح بھی ممکن ہو اپنے دلی رنج اور جذبات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے۔ میرے نزدیک شہرت اور اقبال کی دو صورتیں ہیں ایک عارضی اور دوسری دائمی۔ عارضی شہرت کا مالک وہ شخص ہو سکتا ہے جو حقیقی معنوں میں شہرت کا مستحق نہیں ہوتا لیکن شہرت کی ہوس رکھتا ہے اور ناجائز طریقہ سے اس کو حاصل کرتا ہے۔ ایسی شہرت اور ایسا اقبال چند روزہ اور غیر مستقل ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات اس قسم کی نیک نامی بدنامی میں بدل جاتی ہے۔ دائمی شہرت کی صورت یہ ہے کہ یہ نہ صرف زندگی بھر ساتھ دیتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اسی طرح قائم رہتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ شہرت کو مرنے کے بعد عمر جاوداں بخشنے والی یہی شہرت ہوتی ہے۔ ایسی شہرت حاصل کرنے والے کو حرص و ہوس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اپنی قابلیت، لیاقت، محنت اور شفقت سے اس کو اپنا مطیع بنا لیتا ہے اور خود شہرت و اقبال کی دلی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ اس کا ہو رہے اور تا قیامت اس کے قدم چومنے کو اپنی عزت سمجھے۔ یہی ہے وہ شہرت اور "اقبال" جس کے اعلیٰ ممبر ڈاکٹر سر محمد اقبال تھے۔ دراصل حقیقت یہ ہے کہ "اقبال" کی تمنا اور آرزو اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ وہ اقبال کے قدموں پر اس طرح پڑا رہے کہ پھر موت کا پنجۂ آہنی اقبال کو دنیا سے لے جا سکے مگر اقبال کے اقبال کو ہرگز ہرگز نہ مٹا سکے چنانچہ یہی ہوا۔ اقبال کی موت کی خبریں آئیں اور ساتھ ہی تابش غم بھی مگر اقبال نے "اقبال" کی عمر جاودانی کی مسرت انگیز اطلاع پہنچاتے ہوئے یہ ثابت کر دیا کہ نفس "اقبال" کی شہرت حقیقی ہے اور اس پر حرف آنا ناممکنات سے ہے۔ بانگ درا قوم کو زندہ رکھے گی اور بال جبریل، اقبال کی دوسری تصنیفات بھی۔ اقبال کو زندہ رکھنے والی چیزیں اس کے وہ افکار ہیں جو قلم سے نکلے اور فلسفہ بن کر رہ گئے۔ اور وہ اشعار ہیں جو زبان سے نکلے اور نصیحت کا کام دے گئے۔ اور وہ نکات ہیں جو دماغ سے نکلے اور دنیوی گتھیوں کو انسان بنا کر غالب کے قول کی تردید کی "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"۔ یہ سچ ہے کہ ایک عالم کی موت ایک عالم کی موت ہے چنانچہ صرف اقبال نہیں مرا بلکہ ایک فلسفی مر گیا، ایک شاعر اعظم مر گیا، ایک مفکر مر گیا، ایک مصلح کوچ کر گیا، ایک علوم مشرقیات کا ماہر مر گیا، اور ایک معتبر بیان کا صاحب ذوق مر گیا اور ایک ایسا شخص گزر گیا جو ہزاروں جاہلوں کو زندہ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی کہو کہ "اقبال زندہ ہے" اور اقبال کو زندہ رکھنے والی اس کی تصنیفات زندہ ہیں۔ اسی وجہ سے یہ اقوام کو جلانے کے لئے دم عیسیٰ ہیں کہ نہیں میں شک "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" اور "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا" اس شعر کا کہنے والا مر گیا لیکن جو کہہ گیا ہے وہ باقی ہے اور قوم کو باقی رکھنے کے لئے کافی ہے۔

(محبوب الٰہی خاں سحر عثمانیہ میٹرک منگولی)

اقبال

(یہ مضمون پیام برادری کے تعزیتی جلسے منعقدہ فرحت منزل میں پڑھا گیا تھا۔)

کہیں ذکر رہتا ہے اقبال تیرا — فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی

جناب صدر و معزز حاضرین! آج ہم ہندوستان کے ایک بڑے شاعر کا تعزیتی جلسہ کرنے کے لئے اس وقت یہاں جمع ہیں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی — ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی!

مگر ایسے بلند مرتبہ ہندوستانی شہرۂ آفاق شاعر کی موت ملک و قوم کے لئے ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی ناممکن ہے۔ اقبال نہ صرف شاعر تھے بلکہ وہ ایک بڑے فلسفی، انشاپرداز اور رہبر بھی تھے۔ مختصر یہ کہ "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

۱۸۷۳ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے۔ مشن کالج سیالکوٹ میں آپ کی ابتدائی تعلیم میٹرک ہوئی اور گورنمنٹ کالج سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں اور پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی میں علمی ذوق اور فلسفۂ زندگی حاصل کیا۔ اسی زمانے میں اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ فلسفہ کے لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کی تعلیم دینے لگے۔ گورنمنٹ کالج سے وہ یورپ روانہ ہوئے اور وہاں تین سال تک قیام کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ڈگری لے کر جرمنی گئے وہاں کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد لندن میں رہ کر بیرسٹری کا امتحان کامیاب کیا۔ اقبال کی شاعری کا حال جس قدر ہم بڑے بڑوں سے سنتے ہیں یا جس کا ہم کو علم ہے یہ ہے کہ بیسویں صدی سے کچھ قبل اردو کلام کی ابتدا ہوئی۔ یوں تو طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ شعر کہنے لگے تھے۔ اور مشاعروں میں بھی ان کی نظمیں اور غزلیں پڑھی جانے لگیں۔ لیکن ۱۹۰۱ء سے کچھ زمانے پہلے کسی جلسہ میں ان کی نظم "ہمالہ" جب پہلے پہل پڑھی تو لوگ حیران رہ گئے اس میں انگریزی خیالات فارسی بندشیں اور سب سے بڑھ کر وطن پرستی کا رنگ عیاں تھا۔ اس لئے بہت پسند کی گئی اور بے حد مقبول ہوئی اس کے بعد سے رسالہ مخزن میں ان کی ہر ماہ ایک نظم ضرور شائع ہوتی۔ ہر طرف سے فرمائشیں ہونے لگیں۔ اب تو یہ حال تھا کہ ایک نشست میں بے شمار شعر کہے جاتے اور ان کے دوست احباب جو موجود ہوتے لکھتے جاتے۔ طرز ترنم سے خوب واقف تھے جب لے سے اپنا کلام سناتے تو لوگ وجد کرتے اور اکثر دم بخود رہ جاتے۔ ان کی نظمیں سننے کے لئے جلسوں میں ہزاروں کا مجمع ہوتا۔ اقبال کی شاعری کو تین دوروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا ابتدائی زمانہ سے ۱۹۰۵ء تک دوسرا ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اور تیسرا ۱۹۰۸ء سے شروع ہوا۔ جس میں زیادہ تر فارسی کلام کہا کرتے تھے۔ یوں تو اردو میں بھی بہت سی نظمیں کہیں اور نہایت عمدہ لیکن فارسی میں ان کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی یہ تین کتابیں "اسرار خودی" "رموز بے خودی" اور "پیام مشرق" بہت مشہور ہیں۔ ہر ایک کی زبان نہایت آسان اور دلچسپ ہے۔ ان کتابوں کی وجہ سے اور زیادہ تر فارسی شاعری کی وجہ سے ہندوستان سے باہر اور تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی مروج تھی ان کا کلام پہنچا اور بے حد قدر کی گئی۔ اقبال کا اردو کلام بھی کئی مرتبہ شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔ جس میں سے ضرب کلیم، بال جبریل، بانگ درا مشہور کتابیں ہیں۔ بچوں کے لئے بھی انہوں نے کئی نظمیں لکھیں جن سے ہم کو بہت کچھ سبق حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً بچے کی دعا، پہاڑ اور گلہری، مکڑا اور مکھی، گائے اور بکری، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد۔ چونکہ زبان سلیس اور مضمون دلچسپ ہوتا ہے اس لئے بچے شوق سے پڑھتے اور یاد کرتے ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ایسی ہوتی ہے جس سے ہمارے اخلاق و عادات کی اصلاح مقصود ہے۔ اکثر نظمیں ہمارے نصاب کی کتابوں میں آ گئی ہیں۔ قومی ترانے تقریباً ہر گھر اور ہر مدرسہ میں سکھائے جاتے ہیں۔ اکثر اشعار ایسے ہیں جو زبان زد ہو گئے ہیں

لکھے گئے ہیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ دونوں بڑی اور مشہور نظمیں ہیں۔ فطرت نگاری میں بھی اقبال کو کمال حاصل تھا۔ اکثروں نے ان کو "ترجمانِ حقیقت" کے لقب سے یاد کیا ہے۔ کونسا طرز ایسا ہے جس کو اقبال نے اختیار کیا اور اس میں کمال حاصل نہ کیا ہو۔ ان کے چند ظریفانہ اشعار بھی ہم لوگ پڑھتے ہیں۔ بہرحال ہماری زبان عاجز اور ہم قاصر ہیں کہ اقبال کے حالات ان کی خوبیوں کے بیانات، بے مثل شاعری، قومی اصلاح و ہمدردی پر اپنے خیالات کا اظہار مفصل طور پر کر سکیں۔ اس لئے اب اقبال کی ایک نظم کے چند اشعار سنا کر میں اپنی اس مختصر تقریر کو ختم کر کے دوسروں کو عمدہ خیالات کے اظہار کا موقع دیتا ہوں۔

مہر روشن چھپ گیا اٹھی نقاب روئے شام
شانۂ ہستی پہ ہے بکھرا ہوا گیسوئے شام
یہ سیہ پوشی کی تیاری کسی کے غم میں ہے
محفل قدرت مگر خورشید کے ماتم میں ہے
کر رہا ہے آسماں جادو لب گفتار پر
ساحر شب کی نظر ہے دیدۂ بیدار پر
منظر حرماں نصیبی کا تماشائی ہوں میں
ہم نشین خفتگان کنج تنہائی ہوں میں
تھم ذرا بیتابیِ دل! بیٹھ جانے دے مجھے
اور اس بستی پہ چار آنسو گرانے دے مجھے
اے مے غفلت کے سرمستو کہاں رہتے ہو تم
کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی؟
اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی؟
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا؟
اس ولایت میں بھی ہے انساں کا دل مجبور کیا؟
اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے
علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے؟
دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی؟
"لن ترانی" کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی؟
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا؟
واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا؟
آہ وہ کشور بھی تاریکی سے کیا معمور ہے؟
یا محبت کی تجلی سے سراپا نور ہے؟
تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

آہ سر اقبال

معین الدین احمد انصاری

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کا دن ہمارے لئے نہایت ہی منحوس تھا کیونکہ اس دن ہماری قوم کے ایک بڑے رہبر نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ سر اقبال کی اچانک موت سے قوم کو نقصان عظیم پہنچا جس کا بدل نہ ہو سکے گا۔ سر اقبال جیسی ہستیاں دنیا میں بہت کم ہوتی ہیں۔ آہ موت کے ایک اچانک جھونکے نے اقبال کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ کاش سر اقبال کچھ دن اور جی جاتے۔ سب ہی بھائیوں اور بہنوں کی آگاہی کے لئے چند اور مختصر حالات پیش کرتا ہوں۔ آپ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا خاندان کشمیر سے سیالکوٹ میں آیا ہوا تھا۔ ابتداء میں سیالکوٹ ہی میں تعلیم پاتے رہے بعد کالج کی تعلیم لاہور میں ہوئی۔ کچھ دن بعد ان کے خیالات نے یورپ جانے کا انتظام کیا۔ وہاں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ قومی شاعری میں اپنے دور کے کمال شاعر تھے۔ خیالات کی بلندی اور فلسفہ حیات اقبال کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ شکوہ اور جواب شکوہ خصوصیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اقبال کی اردو شاعری کو کچھ زیادہ عالمانہ ان کی فارسی شاعری ہے جو فارسی شاعری میں فلسفہ اسلام کو پیش کیا ہے۔ گزشتہ دنوں تک بھی اقبال موجود تھے اور قوم کے بڑے رہبروں میں سے سمجھے جاتے تھے۔ "بانگ درا" "بال جبریل" "جاوید نامہ" "ضرب کلیم" "اسرار خودی" "رموز بیخودی" "پیام مشرق" آپکی بہترین تصانیف سمجھی جاتی ہیں۔

محمد [illegible]

کھویا ہوا شاعر

سب بزم کے بھائیو اور بہنو! آؤ ہم آپ کو ہندوستان کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال کے کچھ حالات سنائیں۔ شیخ محمد اقبال نام اور اقبال تخلص تھا۔ آپ کے آباؤ اجداد کشمیری نسل سے تھے۔ آپ ۱۸۷۳ء میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مروجہ حاصل کرنے کے بعد ایک شفیق فاضل سید میر حسن سے فارسی کا صحیح ذوق حاصل کیا۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور تشریف لائے۔ اور فلسفہ کی جس سے ان کو طبعی مناسبت تھی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ اور انتہائی ڈگریاں اعزاز کے ساتھ پنجاب یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ سلیم الطبع اور ہر دل عزیز واقع ہوئے تھے۔ اور عام اور خاص جلسوں میں جب انھوں نے اپنا اردو کلام سنایا تو ایک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ اسی دور میں ایک مشہور مستشرق مسٹر آرنلڈ نے اس جوہر کو اُن کے کمالات سے آگاہ کیا۔ ان کے مہربان بھائی نے یورپ میں پڑھنے کے لئے انتظام کر دیا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اور فلسفہ کے استاد ڈاکٹر "میکٹا گارٹ" اور "سورے" جیسے ماہر فلسفہ کے شاگرد رشید ہو گئے اور وہاں ذہنی تربیت حاصل کی۔ بعد ازاں جرمنی کی ایک یونیورسٹی "میونک" میں داخل ہوئے اور وہاں علوم اسلامیہ اور فلسفہ کے عمیق مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ اور ایک رسالہ "ایران میں الٰہیات کا ارتقا" کے موضوع پر لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ممتاز ڈگری حاصل کی۔ جرمنی کے فلسفہ جدید اور مسلمان صوفیہ کے کلام سے مستفید ہوئے۔ ان کی طبیعت فارسی زبان کی طرف زیادہ مائل تھی۔ انھوں نے تہذیب مشرق و مغرب کا مقابلہ کیا اور یورپ سے واپس آنے کے بعد کئی کتابیں لکھیں۔ (۱) پیامِ مشرق (جرمنی شاعر گوئٹے کا جواب) (۲) اسرارِ خودی (اقبال کی مشہور مثنوی فارسی جو مولانا روم کی دلکش طرز اور بحر میں ہے۔ جس نے علمی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔) (۳) رموزِ بے خودی (فارسی کی دوسری مقبول مثنوی) (۴) زبورِ عجم۔ ان کے علاوہ وہ فلسفہ اسلام پر متعدد لیکچر اور مقالے لکھے جو کتاب کے طور پر بھی شائع کئے گئے ہیں۔

آپ کے کلام کی شہرت ہندوستان کی سرحد سے گزر کر تمام دنیا میں پہنچ گئی۔ اس لئے ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ کی طرف سے اردو اور فارسی ادب کی خدمت گزاری کے صلہ میں آپ کو "سر" کا خطاب ملا۔ آپ کے اردو تصانیف میں "بانگِ درا" "بالِ جبریل" "ضربِ کلیم" "شکوہ جوابِ شکوہ" قابلِ داد ہیں۔ آپ حقیقت کے ترجمان، ملت و قوم کی زبان، منطقی زبان، ہندوستان کی مجلس مقننہ کے بھی ممبر رہ چکے ہیں۔ آپ کے دیگر اوصاف مثلاً علمی سیاسی خدمات اور سرکاری اعزاز کو اگر قلم بند کریں تو ایک رسالہ ہو جائے۔ کچھ دن ہوئے سر اقبال کے انتقال کی خبر سن کر ہمیں تو کیا بلکہ ساری دنیا کو افسوس ہوا۔ کیوں کہ وہ لائق، قابل، شاعر، ادیب اور فلسفیانہ طبیعت کے مالک تھے۔ فطرت نے گو اقبال کو جسمانی حیثیت سے ہم سے جدا کر دیا ہے۔ لیکن اس کی تصانیف ہیں بار بار اس کی یاد دلاتی ہیں اور ان ہی تصانیف کی وجہ سے وہ قیامت تک زندہ رہے گا۔

محمد عمر علی فاضل ہشتم وسطانیہ شاہ گنج

اقبال نے بچوں کے لئے کیا لکھا؟

گا نا رہے بجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

بچوں کا پہلا شاعر :۔ اردو ادب کے سرمایہ پر جب کبھی بھی نظر ڈالی جائے تو ہر ایک شخص اسے بری طرح محسوس کرے گا کہ اردو کے شاعروں نے بچوں کی طرف بہت ہی کم توجہ کی ہے۔ جن لوگوں نے بچپن گزر جانے کے بعد شاعری کی تو انھوں نے ماضی کی طرف نگاہ ہی نہ ڈالی اور جن رنگین مزاج طبیعتوں نے بچپن ہی سے شاعری شروع کی تو انہوں نے نہ صرف اپنے ہم عمروں کی ترجمانی اور اصلاح کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ اپنے بڑوں کی تقلید میں خود بھی گل و بلبل، صیاد، فراق و وصال، آہ و فغاں، عشق و وفا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر ایسے گم ہو گئے کہ ادھر سے نکلنے کا نام تک نہ لیا۔ اگر نکلنے کی کوشش بھی کی تو راہ نہ ملنے کی وجہ سے اور بھی بھٹک گئے۔

انیسویں صدی تک یہی حالت رہی لیکن جب حالی نے شعرائے اردو کو نظم لکھنے کی دعوت دی اور جب خود بھی مسدس لکھ کر ایک مثال قائم کر دی تو اکثروں نے حالی کو سرے سے شاعر ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بعض حالی کی قائم کردہ راہ پر چلنے تیار ہو گئے۔ اقبال بھی انہیں لوگوں میں سے ہیں۔

اقبال کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اپنے ملک اور قوم کے بچوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے، ان کی رہنمائی کی جائے اور انھیں صحیح راستہ پر لگایا جائے۔ اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال پہلا شاعر تھا جس کے دل میں یہ احساسات پیدا ہوئے اور اسی بنا پر ہندوستانی بچوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

سلیس اور پر اثر شاعری :۔ مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو
مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ درد انگیز نالے ہیں

اقبال کا دماغ بچپن ہی سے شاعرانہ واقع ہوا تھا۔ شاعرانہ دماغ کا ساتھ زبان نے دیا اور ان دونوں کے ملاپ نے دنیا کے سامنے یہ ثابت کر دکھایا کہ اقبال کا کلام موزوں الفاظ کا ایک بے معنی مجموعہ نہیں بلکہ واقعات کا مرقع ہے۔ جسے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا گیا ہے۔

اقبال کے اس کلام پر نظر ڈالی جائے جس میں انہوں نے بچوں کے متعلق لکھا ہے تو یہ بات بہت ہی واضح طور پر نظر آئے گی کہ ان کا کلام تصنع، تکلفات اور استعاروں سے پاک ہے جس کی وجہ سے بچوں کے حلقوں میں اقبال کا کلام حد درجہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ مگر اس مقبولیت میں زبان کی سلاست اور دلچسپ طرز بیان کو بھی کافی دخل ہے۔ اقبال کے ہر شعر میں متانت اور شگفتہ بیانی کافی واضح طور پر پائی جاتی ہے۔ اقبال ایسی خوبیوں کے مالک تھے جو کسی گزرے ہوئے اور موجودہ شاعر میں نظر نہیں آتے۔ ان ہی اوصاف کا نتیجہ ہے کہ بچے اقبال کے کلام کو شوق سے پڑھتے ہیں اور اس پر خوشی سے عمل کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ بچے اقبال کے ناصحانہ کلام کو بھی اس شوق سے پڑھتے اور سنتے ہیں گویا وہ کوئی دلچسپ کہانی پڑھ رہے ہیں۔ یہ اقبال کا انوکھا انداز بیان ہے۔

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دراصل نصائح بیان کرنے کے لئے بھی ایک خاص انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو اتنا دلکش ہو کہ پڑھنے والے کو فوراً اپنی طرف متوجہ کر لے اور اتنا دلچسپ ہو کہ پڑھنے والے کو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ کوئی نصیحت پڑھ رہا ہے۔ اقبال کے کلام میں یہ بات خاص طور پر نمایاں ہے۔

اس کے علاوہ جب کبھی وہ قصہ بیان کرتے ہیں تو اس کے آخر میں کوئی نصیحت نہیں نکالتے، بلکہ قصہ خود اس طریقہ سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا نہایت ہی آسانی سے نصیحت حاصل کر لیتا ہے۔ مثلاً

دل میں پرکھا بھلا برا اس نے　　اور کچھ سوچ کر کہا اس نے　　یوں تو چھوٹی ہے ذات بکری کی　　دل کو لگتی ہے بات بکری کی

ایک دوسری جگہ انھوں نے فلسفۂ مساوات نہایت ہی آسانی سے حل کرتے ہوئے لکھا ہے ؎ ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے　　کوئی بڑا کوئی چھوٹا یہ اس کی حکمت ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں ؎ نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں　　کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

مساوات کے فلسفے کو بیان کرنے کے بعد وہ ہمدردی کے متعلق لکھتے ہیں ؎ ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے　　آتے ہیں جو کام دوسروں کے

اتحاد کے متعلق بھی آپ کے جواہر ریزے ساری دنیا کے نہ صرف بچوں کو بلکہ بڑوں کو بھی سبق دینے کے لئے کافی ہیں ؎

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ　　ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ　　پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎ مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز　　جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز
قیامِ بزمِ ہستی ہے انہیں سے　　ظہورِ اوج و پستی ہے انہیں سے　　ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی　　اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی

اقبال مذاق مذاق میں بڑی کام کی باتیں کہہ گئے ہیں ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض　　دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق　　کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"

بچوں کا قومی شاعر:- مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا　　وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

اس میں شک نہیں کہ اقبال جہاں بچوں کے ایک مصلح تھے وہ ان کے ایک قومی شاعر بھی تھے۔ ان کی یہی خواہش تھی کہ بچوں کے دماغ سے بھوت پریوں کے خیالات نکال کر قومی خیالات بھر دیئے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" لکھا جس میں انھوں نے ہندوستان کی عظمت کی کہانی سنائی ہے۔ وہ وطن کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا　　نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا　　جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

یونانیوں کو جس نے حیران کر دیا تھا　　سارے جہاں کو جس نے علم و ہنر دیا تھا
مٹی کو جس کی حق نے زر کا اثر دیا تھا　　ترکوں کا جس نے دامن ہیروں سے بھر دیا تھا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

ہندوستان کی عظمت دکھانے کے بعد وہ ہندوستان کی موجودہ حالت کی تصویر کھینچ کر ہندوستانی بچوں کو عبرت دلاتے ہیں۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو　　کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں　　تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

بچوں کا مصور جذبات و ترجمان :- کلی تو لب اقبال سے ہو کیا جانے کس کی ہے یہ صدا پیغام سکوں پہنچا بھی گئی دل محفل کا تڑپا بھی گئی

اقبال نے بچوں پر لکھا ہی اس غرض سے شروع کیا تھا کہ انھیں "تاریکی سے نکال کر روشنی میں لایا جائے"۔ اقبال نے بچوں کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ ہندوستانی بچوں کو مشکور ہونا چاہیے کہ اقبال نے ان کے لیے بھی وقت نکالا۔ شیر خوار بچے کے متعلق لکھتے ہیں ؎

زندگانی ہے تری آزاد قید امتیاز ۔۔۔ تیری آنکھوں پر ہویدا ہے مگر قدرت کا راز

آگے چل کر اقبال طفل شیر خوار کا درجہ کتنا بڑھا دیتا ہے ؎

تیری صورت گاہ گریاں گاہ خنداں میں بھی ہوں ۔۔۔ دیکھنے کو نوجواں ہوں طفل ناداں میں بھی ہوں

ایک جگہ ایک بچہ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یا رب ۔۔۔ علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یا رب

اگر فلسفہ دانوں کو اس بات پر ناز ہے کہ اقبال ایک زبردست فلسفی تھا۔ اگر قانون دانوں کو اس پر ناز ہے کہ اقبال ایک قابل قانون داں تھا۔ اگر قوم پرستوں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک قوم پرست تھا اگر شاعروں کو اس پر فخر ہے کہ اقبال ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا تو بچوں کو ناز ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ اقبال ان کا پہلا ترجمان، پہلا مسیحا اور پہلا شاعر تھا۔

اقبال اگرچہ گذر گیا مگر اس نے ہمارے لئے اپنا وہ خیرِ نی کلام چھوڑ گیا۔ جو ہمارے لئے ہوا سے زیادہ ضروری اور غذا سے زیادہ مفید ہے۔

ح انصاری (متعلم ہنڈیشنل اسکول)

زندۂ جاوید

تاریخ عالم نے کئی لافانی ہستیوں کو پیش کیا ہے۔ غالب کے بعد مشرقی دنیا سے صرف اقبال ہی نے ہر لحاظ سے دنیا سے اپنا لوہا منوایا جیسا کہ دنیا میں غالب نہ غالب رہا اور ہمیشہ غالب رہے گا اسی طرح دنیا کی اس بلند اقبال ہستی کا اقبال رہتی دنیا تک اقبال مند رہے گا۔ جس طرح ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے غالب کا مغرب کے کثیر التعداد فلسفیوں سے موازنہ کیا ہے اسی طرح اگر آج ہم اقبال کا بھی دنیا کے بڑے بڑے مدبر، فلسفی اور قابل ہستیوں سے موازنہ کریں تو مشرق کی یہ عبقری ہستی ہر طرح قابل احترام اور مستحق پرستش ثابت ہوگی۔

اردو اور فارسی کے اس شاعر اعظم نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے دنیا کو آسمانی پیغام سنایا۔

اقبال ایک بہت بڑے محب وطن تھے جب وہ ہندوستان سے یورپ کو چلے تو انھوں نے اپنے وطن کا حسب ذیل اشعار میں یوں ذکر کیا تھا ؎

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور ۔۔۔ یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے ۔۔۔ اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے

ورثے میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد ۔۔۔ جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

بچپن ہی سے ان میں شاعری کے اثرات نمایاں تھے ۔۔۔۔۔ داغ کی تلمیذی کی لیکن اپنے قول کے مطابق ۔ ع

"شوق دہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست"۔ ان کی طبیعت کی روانی سب سے بڑھ کر ان میں ابھارنے والی تھی۔ ان کا طرز بیان تمام اردو شعرا سے جدا نظر آتا ہے۔ ایک جگہ داغ کی شاگردی پر اس طرح فخر کیا ہے ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

فطری اور قومی شاعری ان کی خصوصیات ہیں ان کے کلام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اسلامیت کی روح مولوی عبدالحق صاحب کے خیال کے مطابق اقبال کا کلام میر کے سوز و گداز، غالب کی جدت و اجتہاد، مومن کی نازک خیالی، ذوق کی روانی و صفائی، درد کی تاثیر و دلاویزی، کا نچوڑ ہے۔ ان کے کلام میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جو مختلف شعرا کی زمین اور قافیہ و ردیف میں لکھے گئے تھے۔ اور رنگ میں رنگ ملانے کی کوشش کی گئی تھی۔ چنانچہ ذیل میں انھوں نے میر کے رنگ میں لکھا ہے ؎

فنا ہونے پہ بھی گویا وفا شعار ہوں میں
جو مٹ گیا تو حسینوں کا اعتبار ہوں میں
نشہ میں مست سمجھتا ہے مجھ کو کیوں واعظ
تو اپنا وعظ کہے جا کہ ہوشیار ہوں میں
تڑپ کے شانِ کریمی نے لے لئے بوسے
کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں

داغ کے رنگ میں ملاحظہ کیجیئے۔

محفل ہو شغلِ مے ہو شبِ ماہتاب ہو
اور میں گروں تو سنبھالا کرے کوئی
دے کر جھلک سی آپ تو پردے میں ہو رہے
اور کہہ گئے نگاہ کو ڈھونڈا کرے کوئی

اس کے علاوہ اقبال نے شبلی، حالی، اکبر اور غالب کے رنگ میں بھی دخل پایا ہے۔ چنانچہ غالب کی ایک غزل کی طرح میں کہا ہے ؎

حلقۂ زنجیر کا ہر جوہر پنہاں نکلا
آئینہ قیس کی تصویر کا زنداں نکلا
وسعت افزائی آشفتگی شوق نہ پوچھ
باغِ ہستی میں متاعِ نفس ارزاں نکلا

نیوٹن کے اس نظریہ کو کہ "ہر عمل کے ساتھ ردِ عمل لازمی ہے" یوں سمجھاتے ہیں۔

ہر عمل کے لئے ہے ردِ عمل
دہر میں نیش کا جواب ہے نیش
شیر سے آسمان لیتا ہے
انتقامِ غزال و اشتر و میش
شمع پروانہ را بسوخت ولے
زود بریاں شود بہ روغنِ خویش

اقبال کے حسبِ ذیل تصنیفات رہتی دنیا تک قائم رہیں گی۔ علم الاقتصاد، معاشیات کے مضمون پر ۱۸۹۶ء میں لکھی گئی تھی۔ فلسفۂ عجم، اسرارِ خودی (فارسی کی مثنوی مولانا روم کی طرز میں لکھی تھی یورپ نے اس کی تراجم و نقادانہ مضامین کے ذریعہ قدر کی) رموزِ بیخودی، پیامِ مشرق (گوئٹے کے "دیوان مغرب" کے جواب میں) بانگِ درا، ضربِ کلیم، شکوہ، جوابِ شکوہ، نالۂ یتیم، کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، تصویرِ درد، زبورِ عجم ــ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کا دن تاریخِ ہند میں یادگار رہے گا کہ اس دن ہندوستان کے جلیل القدر فلسفی مشرق و مغرب کے مفکر شاعرِ اعظم علامہ سر محمد اقبال نے جسمانی اعتبار سے دنیا کو خیرباد کہا اور عدم آباد کی راہ لی اور آسمانِ علم و فضل کا نیرِ درخشاں غروب ہوگیا۔ لیکن علامہ موصوف کی علمی ادبی و سیاسی خدمات تاریخ کے زریں صفحوں پر ہمیشہ ہمیشہ کندہ رہیں گی اور ہمیں یقین ہے کہ اقبال زندہ ہے اور جس وقت تک دنیا قائم رہے گی اقبال زندہ رہے گا۔ اقبال جسمانی حیثیت سے نظروں سے غائب ہوگیا لیکن قیامت تک اس کے کارنامے صفحۂ ہستی سے نہیں مٹائے جا سکتے اس کے پیش بہا خیالات دنیا کے لئے ہمیشہ شمعِ ہدایت ثابت ہوں گے۔ بقول اقبال ؎

موت یہ میری نہیں میری اجل کی موت ہے
کیوں ڈروں اس سے کہ مر کر بھی نہیں مرنا مجھے

مرزا معین بیگ
سٹی کالج فوقانیہ [illegible]

پرندے کی فریاد

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانا
وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم
شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت وہ کامنی سی مورت
آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

کیا بد نصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں
ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں
آئی بہار کلیاں پھولوں کی ہنس رہی ہیں
میں اس اندھیرے گھر میں قسمت کو رو رہا ہوں

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں میں غم سے مر نہ جاؤں

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے!

(اقبال)

اقبال کے چند منظوم مکالمے اور کہانیاں

ایک مکڑا اور مکھی:- ایک مکھی کا گزر ایک مکڑا کے گھر سے ہوا تو وہ اس کو دیکھ کر اس طرح کہنے لگا۔ مکڑا! تمھارا روز اس راہ سے گزر ہوتا ہے۔ لیکن کبھی میری کٹیا کی قسمت نہیں جاگی کہ تم اس کو اپنے قدم سے عزت افزائی کرتے اگر تم غیروں سے ملنا پسند نہیں کرتے تو اپنوں سے یہ کچھ ادائی ٹھیک نہیں۔ سامنے سیڑھی موجود ہے اگر آنا چاہیں تو اس کے ذریعہ سے آسکتی ہو۔

مکھی نے یہ سن کر کہا۔ حضرت! کسی نادان کو یہ دھوکا دیجئے۔ میں کبھی اس جال میں آنے کی نہیں کیونکہ جس نے آپ کی سیڑھی پر چڑھا تو پھر اترا نہیں۔ مکڑا (غصہ سے) واہ تم نے تو مجھے فریبی بنا دیا۔ دنیا میں تم سا کوئی نادان نہ ہوگا۔ مجھے تمھاری خاطر منظور تھی میرا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ خدا جانے تم کہاں سے اڑتی ہوئی آرہی ہو۔ میرے گھر ٹھیر جائیں تو کیا برائی ہے۔ اس گھر میں کئی چیزیں تم کو دکھلانی ہیں۔ یہ چھوٹی شئے کیا ہے جو باہر سے نظر آرہی ہے اس کے دروازوں پر باریک پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ میں نے دیواروں کو آئینوں سے سجایا ہے۔ مہمانوں کے آرام کے لئے بستر حاضر ہیں ہر شخص کو یہ سامان آرائش کہاں سے میسر آتا ہے۔

مکھی! خیر! یہ سب درست ہے لیکن آپ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں آپ کے دولت خانہ میں آؤں گی۔ مجھ کو خدا ان نرم بستروں سے محفوظ رکھے۔ اگر کوئی ان پر لیٹ جائے تو پھر اٹھ نہیں سکتا۔

مکڑے نے جب یہ دیکھا کہ اس کی یہ چال بھی کارگر نہیں ہوئی تو دل میں غور کرنے لگا کہ اس کو کس طرح سے پھانسا جائے۔ دنیا میں خوشامد سے سو کام نکلتے ہیں جس کو دیکھو خوشامد کا بندہ ہے یہ خیال کر کے کہنے لگا "آپ کی صورت جس نے دیکھی اس کو آپ کی صورت سے محبت ہو جاتی ہے۔ آنکھیں کیا ہیں ہیروں کی چمکتی کنیاں ہیں۔ آپ کے سر کو اللہ نے کلغی سے سجایا ہے آپ کا یہ حسن، یہ پوشاک، یہ خوبی، یہ صفائی، پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ اڑتے ہوئے گانا ایک قیامت ہے۔ مکڑے کی یہ چال کارگر ہوگئی۔ اس خوشامد سے مکھی کا دل نرم ہوگیا اور کہنے لگی۔ مجھ کو آپ سے کوئی خوف نہیں۔ میں انکار کرنا برا خیال کرتی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی کا دل توڑنا اچھا نہیں ہوتا۔

یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اڑی اور مکڑے کے قریب آئی مکڑے نے اچھل کر اس کو پکڑ لیا۔ کئی روز سے یہ بھوکا تھا اب آرام سے گھر بیٹھ کر مکھی کو مزے لے لے کر کھایا۔

ایک پہاڑ اور گلہری:- ایک مرتبہ ایک پہاڑ گلہری سے اپنی بڑائی کا اس طرح اظہار کرنے لگا۔ اگر تجھ کو ذرا بھی شرم ہو تو پانی میں ڈوب مر۔ اپنی عقل، سمجھ اور شعور پر تجھ کو دعویٰ ہے۔ خدا کی شان ایک ناچیز ہستی اور غرور۔ بدتمیز اور ناداں لوگ مہذب اور عقلمند ہونے کا دعویٰ کریں۔ میری شان اور شوکت کے آگے تیری بساط ہی کیا ہے زمین بھی میری آن بان کے سامنے پست ہے۔ مجھ میں جو خوبیاں ہیں وہ تجھ کو کہاں سے نصیب ہو سکتی ہیں بھلا پہاڑ کہاں اور ایک غریب جانور کہاں۔

گلہری نے جواب دیا ذرا منہ سنبھال کر بات کر یہ باتیں دل سے نکال دے۔ گو میں تیرے مانند بڑی نہیں ہوں لیکن تو بھی تو میری طرح چھوٹا ہے ہر چیز خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔ یہ اس کی حکمت ہے کہ کوئی بڑا ہے تو کوئی چھوٹا۔ تجھ کو اگر دنیا میں

بُرا بنایا تو مجھ کو درخت پر چڑھنا سکھایا۔ تجھ کو قدم اٹھانے کی ذرا سی بھی طاقت نہیں۔ تجھ میں صرف بُرائی ہی بُرائی ہے اس کے سوا تجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ اگر تجھ کو بڑائی کا دعویٰ ہے تو میری طرح کوئی اپنا ہنر دکھلا۔ تو یہ اس چھالیہ کو توڑ کر تو دکھلا دو۔ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے۔ قدرت کے کارخانے میں کوئی بُرا نہیں ہے۔

ایک گائے اور بکری:۔ کسی جگہ ایک سبزہ زار اور پُر بہار چراگاہ تھی جس کا سماں احاطۂ قلم سے باہر ہے جس کے چاروں طرف نہریں رواں تھیں اور کنارے گنت اور پیپل کے سایہ دار درخت تھے چاروں طرف سے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ کہیں سے ایک بکری چرتی ہوئی ندی کنارے آئی تو ایک گائے سے ملاقات ہوئی پہلے اس کو جھک کر سلام کیا پھر ادب سے اس طرح گویا ہوئی۔

کیوں بڑی بی مزاج کا کیا حال ہے۔ گائے: شکر ہے اچھی ہوں بُری اور بھلی جس طرح سے بھی ہو زندگی گزار رہی ہوں زندگی کیا ہے ایک مصیبت ہے۔ قسمت بری ہے اس کا کیا شکوہ کروں نصیب میں جو لکھا ہے۔ وہی ہوتا ہے۔ انسان سے کوئی اچھا سلوک نہ کرے خدا نہ کرے کسی کو اس سے پالا پڑے اگر دودھ کم دیتی ہوں تو بڑبڑاتا ہے اگر دبلی ہو جاؤں تو بیچ کر دام سیدھے کر لیتا ہے۔ اپنے ہتھکنڈوں سے غلام بنا لیتا ہے مکر اور فریب سے رام کرتا ہے۔ میری وجہ سے اس کے بچوں کو دودھ نصیب ہوتا ہے کیا زمانہ آگیا ہے کہ نیکی کا بدلہ بدی سے دیا جاتا ہے۔ اے اللہ تجھ سے فریاد ہے۔ بکری: آپا اگلا ٹھیک نہیں سچی بات کڑوی لگتی ہے۔ مگر میں خدا لگتی کہوں گی یہ سر سبز چراگاہ یہ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا یہ ہری ہری گھاس اور ساری خوشیاں ہم کو کہاں سے نصیب ہوئیں یہ ساز و سامان کہاں اور ہم غریب بے زبان کہاں یہ تمام لطف انسان کے دم سے باقی ہے اس کی وجہ سے ہماری زندگی ہے۔ ایسی قید جس میں سراسر آرام ہو بہتر ہے اس آزادی سے جس میں سو طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ خدا اس زندگی سے محفوظ رکھے ہم پر انسانوں کا بڑا احسان ہے ان کا شکوہ کرنا زیبا نہیں۔ اگر تم موجودہ آرام کی قدر و قیمت کا اندازہ کرو تو پھر سے کبھی گلہ نہ کرو گی۔

گائے بکری کی نصیحت آمیز گفتگو سن کر شرما گئی اور انسان کو سخت سست کہنے سے پچھتائی اور دل میں بُرا اور بھلا کہنے لگی کچھ غور کر کے اس نے کہا بکری یوں تو چھوٹی ہے مگر اس کی بات دل کو لگتی ہے۔

ہمدردی:۔ کسی درخت کی ٹہنی پر ایک بلبل اداس سا بیٹھا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا کہ رات سر پر آ رہی ہے سارا دن اڑنے چگنے میں گزرا اب کس طرح آشیانے تک رسائی ہوگی۔ کیونکہ ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔

جگنو جو کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا تھا بلبل کی آہ و زاری سن کر کہنے لگا اگرچہ کہ میں ذرا سا کیڑا ہوں مگر دل و جان سے مدد کو حاضر ہوں رات اندھیری ہے تو غم کس بات کا میں رستے میں روشنی کر دوں گا۔

اللہ نے مجھ کو مشعل دی ہے مجھے چمکا کر چراغ بنا دیا ہے۔ وہی لوگ دنیا میں اچھے ہیں جو دوسروں کے کام آتے ہیں۔

محمد معین الدین
(مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء)

ماں کا خواب

میں سوئی جو اک شب تو دیکھا یہ خواب ۔۔۔ بڑھا اور جس سے مرا اضطراب
یہ دیکھا کہ میں جا رہی ہوں کہیں ۔۔۔ اندھیرا ہے اور راہ ملتی نہیں
لرزتا تھا ڈر سے مرا بال بال ۔۔۔ قدم کا تھا دہشت سے اٹھنا محال
جو کچھ حوصلہ پا کے آگے بڑھی ۔۔۔ تو دیکھا قطار ایک لڑکوں کی تھی
زمرد سی پوشاک پہنے ہوئے ۔۔۔ دیے سب کے ہاتھوں میں جلتے ہوئے
وہ چپ چاپ تھے آگے پیچھے رواں ۔۔۔ خدا جانے جانا تھا اُن کو کہاں
اسی سوچ میں تھی کہ میرا پسر ۔۔۔ مجھے اس جماعت میں آیا نظر
وہ پیچھے تھا اور تیز چلتا نہ تھا ۔۔۔ دیا اس کے ہاتھوں میں جلتا نہ تھا
کہا میں نے پہچان کر میری جاں! ۔۔۔ مجھے چھوڑ کر آ گئے تم کہاں؟
جدائی میں رہتی ہوں میں بیقرار ۔۔۔ پروتی ہوں ہر روز اشکوں کے ہار
نہ پروا ہماری ذرا تم نے کی ۔۔۔ گئے چھوڑ، اچھی وفا تم نے کی!
جو بچے نے دیکھا مرا پیچ و تاب ۔۔۔ دیا اس نے منہ پھیر کر یوں جواب
رلاتی ہے تجھ کو جدائی مری؟ ۔۔۔ نہیں اس میں کچھ بھی بھلائی مری
یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک چپ رہا ۔۔۔ دیا پھر دکھا کر یہ کہنے لگا
سمجھتی ہے تو ہو گیا کیا اسے؟ ۔۔۔ ترے آنسوؤں نے بجھایا اسے!

(اقبال)

سب رس کے قلمی معاونین اور خریدار اصحاب سے

۱۔ بلدہ کے بعض خریدار اصحاب کے پتے غلط معلوم ہوتے ہیں یا واضح نہیں ہیں جس کی وجہ سے منتظم کنندوں کو دقت ہو رہی ہے۔ اور پرچے یا تو بعض پہنچ نہیں رہے ہیں یا دیر میں پہنچ رہے ہیں۔ جن اصحاب کو ایک ہفتہ کے اندر پرچے نہ مل رہے ہوں وہ اپنے ٹھیک پتے اور نمبر مکان وغیرہ سے مطلع فرمائیں۔

۲۔ بعض اصحاب نے دفاتر یا مدارس کے پتے دئے ہیں۔ اگر انگریزی مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں چھٹیاں ہوں تو سب رس ان کو وقت پر نہیں پہنچ سکتا۔ ایسے اصحاب اگر مکان کے پتے روانہ کر سکیں تو دفتر کو سہولت ہوگی۔

۳۔ بلدہ کے بعض اصحاب بار بار پتہ تبدیل کرنے کی اطلاع دیتے ہیں یا اضلاع کے اصحاب عارضی طور پر بلدہ آکر اپنے پرچے طلب کرتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں اکثر پرچے وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔ اگر دو مہینے سے زیادہ قیام کرنا نہ ہو تو قدیم پتہ ہی سے منگوائیں۔ اور ڈاک خانہ کو اپنے پتہ کی تبدیلی سے مطلع کر دیں تو رسالہ وقت پر مل جائے گا۔

۴۔ خریدار اور مضمون نگار اصحاب کے اتنے استفساری خطوط آتے ہیں کہ ادارہ ان کا فوری جواب بعض دفعہ نہیں دے سکتا۔ یہ امر واضح رہے کہ جن خطوط میں جواب کے لئے اسٹامپس روانہ نہیں کئے جاتے ان کے جواب کی توقع نہ رکھنی چاہئے۔ مراسلت میں نمبر خریداری کا حوالہ بھی ضروری ہے۔

۵۔ بعض اصحاب اپنے مضمون یا نظمیں روانہ کرتے وقت اس امر کا خیال نہیں کرتے کہ ہر مضمون یا نظم کے نیچے نام اور پتہ کا اندراج ضروری ہے کیونکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ صرف خط کے نیچے دستخط کر دئے جاتے ہیں جو بعض اوقات واضح نہیں ہوتے اور خط کے ساتھ دوسرے کاغذات پر جو مضامین یا نظمیں ہوتی ہیں ان کے ختم پر نام لکھنا بھول جاتے ہیں۔ بچوں کے بعض مضامین اور خط بغیر نام کے بھی وصول ہوئے ہیں۔

سب رس کی جلد

سب رس کے سال بھر کے بارہ پرچوں کے لئے ایک جدید قسم کا "فائیل کور" بطور جلد کے تیار کیا گیا ہے جس کے پشتہ پر سنہری حروف میں "سب رس" منقش ہے۔ اور جس میں نہایت سہولت کے ساتھ ہر ماہ پرچہ لگایا یا نکالا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بالکل جدید چیز ہے اور یورپ میں طرز پر بنوائی گئی ہے۔ اس میں رکھنے سے پرچے خراب نہیں ہوتے اور نہ سب رس کے رنگین سرورقوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ جو اصحاب سال بھر کے سب رس کے بارہ پرچوں کو ایک جگہ کر کے جلد بنوانا چاہتے ہوں وہ بھی سے یہ فائیل کور خرید لیں تو ان کے رسالے محفوظ رہیں گے اور اس نفیس و خوشنما فائیل کی جلد سے ان کی میزوں اور الماریوں کی آرائش و زیبائش میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کی قیمت باوجود اتنی خوبیوں کے صرف ۱۲ ہے۔ سب رس کے ایجنٹوں سے یا براہ راست دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم سب رس

نذرِ ولی

ادارۂ ادبیاتِ اردو کا نیا کارنامہ

ادارۂ ادبیاتِ اردو اصل میں جامعہ عثمانیہ کے فیض یافتہ نوجوانوں کی تصنیفات و تالیفات کی اشاعت کے لئے قائم کیا گیا تھا اور خدا کے فضل سے اس اثنا میں اس نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ اس کے اغراض و مقاصد میں توسیع عمل میں آئی۔ اور وہ اب حیدرآباد کا واحد علمی و ادبی ادارہ بن گیا ہے جو اپنے مطبوعات کے ذریعہ سے اردو زبان اور ادب کی اہم خدمت انجام دے رہا ہے۔ نوجوانوں کے دلوں میں اردو کی خدمت کا ولولہ پیدا کرنا اور اہل ملک کو اردو ادب کے مطالعہ کی طرف راغب کرنے میں اس نے غیر معمولی کام کیا ہے۔ اس وقت تک ادارہ نے جامعہ عثمانیہ کے پچاسوں طلبہ کے مضامین کے مجموعے اور دیگر کتب شائع کی ہیں۔ اب اس نے اسی جامعہ کی ایم۔ اے۔ کی طالبات کے مضامین کا یہ نفیس مجموعہ پیش کیا ہے جو اردو زبان میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے۔

اس میں دکن کی مایہ ناز خواتین انشا پرداز محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ محترمہ نعیم النسا بیگم صاحبہ بی۔ اے۔ اور محترمہ نجم النسا بیگم صاحبہ بی۔ اے کے دلچسپ مضامین شامل ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ مجموعہ کے متعلق ڈاکٹر زور کی یہ رائے ہے کہ

> ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا تھا اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گا کہ ولی واقعی استاد الاساتذہ اور آدمِ اردو تھے۔ ان مضامین میں ولی کی معلومات، ان کے تخیل ان کے فن شعر، اور ذوقِ عرفان کے علاوہ ان کے اسلوبِ زبان، اور انتخابِ الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ اردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والے اصحاب ان کے مطالعہ سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔

اس کتاب کی کتابت و طباعت اور جلد بندی ایسی ہی نفیس ہے جیسی کہ صنفِ نازک کی ایک نفیس ترین کتاب کے لئے ہونا چاہیئے۔ نذرِ ولی، اقبال اور جوش کے کلام کے مجموعوں کی سائز پر نہایت دیدہ زیب جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے جس پر دو جگہ خوبصورت خط کوفی میں نام کے سنہری ٹھپے ہیں۔ تعداد صفحات ۲۵۰۔ قیمت مجلد عالی ۸/

خواجہ حمید الدین مہتمم ادارہ

دفتر سب رس یا ہر کتب فروش سے مل سکتی ہے۔

محض خریداران سب رس کے لئے

صرف تین ماہ تک اُردو کی مشہور و معروف کتابیں رعایتی قیمتوں پر

صرف سب رس کے خریداروں کو حسب ذیل بیش مشہور و معروف اردو کتابیں ۳۰ جون ۱۹۳۸ء تک ادارہ کی طرف سے رعایتی قیمت سے پیش کی جائیں گی۔

قیمتوں میں قابل لحاظ تخفیف کرانے کا واحد مقصد یہی ہے کہ ادارہ سب رس چاہتا ہے کہ

(۱) سب رس پڑھنے والوں کے لئے وسعت مطالعہ کا زرین موقع حاصل ہو۔

(۲) بہترین اُردو کتابوں تک شائقین کی سہولت سے رسائی ہوسکے۔

(۳) کم صرفہ سے وہ اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا دلچسپ کتب خانہ جمع کرسکیں۔

رعایتی قیمتوں اور بازار کی رائج قیمتوں کا مقابلہ کرلینے سے سب رس کی اس مفید تجویز اور ایثار کی اہمیت واضح ہوجائے گی۔

ہر فرمائش کے ساتھ سب رس کے خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ ورنہ تعمیل نہیں کی جائے گی۔

اگر دس روپیہ سے زیادہ کی کتابیں منگوائی جائیں تو محصول ڈاک دفتر سب رس ہی ادا کرے گا۔

نوٹ۔ اگر اس رعایت سے فائدہ اٹھایا گیا تو ادارہ کوشش کرے گا کہ اُردو کی دیگر مفید اور اہم کتابیں بھی اسی طرح رعایتی قیمتوں پر اپنے خریداران کے لئے فراہم کرسکے۔

کتاب	مصنف	کیفیت	بازاری قیمت	رعایتی قیمت
۱۔ اردو شہ پارے	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	وہ معرکۃ الآرا کتاب جو یورپ میں دو سال کی تحقیق و تفتیش کے بعد لکھی گئی جس میں اردو کے ماہر متقدمین کا پارہ نظم و نثر	لعہ	۱۲ ؍
۲۔ اردو ادب بیسویں صدی میں	مولوی علی متین صاحب زیبا ایم اے	عہد حاضر کے اردو ادب کا بے لاگ تبصرہ جس پر مصنف کو ام اے کی ڈگری حاصل ہوئی	۱۲ ؍	۸ ؍
۳۔ جدید اُردو شاعری	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری	حالی سے لیکر موجودہ عہد تک اردو شاعری کے مختلف دبستانوں کی مستند اور مقبول تصویر تاریخ	عال	عال
۴۔ یورپ میں دکنی مخطوطات	مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب	یورپ کے کتب خانوں کی دکنی قلمی کتابوں کا تفصیلی تذکرہ۔ سات سو سے زیادہ صفحات	عہ	ے
۵۔ اردو کے اسالیب بیان	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور	اردو نثر نگاری کی تاریخ با انشا پردازوں کی نثر کے اسلوب اور خصوصیات پر تبصرہ	۱ ؍	۱۲ ؍
۶۔ یادگار ولی	مولوی سید محمد صاحب ایم اے	اردو شاعری کے باوا آدم حضرت ولی اورنگ آبادی کی دو صد سالہ جشن یادگار کا باتصویر دلچسپ مرقع	عال	[illegible]
۷۔ ارمغان عزیز	نواب عزیز یار جنگ بہادر	حیدرآباد دکن کے مشہور استاد اور باکمال شاعر کے بلند پایہ کلام کا مجلد باتصویر اور دیدہ زیب مجموعہ	عال	[illegible]
۸۔ مرقع سخن جلد دوم	مرتبہ ڈاکٹر زور	حیدرآباد کے پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو صفحات اور پچاس تصاویر مجلد	عہ	لعہ
۹۔ سراج سخن	پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری	شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا نہایت مستند انتخاب جس کے ساتھ حضرت سراج کی تحریر کا عکس بھی ہے	۱۲ ؍	۸ ؍
۱۰۔ خواتین عہد عثمانی	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	خواتین دکن کی پچاس سالہ ہمہ جہتی ترقی کا مرقع۔ بقول مدیر معارف اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب	[illegible]	[illegible]
۱۱۔ مشاہیر قندھار دکن	محمد اکبر الدین صاحب صدیقی	دکن کے مشہور مردم خیز خطہ قندھار شریف کے اولیا علما و شعرا اور مصنفین کا باتصویر تذکرہ	[illegible]	۸ ؍

	کتاب	مصنف	کیفیت	بازار کی قیمت	رعایتی قیمت
۱۲	حیدرآباد کے عالم دل و شاہ کی تحقیق	مولوی علی محسن صاحب ایم اے	حیدرآباد کی تاریخ کے ایک اہم دور کے متعلق نہایت عمدہ اور مفید تحقیقی مقالہ جس پر مصنف ایم اے کی ڈگری ملی	ہر	عہ
۱۳	فن انشا پردازی	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	مضمون نگاری و انشا پردازی کے اسرار اور فن تحریر کی کامیابی کے عملی طریقے اور ترقی کے وسائل	ہر	۱۲/
۱۴	بادۂ سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	دکن کے مشہور شاعر ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی اور انتخاب کلام مع تصویر شاعر	۱۲/	۸/
۱۵	مثنویات میرؔ	مولوی سید محمد صاحب ایم اے	اُردو شاعری کے سراج میر تقی میر کی مثنویات کی تنقیدی مطالعہ کے ساتھ شیاد و مقدمہ کے ساتھ	عار	عہ/
۱۶	تنقیدی مقالات	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	اُردو اور فارسی کے بہترین مصنفوں اور شاعروں کے کارناموں پر اعلیٰ پایہ کی تنقیدیں صفحات ۲۹۶ مجلد	ہر	عار
۱۷	کیف سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	دکن کے مشہور شاعر سید ضمیر الدین حسن کیفی مرحوم کے حالات زندگی اور انتخاب کلام مع تصویر شاعر	۱۲/	۸/
۱۸	حضرت امجد کی شاعری	مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی	عہد حاضر کے سب سے بڑے اہل دل شاعر حضرت امجد کے کلام پر تبصرہ اور نمونہ	۱۲/	۸/
۱۹	متاع سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے جملہ دیوانوں کا دلچسپ انتخاب مع حالات و تصویر شاعر	۱۲/	۸/
۲۰	فیض سخن	ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ	استاد الاساتذہ حضرت میر شمس الدین محمد فیض کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام مع تصویر	۱۲/	۸/
			جملہ	۱۲/ ۲۸	۴/ ۲۴

نوٹ: بازار کی قیمتوں اور سب رس کی رعایتی قیمتوں کے مقابلے سے معلوم ہوگا کہ سب رس کے خریداروں کے لئے کتنی زیادہ سہولت بہم پہونچائی جا رہی ہے یعنی ان کتابوں کی خریدی پر سب رس کے خریدار کا بیک وقت گیارہ روپے آٹھ آنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ اہل ذوق اصحاب اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے کیونکہ دفتر سب رس نے محض علم و ادب کی خدمت کی خاطر ان کتابوں کے مصنفین و مولفین سے قیمت کی یہ رعایت صرف تین ماہ کے لئے حاصل کی ہے۔

خواجہ حمید الدین شاہد مہتمم سب رس

گولکنڈہ کے افسانے

دکن کی عظیم الشان قطب شاہی سلطنت کی شہرۂ آفاق ثروت، تہذیب، معاشرت، اور اصلی زندگی معلوم کرنا ہو تو ڈاکٹر زورؔ کے یہ عجیب و غریب افسانے ضرور پڑھئے۔ ان میں بقول مولانا عبدالحق بی اے معتمد انجمن ترقی اُردو "تاریخ اور افسانے اور واقعات اور تخیل کو اس خوبی سے سمویا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔"

تاریخی معلومات کے علاوہ جو اصحاب جدید اُردو نثر اور افسانوں کے پاکیزہ اسلوب سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے بھی "**سیر گولکنڈہ**" اور "**گولکنڈے کے ہیرے**" ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔

گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا اور جنھوں نے کبھی گولکنڈے کی سیر نہیں کی ان کے لئے یہ ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔

دونوں کتابیں باتصویر ہیں۔

سیر گولکنڈہ	صفحات ۱۶۰	تصاویر ۱۲	اور قیمت صرف ۱۵/
گولکنڈے کے ہیرے مجلد	۱۲۷	۸	۱۲/

ہر کتب فروش و نیز دفتر سب رس یا مکتبہ ابراہیمیہ سے طلب کیجئے۔

ادارۂ ادبیات اُردو کی مطبوعات

۱۔ مُرقعِ سخن (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات، پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (ععہ) اس پُر قیمت کتاب کے اب صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔

۲۔ مرقعِ سخن (جلد دوم) حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد (ععہ) اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و آصفی اور ... [illegible]

۳۔ سراجِ سخن حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم۔اے، ایل ایل بی صفحے (۱۵۲) قیمت (۱۲/) مع تصویر خط سراج

۴۔ ایمانِ سخن استاذ الشعراء شیر محمد خاں ایمان حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد صاحب ... اردو صفحے (۱۲۰) قیمت (۱۲/) ایمان عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرائے دکن تھے۔

۵۔ فیضِ سخن استاد کل حضرت شاہ شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی۔ صفحے (۱۴۴) قیمت (۱۲/) مع تصویر درگاہ فیض

۶۔ بادۂ سخن ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔اے پی ایچ ڈی۔ صفحے (۱۲۰) قیمت (۱۲/) مع تصویر شاعر۔

۷۔ کیفِ سخن سید رضی الدین حسن کیفی کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ، اور جملہ اصنافِ سخن کا انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔اے، پی ایچ ڈی صفحے [illegible] قیمت (۱۲/)

۸۔ متاعِ سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ کے حالاتِ زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصنافِ سخن کا بہترین انتخاب، از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ایم۔اے، پی ایچ ڈی صفحے (۱۲۵) قیمت (۱۲/) مع تصویر شاعر۔

۹۔ ورڈزورتھ اور اس کی شاعری انگلستان کے مشہور شاعر کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام جس نے اُردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم۔اے۔ صفحے (۱۰۴) قیمت (عہ) مع تصویر شاعر۔

۱۰۔ ٹیگور اور اس کی شاعری ہندوستان کے مشہور شاعر اعظم کے حالاتِ زندگی و تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم۔اے صفحات (۲۴۰) قیمت [illegible]

۱۱۔ ہوش کے ناخن حیدرآباد کی سماجی زندگی کا ایک مرقع جو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین ایم۔اے۔ صفحات (۹۲) قیمت (۱۲/)

۱۲۔ یوسفِ ہندی قیدِ فرنگ میں مرزا غالب کے حالاتِ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محمد حسن [illegible] بی اے، ایل ایل بی صفحے [illegible] قیمت (۸/)

۱۳۔ تذکرۂ ولی۔ بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں طلبات جامعہ عثمانیہ کی نذرِ عقیدت صفحات (۱۵۰) قیمت مجلد (عا) ۸/

المشتہر خواجہ حمید الدین مہتمم ادارۂ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات اردو کی زیر طبع کتابیں

۱۔ گنج سخن ۔ انتخاب کلام حضرت میر احمد علی عصر مرحوم .... از مولوی سید محمد صاحب ام، اے۔

۲۔ انتخاب کلام حکیم مظفر الدین صاحب فراق مرحوم .... از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

۳۔ گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب میکش کی نظموں کا مجموعہ

۴۔ اردو مرثیہ نگاری .... از مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی ام اے۔

۵۔ شمس الامرا کی اردو خدمات .... از نواب محمد ظہیر الدین خان صاحب بی، اے۔

۶۔ تاریخ ادبیات انگریزی .... از مولوی میر حسن صاحب ام، اے۔

۷۔ تاریخ ادبیات عربی .... از مولوی سید ابو الفیض صاحب ام، اے۔

۸۔ تاریخ ادبیات اردو .... از ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ام اے، پی ایچ ڈی

۹۔ تاریخ ادبیات ہندی .... از پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ام اے ۔ ال ال بی

۱۰۔ تاریخ گولکنڈہ .... از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ۔ ال ال بی ۔

۱۱۔ نقد سخن ۔ کلام غالب کی سخن ورانہ تنقید .... از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ۔

۱۲۔ بہمنی تمدن .... از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ام اے ۔ ال ال بی

ضمیر

ایک دلچسپ ڈرامہ

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوستانی طالب علم کے واردات سفر یورپ نہایت دلچسپ اور اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف مولوی محمد عبد الرحمٰن خان صاحب بی اے، آر سی اس، ڈی اس سی، سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ ہیں جنہوں نے طالب علم اور استاد دونوں حیثیتوں سے یورپ میں قیام کیا، مختلف مقامات کی سیر و سیاحت کی اور مغرب کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس کے علاوہ ایشیا اور یورپ کے طالب علموں کے حالات محاسن و نقائص اور ضروریات پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ اس کتاب کی دلچسپی اور مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف مصنف کا نام کافی ہے۔

ڈیمی تقطیع ۲۰۶ صفحات ۔ طباعت کتابت پاکیزہ قیمت صرف ۱۲؍ دفتر سب رس یا مکتبہ ابراہیمیہ سے مل سکتی ہے۔

سب رس کتاب گھر

حیدرآباد و اضلاع اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکنی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوتی رہی ہیں لیکن ابھی دفتر مجبور تھا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر چند اردو کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

رباعیات امجد حصہ اول	ہہر
رباعیات امجد حصہ دوم	مجر
ریاض امجد حصہ اول	ہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقۂ امجد سی پیوند	ہ
نذر امجد	۲/
حج امجد	عال
میاں بیوی کی کہانی	۱/
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	ے
گلہائے امجد	ے

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد صاحب ایم اے

ارباب نثر اردو	عال
گلشن گفتار	۱۲/
مثنویات میر	عال
ابتدائی فارسی	۱۲/
یادگار ولی	عال

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

ارمغان عزیز	عال
متاع سخن	۱۲/

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری

اردو کے اسالیب بیان	عہ ۴/
اردو شہ پارے	ہے ۴/
روح تنقید	عہ ۴/
تنقیدی مقالات	ہے ۴/
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	عہ ۴/
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عال
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	عال ۴/
فن انشا پردازی	عہ ۴/
طلسم تقدیر	۸/
سیر گولکنڈہ	۱۵/
گولکنڈے کے ہیرے	۱۲/

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری

دنیائے افسانہ	عہر
کردار اور افسانہ	ہہر
جدید اردو شاعری	عال
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۶/
انگریزی افسانے	عہر

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

خیالات آزاد جلد اول	
خیالات آزاد جلد دوم	

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	ہے
خواتین عہد عثمانی	عہر
حضرت امجد کی شاعری	۱۲/
مکتوبات امجد	۱۲/
رہبر سفر یورپ	۱۲/
ذکر نبی	۱۲/

ان کے علاوہ ادارۂ ادبیات اردو کی جملہ کتابیں بھی سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

ختم

مکتبہ ابراہیمیہ

حیدرآباد کا سب سے بڑا اور قدیم بک ڈپو ہے

مصنفین و مولفین
اپنی کتابوں کی
کتابت، طباعت
تصاویر، جلدبندی
تشہیر و فروخت

شائقین علم و ادب
ہر علم و فن کی
کتابوں، رسالوں
نقشوں، خاکوں
اور مختلف اداروں کی مطبوعات

کے لئے

مکتبہ ابراہیمیہ

عابدروڈ مصطفیٰ بازار کی خدمات حاضر ہیں

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY,
Acc. No. 16498
LAHORE.

دورِ عثمانی کا سب سے بڑا اور پہلا نمائش گاہ سے طلائی تمغے یافتہ

جلد سازی کی منظم فیکٹری

مستند و مسلمہ بانی

محبوبیہ کارخانہ جلد سازی

ٹریڈ مارک رجسٹرڈ

ہندوستان کا واحد کارخانہ ہے جہاں جرمن مشین
ہر اقسام کی جلد سازی کے علاوہ حسبِ ذیل
تیار کیا جاتا ہے ہر قسم کے نمونہ جات ہر وقت

MAHBOOBIA BOOK BINDING FACTORY HYDERABAD-DN

اعلیٰ اوزارات بہترین ماہران فن کے ذریعہ
سامان بالکل انگلش طرز پر نہایت نفیس
شوروم میں موجود رہتے ہیں معائنہ مفت

تفصیل سامان

ٹیبل بلاٹنگ پیاڈ ۔ رائٹنگ پیاڈ ۔ سفری بلاٹنگ بورڈ ۔ فائیل مجلد سادہ و مطبوعہ ۔ کلپ بورڈ ۔ فوٹو البم ۔ اسٹامپ البم
فرامین البم ۔ دیواری کیالنڈر سادہ و باتصویر ۔ ٹیبل کیالنڈر سادہ یا باتصویر ۔ ڈائریاں وکلاء و عوام مختلف قسم ۔ نوٹ بک ۔ اکسرسائز بک
لیجر بک ۔ سمپل بک پڑیہ ۔ لفافہ جات ہر قسم ۔ کیالیکو کے ڈبے ۔ چمڑے کے ڈبے ۔ مقوے کے ڈبے ۔ کاپی کور ۔ یادداشت پاکٹ کور ۔ نوٹ بک
نیوز فولڈر ۔ فائیل کور ۔ رسائل کور ۔ ڈرائنگ کاپی کور ۔ فوٹو کے فریم دیواری و ٹیبل ۔ چرمی پاکٹ ۔ آئیل کلاتھ پاکٹ ۔ بجٹ پاکٹ
وزیٹنگ کارڈ پاکٹ ۔ اسکول بک بیگ ۔ وکلاء کے فائیل بیگ ۔ کارڈ بورڈ پوشر ۔ نوٹ پیپر و لفافہ جات کے ٹیبل اسٹانڈ ۔
یادداشت ٹیبل اسٹانڈ ماہوار و ہفتہ وار ۔ اڈورٹائزنگ ٹیبل اسٹانڈ ۔ محبوبیہ بک پالش ۔

ایک وقت ہمارا اشوروم دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیے آپ ضرور مسرور ہوں گے

ہندوستان کے مشہور ادبی رسائل کے متعلق بلاک بصرفِ کثیر بنا کر رکھے گئے ہیں ان کی جلدیں ہمارے کارخانہ میں تیار کرا کے
اپنے کتب خانوں کی زینت بڑھائیے ۔

آپ کی تشریف آوری کا متمنی

شیخ محبوب قریشی بانی و مہتمم کارخانہ

علامہ اقبال کی زندۂ جاوید تصانیف

بانگ درا ۔ یہ علامہ اقبال کے اردو کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں مجموعہ کی شکل میں شائع ہو کر اردو شاعری کی دنیا میں ایک انقلاب اور تلاطم مچا دیا تھا۔ یہ تین حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اول میں ۱۹۰۵ء تک، حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک اور سوم میں ۱۹۰۸ء سے تقریباً ۱۹۲۴ء تک کا مکمل کلام درج ہے۔ علامہ سر شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچہ میں تحریر فرمایا ہے "یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے جس میں خیالات کی فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں" قیمت [illegible]

بال جبریل ۔ یہ کلام اردو کا دوسرا مجموعہ ہے جو چند برسوں کے ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں زیادہ تر غزلیات و منظومات درج ہیں جو مختلف ممالک مثلاً ہسپانیہ (اندلس) اور ممالک اسلامیہ میں لکھی گئیں۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی گذشتہ شان و عظمت، شاعر مشرق کو جن حسیات اور درد انگیز جذبات سے لبریز کر سکتی تھی اس کے پُر درد تاثرات اس مجموعے میں ملاحظہ فرمائیے قیمت ۱۲/۔

ضرب کلیم ۔ اردو کلام کا یہ تیسرا مجموعہ ہے جو "اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف" سے موسوم ہے۔ اس مجموعے میں ایسا کلام ہے جو دنیا کی موجودہ بے حسی، بے عملی اور نفس پرستی پر خلوص و صداقت کے ضربات لگا کر عمل صادق، علو خیال اور وسعت نظر کا ایک پرجوش پیغام پہنچاتا اور ایک نئی دعوت فکر کرتا ہے۔

... اردو کی رائے ہے "ان میں شاعر کے خیالات کا نچوڑ ہے جو اس کے غائر مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہیں اس میں جابجا حکمت کے موتی بکھرے ہوئے ہیں" قیمت [illegible]

پیام مشرق (فارسی) علامہ نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے مشہور دیوان کے جواب میں یہ لاجواب مجموعہ شائع فرمایا تھا۔ اس کتاب کا زیادہ تر حصہ اخلاقی، مذہبی اور روحانی حقائق کو پیش کرتا ہے جس کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے یہ کتاب اس کے لئے مشعل راہ، اس کی لغزشوں کے لئے ایک مستحکم سہارا ثابت ہوگی قیمت [illegible]

جاوید نامہ (فارسی) علامہ نے اپنی مخصوص طرز میں جوش و صداقت، جوش و فکر اور حرکت و زندہ دلی کا پیام پہنچایا ہے جس کے ایک ایک شعر کے حقیقی تقاضا پر عمل شروع ہو جائے تو قومیں قعر ذلت سے نکل کر بام عروج پر پہنچ جائیں گی قیمت [illegible]

پس چہ باید کرد اور مسافر (فارسی) "مسافر" یہ افغانستان کی چند روزہ سیاحت پر علامہ کے شاعرانہ اعلیٰ و ارفع حسیات کا مجموعہ ہے۔ خیبر، سرحد، کابل، غزنی اور قندھار کے حیرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر حقیقت شناس کے خون کے آنسو ہیں اور "پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق" میں شاعر مشرق نے اپنا جو آخری پیام دیا ہے اسے دیکھنے کے بعد انقلاب کن و غفلت شکن اثرات طاری ہو جاتے ہیں قیمت [illegible]

نوٹ: علامہ مرحوم کی دو معیاری کتابیں (فارسی)

زبور عجم

مثنوی اسرار خودی رموز بے خودی | زیر طبع ہیں

مشتہر: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

فلسفۂ عجم۔ مترجمہ میر حسن الدین صاحب بی اے۔ ایل ایل بی حضرت اقبال کی ایک بلند پایہ فلسفیانہ
تصنیف "دی ڈیولپمنٹ آف میٹافزکس ان پرشیا" کا اردو ترجمہ ہے علامہ کی نثر میں (ترجمہ) اس قدر ضخیم یہی واحد کتاب ہے
اس کتاب میں ایرانی قوم کی مخصوص روح اور اس کی امتیازی سیرت کو منکشف کیا گیا ہے علامہ نے تمہید میں کتاب کے مطالب کے متعلق
تحریر فرمایا ہے "میں نے ایرانی تفکر کے منطقی تسلسل کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس کو میں نے فلسفۂ جدید کی زبان میں پیش کیا ہے،
تصوف کے موضوع پر میں نے زیادہ سائنٹفک طریقے سے بحث کی ہے" .... قیمت عال ۸؍

ختم نبوت اور قادیانیت (مترجمہ ایضاً) یہ عالمانہ مقالہ پنڈت جواہر لال نہرو کے بعض استفسارات کے سلسلے میں علامہ نے
تحریر فرمایا تھا، جس کے مطالعے سے اسلامی قومیت اور فرقہ کے تصور پر خاص روشنی پڑتی ہے خصوصاً قادیانی مذہب کے اصول، معتقدات اور
تحریکات کے متعلق جمہور اسلامی نقطۂ نظر سے عقلی و نقلی دلائل سے بحث کی گئی ہے قیمت ۶؍

چند متفرق نظمیں۔ شکوہ ۲؍۶ ـ جواب شکوہ ۵؍ ہردو ۷؍۶ ـ فریاد امت ۳؍۹ ـ تصویر درد ۶؍
نالۂ یتیم ۳؍۹ ـ خضر راہ ۵؍ ـ شمع و شاعر ۵؍ ـ ترانہ ۶؍ ـ مکمل ترانہ ۳؍۹

رسالہ سب رس مفت

مکتبہ سے حسب دلخواہ نقد للعہ، عنہ، عہ روپے کی کتابیں خریدنے پر علی الترتیب یک سال، شش ماہ اور سہ ماہ کے لئے
سب رس مفت جاری کرایا جائے گا۔ اور متفرق طور سے خریداری پر اسی وقت مستند تفصیلی رسید خریدار کے حوالہ کردی جائے گی،
بعد تکملہ معینہ رقم رسانہ داخل کرنے پر پرچہ جاری کرادیا جائے گا۔ علم دوست و اہلِ ذوق حضرات جلد توجہ فرمائیں اور ہماری
اس فیاضانہ پیشکش سے فائدہ اٹھائیں۔

نیز! اردو ادب کی جملہ قدیم و جدید کتابیں ہمارے یہاں موجود ہیں۔ اس طرف گذر ہو جائے تو ہمارے ادارہ میں تشریف لاکر
ایک نظر دیکھ جائیے، یا ہمیں حکم دیجئے کہ آپ کی مذاق کی کتابیں آپ کے دولت خانے پر پیش کریں، خریدنے یا نہ خریدنے کا
سوال ہماری خدمات سے خارج ہے۔ یا مطلوبہ کتب کی فہرست طلب کیجئے۔ دریافت طلب امور کا جواب حتی الامکان جلد
دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ممتاز علمی، ادبی اور فلمی جرائد کی ایجنسی بھی قائم ہے۔ امید کہ! اس قدیم ادارہ کی ہمیشہ سرپرستی
فرمائی جائے گی۔ فہرستیں مفت روانہ کی جاتی ہیں۔

مکتبۂ ابراہیمیہ مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن

ادبِ لطیف کا افسانہ نمبر

افسانہ نگاری پر لاجواب تنقیدی مقالات ——— فنِ افسانہ کے ہر پہلو پر گرانمایہ مضامین

دکھی زندگیوں کی اشک افشاں کہانیاں ——— مسرور ہستیوں کے مسکراتے ہوئے افسانے

مغربی شاہکار افسانوں کے کامیاب تراجم ——— روح پر وجد طاری کرنے والی منظوم داستانیں

دلپذیر تصاویر!

شاندار گیٹ اپ!!

"ادبِ لطیف" کا افسانہ نمبر حقیقتاً

اردو کے افسانوی ادب میں ایک دلآویز اضافہ ہے

ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ۱۲/

اگر آپ یہ افسانہ نمبر اور ضخیم سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی تین روپے چار آنے بھیجکر خریدار بن جائیے

مقامِ اشاعت

مکتبہ اردو ۱۵۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

مشتہرین حضرات کے لئے یہ نایاب موقع ہے۔ جلد اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیں

عوام کا ترجمان، افکار عامہ کا محافظ آزادی وطن کا علمبردار

کانگریس
مراد آباد

جنوری ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں یوپی کے مرکزی شہر مراد آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس ہفتہ وار جریدہ کا مقصد خدمت خلق اور اعلائے کلمۂ حق ہوگا۔ "کانگریس" کی حکمت عملی قوم پرورانہ ہوگی وہ ملک کا مخلص خادم، مزدور پیشہ جماعتوں کا معین، کسانوں کے حقوق کا پاسبان، ہندوستانی اقوام میں رواداری اور رشتۂ اتحاد پیدا کرنے کا زبردست آرگن ہے "کانگریس" کے اجراء سے آزاد خیال اور قوم پرور اخبارات کی فہرست میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ "کانگریس" ملت ہند کی صحیح خدمت انجام دے کر وقت کی اہم ترین ضرورت کو پورا کرے گا۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی اور دوسرے اکابرین ہند اور لیڈران عظام نے اس کا زبردست خیر مقدم کیا ہے۔ "کانگریس" کا سائز ۲۰×۳۰ ہے سالانہ قیمت [illegible] نمونہ کے لئے تمام فرمائش منیجر کے نام آنی چاہئیں۔ مشتہرین کو اپنے اشتہارات کے لئے بذریعہ خط و کتابت نرخ طے کر لینا چاہئے۔ ایجنٹوں کے ساتھ خاص رعایت کی جائے گی۔

"منیجر اخبار کانگریس" فریدی بلڈنگ سنبھلی گیٹ مراد آباد

شکسپیر ہند آغا حشر کاشمیری مرحوم کی واحد یادگار

ماہوار حشر جالندھر شہر

کا مطالعہ کرنا اس علمی و ادبی یادگار کو مستحکم کرنے کا موجب ہوگا۔ یہ ماہوار رسالہ ہر ماہ اپنی ذیل کی خصوصیات سے مرصع ہو کر نہایت پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ (۱) حشر میں ہر ماہ علمی ادبی، فلمی، تجارتی، تعلیمی، طبی، بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ (۲) حشر میں ہر ماہ مزاحیہ اور تاریخی پیدا کرنے والے افسانے، جاذب نظر نقشے، [illegible] نظمیں الگ الگ تنقیدیں شائع ہوتی ہیں۔ (۳) حشر میں ہر ماہ صنعت فلم سازی کے متعلق بہترین مقالے شائع ہوتے ہیں۔ (۴) حشر میں ادبی، علمی، تعلیمی، فلمی، [illegible] سوال و جواب کے لئے صفحات وقف ہیں (۵) حشر میں ہر ماہ "معیار کی کسوٹی پر" عنوان کے زیر بحث کسی شاعر کے کلام پر تنقید و اصلاح شائع ہوتی ہے جو مبتدی شعراء کے لئے ایک استاد کا کام دیتی ہے۔ (۶) حشر میں ہر ماہ آغا حشر کاشمیری مرحوم کے غیر مطبوعہ اور مطبوعہ ڈراموں کو قسط وار شائع کیا جاتا ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے سالانہ چندہ [illegible] روپے۔ فی پرچہ چار آنے۔ مگر جو اصحاب ۲۵ تاریخ ماہ حال تک حشر کے خریدار بن جائیں گے ان سے رعایتی چندہ [illegible] سالانہ [illegible] شائع ہوتا ہے [illegible] جلد [illegible] آٹھ آنے [illegible] ہو جائیگا۔ [illegible] آج ہی [illegible] روانہ فرما کر حشر کے خریدار بن جائیے۔ اور سال [illegible] حشر کو ملک کے اکثر مشہور رسائل و جرائد نے ایک بلند پایہ مجلہ قرار دے چکے ہیں [illegible] آج ہی [illegible] نمونہ روانہ ہوگا۔

منیجر رسالہ حشر۔ جالندھر شہر (پنجاب)

ہر وقت اور ہر موسم کے لئے

ہناوا ریلویرا آرٹلن گولڈ اسٹنڈرڈ

بہترین پارچہ جات ثابت ہوئے ہیں

ہر دو گز کے کنارے پر ٹریڈ مارک ملاحظہ فرمائیے

ساختہ { دی بکنگھم و کرناٹک ملز۔ مدراس
دی بنگلور اُولن ملز۔ بنگلور }

یعقوب ڈی خان اینڈ کو

تاجر پارچہ

محی الدین بلڈنگ

عابد روڈ حیدرآباد دکن

نہایت فینسی ساڑیاں

جس کا تازہ ترین اسٹاک

حیدر آباد میں

صرف ہمارے یہاں پہلی مرتبہ آیا ہے
ملاحظہ فرمائیے اور خرید فرمائیے۔

قیمتوں میں فرق ہو تو مال واپس کر دیجئے۔

آر۔ آر۔ گوپال کلاتھ مرچنٹ

پتھر گٹی فون نمبر ۵۷۲ — عابد روڈ۔ فون نمبر ۵۷۱